دینِ کامل

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

DEEN-E-KAMIL
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1989
Second impression 1992

© The Islamic Centre, 1992

Published by The Islamic Centre
C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013
Tel.: 697333, 611128

Distributed by AL-RISALA Book Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi
110013

Printed by Nice Printing Press, Delhi

فہرست

حصۂ اول	ایمان	صفحہ	۶
	ایمانی برکتیں		۲۲
	اخلاق		۴۱
	اتحاد		۶۱
	دینِ کامل		۸۱
حصہ دوم	سنّت رسول	صفحہ	۱۰۰
	حکمتِ اسلام		۱۱۸
	نبوت اور ختم نبوت		۱۳۳
	پیغمبر آخرالزماں کا ظہور		۱۴۲
حصہ سوم	ایک مطالعہ	صفحہ	۱۶۰
	مَن نحن		۱۶۸
	شہید اور شہادت		۱۸۴
	دعوت الی اللہ		۱۹۵
	تاریخِ دعوت		۲۱۲
	میدانِ عمل		۲۴۲
	حکمتِ دعوت		۲۶۱
حصہ چہارم	تعمیر ملّت	صفحہ	۲۷۸
	اسلام اور سائنس		۲۹۶
	اسلام دور جدید میں		۳۱۸
	جدید امکانات		۳۳۸
	اسلامی دور		۳۵۸

بسم الله الرحمن الرحيم

باب اول

ایمان

ایمان کسی تقلیدی عقیدہ کا نام نہیں۔ ایمان ایک زندہ شعور کا نام ہے۔ ایمان کے لفظی معنی اقرار کے ہیں۔ آدمی جب اللہ کو اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ مانے اور اس کی تمام باتوں (وحی آخرت، ملائکہ وغیرہ) پر کامل یقین کر کے ان کی تصدیق کرے، وہ اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ان چیزوں کو ماننے کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کو باپ دادا کی تقلید کے طور پر مان لیا جائے مگر اس قسم کا تقلیدی ایمان وہ ایمان نہیں ہے جو اللہ تعالےٰ کو مطلوب ہو۔ اس قسم کا ماننا بالکل بے روح ماننا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں چھنگلیا۔ چھنگلیا بظاہر انگلی کی مانند ہوتی ہے۔ مگر آدمی کے ہاتھ میں چھنگلیا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی فنکشن نہیں ہوتا۔ وہ ہاتھ کے ایک طرف بے کار لٹکی رہتی ہے۔ کچھ لوگ اس کو چھوڑے رکھتے ہیں اور کچھ لوگ اس کا آپریشن کرا دیتے ہیں۔

یہی معاملہ تقلیدی ایمان کا ہے۔ تقلیدی ایمان آدمی کی زندگی میں ایک بے اثر عقیدہ کے طور پر شامل رہتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا حاکم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی الگ رہتی ہے اور اس کا ایمان الگ۔

حقیقی ایمان ایک قسم کا شعوری سفر ہے، وہ اس کا نام ہے کہ آدمی نہ دکھائی دینے والے خدا کو دیکھ لے۔ وہ غیب میں چھپی ہوئی حقیقت کا مشاہدہ کر لے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایمان ایک دریافت ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے، سب سے بڑی ڈسکوری۔ جو چیز آدمی کی زندگی میں بطور ڈسکوری کے داخل ہو اس کا داخل ہونا محض ایک سادہ چیز کا داخل ہونا نہیں ہوتا۔ وہ ایک

انقلاب ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہوتا ہے جیسے پُرسکون زمین میں زلزلہ آجائے۔ یا ٹھہرے ہوئے پانی میں طوفان برپا ہوجائے۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کو ملے تو وہ اس کی سوچ کو بدل دیتا ہے۔ وہ اس کے مزاج کو بدل دیتا ہے۔ وہ اس کی سرگرمیوں کے رخ کو پھیر کر ایک طرف سے دوسری طرف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور کرتا ہے۔ اس کے بعد آدمی وہ نہیں رہتا جو وہ پہلے تھا۔ اپنے قول اور عمل دونوں کے اعتبار سے وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم قرآن سے کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے۔

ایمان نیا انسان بناتا ہے

ایک مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کے جادوگروں کی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا خدائی معجزہ سے بہت بڑا سانپ بن جاتا تھا۔ مصر کے بادشاہ فرعون نے اس کے توڑ کے لیے اپنے ملک کے جادوگروں کو جمع کیا۔ جادوگر جب آئے تو انہوں نے فرعون سے خوشامدانہ انداز میں کہا: اگر ہم موسیٰ پر فتح پالیں تو کیا ہمیں بادشاہ کی طرف سے کچھ انعام دیا جائے گا۔ (اَئِنَّ لنا لاجراً ان کنا نحن الغالبین) (الشعراء ۴۰)

جادوگروں کا یہ حال اظہار حقیقت سے پہلے تھا۔ اس کے بعد جب کھلے میدان میں ان کا مقابلہ حضرت موسیٰؑ سے ہوا اور جادوگروں نے دیکھا کہ ان کے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کے عصا نے نگل لیا ہے تو جادوگروں پر کھل گیا کہ حضرت موسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہیں۔ اتنا بڑا واقعہ خدا کے پیغمبر ہی کے ذریعہ ظاہر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جادوگر اسی وقت خدا کے سامنے سجدے میں گر گیے۔ وہ کہہ پڑے کہ آمنا برب العالمین (ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے)

جادوگروں کا حضرت موسیٰؑ کے دین کو قبول کر لینا فرعون کے لیے ذاتی شکست تھی۔ اس نے بگڑ کر کہا کہ میں تم کو سخت ترین سزا دوں گا۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹواؤں گا۔ اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ جادوگروں نے یہ سن کر کہا:

فاقض ما انت قاض انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا (جو کچھ تجھے کرنا ہے کر ڈال،

تو جو کچھ کر سکتا ہے موجودہ دنیا کی زندگی میں ہی کر سکتا ہے۔ (طٰہٰ ۷۲)

اس مثال میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ ایمان کے بعد آدمی کے اندر کس طرح کا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ کس طرح اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور (Emerge) کرتا ہے۔ وہی جادوگر جو چند لمحہ پہلے بادشاہ کی عظمت سے دبے ہوئے تھے، اور اس کی خوشامد کر رہے تھے، ایمانی انقلاب کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ وہ فرعون کی سخت ترین سزا کی دھمکی سن کر بھی متاثر نہیں ہوئے۔ باہر سے اگرچہ وہ پہلے ہی جیسے دکھائی دیتے تھے۔ مگر اب ان کے اندر ایک نیا انسان پیدا ہو چکا تھا۔ ایک ایسا انسان جو صرف خدا سے ڈرتا تھا، ایک ایسا انسان جس کی نظر میں آخرت کے سوا ہر چیز بے وقعت ہو چکی تھی۔

ایمان معرفت ہے

قرآن میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق، المائدہ ۸۳) اسی طرح حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ جس شخص نے جان لیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا (من علِمَ انہ لا الٰہ الّا اللہ دخل الجنۃ، مسلم) معرفت اور علم کسی چیز کو شعوری طور پر پانے کا نام ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو شعوری طور پر پائے تو ایسا پانا محض بے اثر عقیدہ یا جامد نظریہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کے پورے وجود میں سما جاتا ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔

اس قسم کے ایمان کا ایک واقعہ قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے۔ نجران کے علاقہ سے دس عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ آپ نے ان کو قرآن کے کچھ حصّے سنائے۔ اس کو سن کر ان کے ذہن کی گرہیں کھل گئیں۔ انہوں نے خدا کو پہچان لیا۔ ان پر یہ منکشف ہوا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور محمّد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس انکشافِ حقیقت کے بعد ان کا جو حال ہوا وہ قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے: اور جب انہوں نے سنا اس کلام کو جو رسول کی طرف اترا ہے تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (واذا سمعوا

ما انزل الی الرسول تری اعینهم تفیض من الدمع مما عرفوا من الحق یقولون ربنا آمنا فاکتبنا مع الشاهدین ، المائدہ ۸۳)

مذکورہ اہل ایمان کو جب ایمان کا شعور ملا تو وہ بے اختیار رو پڑے۔ رونا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ اندرونی طوفان کا ایک خارجی اظہار ہے۔ جب حقیقت کا ادراک دل کے تار کو چھیڑتا ہے، جب ایک عظیم انکشاف سے آدمی کا سینہ پھٹ جاتا ہے، جب خدا اور بندہ کے اتصال سے بندہ کی تاریک دنیا روشن ہو جاتی ہے، اس وقت انسان کے دل میں ہیجان خیز جذبات اٹھتے ہیں۔ یہ جذبات اپنے نکاس کے لیے جو راستہ پاتے ہیں ان میں سے ایک آنکھوں کا راستہ ہے۔ آنکھ کے راستہ سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ کر اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آدمی نے قربتِ خداوندی کا تجربہ کیا ہے۔ آدمی کو اس نعمتِ ربانی کا حصہ ملا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں۔

ایمان خدا کا خوف پیدا کرتا ہے

مفسر ابن کثیر نے ایمان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الخشیة خلاصة الایمان (خدا کا خوف ایمان کا خلاصہ ہے) جلد اول، صفحہ ۴۱

یہ تفسیر بہت بامعنیٰ ہے۔ آدمی جس چیز کا مومن ہو اسی کے لحاظ سے اس کے اندر کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً آپ چیونٹی کی موجودگی کا اقرار کریں تو اس وقت آپ کے اندر جو کیفیت پیدا ہوگی وہ اس سے بالکل مختلف ہوگی جب کہ آپ ایک شیر کی موجودگی کا اقرار کر رہے ہوں۔ چیونٹی کی موجودگی آدمی کے اندر کوئی جاگ پیدا نہیں کرتی، مگر شیر کی موجودگی کو محسوس کرکے آدمی سر سے پاؤں تک جاگ اٹھتا ہے۔

میں ایک مرتبہ ایک چڑیا گھر میں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ تمام زائرین تیزی سے باہر کے گیٹ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ معلوم کیا تو پتہ چلا کہ چڑیا گھر میں یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ ایک شیر کٹہرے سے باہر آگیا ہے۔ ابھی کسی نے شیر کو دیکھا نہیں تھا۔ صرف اس کی خبر سے لوگوں کا یہ حال ہو گیا۔ جب شیر کی موجودگی کو محسوس کرنے پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو شیر کے خالق کی موجودگی کو محسوس کرلے۔ جس کو خالق کائنات کی موجودگی Presence کا ادراک ہو جائے۔

ایمان اگر زندہ ایمان ہو۔ اگر وہ خدا کی ذات پر یقین کے ہم معنیٰ بن گیا ہو تو ایسا ایمان

آدمی کو لرزا دیتا ہے۔ خدا کی ہیبت سے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آواز پست ہو جاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسی پابند زندگی بن جاتی ہے جیسے خدا اس کے رات اور دن کا نگراں بن گیا ہو۔

بعض مفسرین نے مومنین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ غیب پر اس طرح یقین رکھتے ہیں جس طرح وہ مشاہدہ پر یقین رکھتے ہیں۔ (یومنون بالغیب کما یومنون بالشہادۃ) تفسیر ابن کثیر جلد اول۔ صفحہ ۴۱۔

گویا قیامت میں خدا کو دیکھ کر لوگوں کا جو حال ہوگا وہ حال مومن کا بغیر دیکھے ہوئے اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ غیر مومن قیامت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے، مومن اسی آج کی دنیا میں خدا کے سامنے ڈھ پڑتا ہے۔ قیامت میں خدا کے فرشتے لوگوں کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کریں گے مومن اسی دنیا میں اپنے آپ کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ غیر مومن پر قیامت میں گزرے گا وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ اسی زلزلہ خیز تجربہ کا نام ایمان ہے۔

ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے

سورہ ابراہیم میں ایمان اور مومن کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ کلمۂ ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ستھرا درخت۔ اس کی جڑ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں (الم ترکیف ضرب اللہ مثلا کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء)

درخت کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ بیج سے اکھوا، اکھوا سے تنہ، تنہ سے شاخیں، شاخوں سے پتیاں اور پھر پورا درخت۔ یہ خاص صفت جو درخت کو حاصل ہے یہی مومن کی بھی صفت اس دنیا میں ہوتی ہے۔ وہ ہر آن بڑھتا رہتا ہے۔ وہ بیج سے شروع ہو کر بڑھتے بڑھتے سرسبز درخت بن جاتا ہے۔

ایمان کس طرح بڑھتا ہے۔ اس کے بڑھنے کی صورت بھی وہی ہوتی ہے جو درخت کے بڑھنے کی صورت ہے۔ درخت زمین اور فضا سے معدنیات گیسیں اور پانی لے کر اپنے وجود کو بڑھاتا

رہتا ہے۔ حتیٰ کہ فضا کی مضر گیس (کاربن) بھی اس کے خدائی کارخانہ میں داخل ہو کر اس کے وجود کا جزء بن جاتی ہے اور وہ مفید گیس (آکسیجن) کی صورت میں باہر نکلتی ہے۔ یہی مومن کا حال اس دنیا میں ہوتا ہے۔

مومن اپنے ماحول میں پیش آنے والے ہر واقعہ اور ہر مشاہدہ کو اپنے لیے غذا بناتا رہتا ہے۔ اس پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ فریاد کرنے کے بجائے صبر کرتا ہے۔ گویا مصیبت اس کے ایمانی کارخانہ میں داخل ہو کر مثبت نفسیات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح مومن کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ فخر نہیں کرتا بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ گویا کہ جو چیز عام انسانوں کو خدا سے غفلت اور سرکشی کی طرف لے جاتی ہے وہ مومن کو خدا سے قریب کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مومن کو اگر کسی سے شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ گویا جو واقعہ عام انسان کو انتقام کی آگ میں جلانے کا باعث بنتا ہے۔ وہ مومن کو خدا کی رحمت کے سائے میں پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی طرح مومن جب زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر یہ سب چیزیں خدا کی نشانیاں بن جاتی ہیں وہ مخلوقات کے آئینہ میں خالق کو دیکھ لیتا ہے۔ گویا جو مشاہدہ عام انسان کے لیے صرف مادی فائدہ یا Exploitation کا ذہن پیدا کرتا ہے وہ مومن کے ایمانی کارخانہ میں خدا کی یاد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح ہر معاملہ اور ہر مشاہدہ مومن کو ربانی غذا دیتا رہتا ہے اور اس کے ایمان و یقین میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔

ایمان ہر موقع پر اپنا پھل دیتا ہے

سورۂ ابراہیم کی مذکورہ آیت میں ایمان کو ستھرے درخت سے مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے۔ (توتی اکلھا کل حین باذن ربھا)

پھل دار درخت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس کا موسم آتا ہے تو اس کی شاخوں پر پھل لٹکنے لگتے ہیں۔ مومن کا حال بھی اخلاق اور عمل کے دائرہ میں یہی ہوتا ہے۔ مومن کا زندہ شعور، اس کا خدا کو حاضر و ناظر جاننا، اس کا یہ یقین کہ مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ چیزیں

مومن کو اتنا حساس اور اتنا ذمہ دار بنا دیتی ہیں کہ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کے ایمان کا تقاضا ہو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو اس سے وہی اخلاق اور کردار ظاہر ہوتا ہے جو خداوند ذوالجلال پر زندہ یقین رکھنے والے آدمی سے ظاہر ہونا چاہیے۔

جب اس کے سامنے کوئی سچائی ظاہر ہوتی ہے تو وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے دل سے اس کا اقرار کر لیتا ہے۔ جب خدا کی عبادت کی پکار بلند ہوتی ہے تو وہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر خدا کے آگے سجدے میں گر پڑتا ہے۔ جب اس کے مال میں سے خدا کا حصہ مانگا جاتا ہے تو وہ بلا تاخیر اس کو ادا کر دیتا ہے۔ جب کوئی حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ پورے انصاف کے ساتھ اس کو اس کا حق پہونچا دیتا ہے۔ جب وہ کسی سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا کیے بغیر اس کو چین نہیں آتا۔

اس طرح مومن کا ایمان ہر موقع پر ایک ربانی نور بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں ربانی کردار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کو کرنا چاہیے۔ اور وہ نہیں کرتا جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔

ایمان ایک فکری انقلاب

ایمان کوئی جامد عقیدہ نہیں، ایمان ایک متحرک فکری سیلاب ہے۔ ایمان ایک ربانی چشمہ ہے جو کسی بندۂ خدا کے سینہ میں بہہ پڑتا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ ایمان آدمی کو اس طرح ملے کہ وہی اس اس کی زندگی بن جائے۔ وہ ایسی روشنی ہو جس سے اس کا پورا وجود جگمگا اٹھے۔ وہ ایسا رنگ ہو جس میں آدمی کے سارے معاملات رنگے ہوئے نظر آئیں۔

ایمان خدا کی موجودگی کو پا لینے کا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمتوں میں گم ہو جائے، وہ احساس خداوندی میں نہا اٹھے۔ ایمان آدمی کے جذبات کا حمد خداوندی میں ڈھل جانا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا تعالے تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان ایک بھونچال ہے جو خدا کی معرفت سے آدمی کے اندر ابل پڑتا ہے۔ ایمان ایک دریا ہے جو خدا کے فیضان کو پا کر آدمی کے دل و دماغ میں جاری ہو جاتا ہے۔ ایمان خدا کو پا لینا ہے، اور خدا کو پانا سب کچھ کو پا لینا ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو اس کے بعد آدمی کو نہ ملے۔

حصّہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

قولوا امنا باللّٰہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسماعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربّھم لانفرق بین احدٍ منھم ونحن لہ مسلمون۔ فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولّوا فانما ھم فی شقاق فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم (البقرۃ ۱۳۶-۱۳۷)

کہدو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کلام پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتارا گیا۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو اللہ کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ پس اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو وہی ضد پر ہیں۔ اللہ تمہاری طرف سے ان کے لیے کافی ہوجائے گا۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مثل صحابہ ایمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں اور اطراف مدینہ میں یہود آباد تھے۔ یہ آیت انہیں یہودیوں کے ذیل میں آئی ہے۔ یہ یہودی ان تاریخی نبیوں کو مانتے تھے جو پچھلے زمانہ میں ان کی نسل میں آئے اور جن کا ذکر ان کی کتاب بائبل میں موجود ہے۔ مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا انکار کرتے تھے جو ان یہودیوں کے اپنے زمانہ میں عرب میں پیدا ہوئے۔ اس کے برعکس صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ وہ تمام پیغمبروں کا اقرار کرتے تھے۔ اس پر کہا گیا کہ یہودی اگر صحابہ کی طرح مومن بنیں، وہ پچھلے پیغمبروں کو ماننے کے ساتھ وقت کے پیغمبر کو بھی مانیں تو وہ خدا کی نظر میں مومن ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دو قسم کا ہے۔ ایک مثل یہود ایمان۔ دوسرا مثل صحابہ ایمان۔

اللہ تعالیٰ کو مثل صحابہ ایمان مطلوب ہے۔ اس کو مثل یہود ایمان مطلوب نہیں۔

اب دیکھئے کہ دونوں میں فرق کیا تھا۔ وہ فرق صرف فہرست کے مکمل ہونے یا نامکمل ہونے کا نہ تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صحابہ کی فہرستِ انبیاء مکمل ہے اور یہود کی فہرست انبیاء نامکمل۔ یہ فرق حقیقت کا فرق تھا نہ کہ سادہ معنوں میں محض ظاہری فہرست کا۔

یہود حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ کو مانتے تھے۔ ان پیغمبروں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ گزرے ہوئے دور کے پیغمبر تھے۔ یہود کی قومی روایات میں ان کو عظمت کا مقام مل چکا تھا۔ ہر یہودی جو پیدا ہوتا وہ اول دن سے ان پیغمبروں کا نام اس حیثیت سے سنتا کہ وہ اس کی قوم کے عظیم بزرگوں میں سے تھے۔ وہ ان کو ابتدا ہی سے عظیم پیغمبر کی حیثیت سے جانتا تھا۔

اس کے برعکس محمد بن عبداللہ کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ کے یہود پہلی بار ان سے متعارف ہوئے تو اس طرح متعارف ہوئے کہ وہ اپنے وطن سے نکال دیئے گیے ہیں اور پناہ گزیں کے طور پر مدینہ پہونچے ہیں۔ پچھلے پیغمبروں کے نام کے ساتھ عظمت کی پُراسرار داستانیں شامل تھیں جب کہ محمد بن عبداللہ ان کو بس ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کا پیغمبر ہونا یہود کی سمجھ میں آیا اور محمد بن عبداللہ کا پیغمبر ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ آپ کے بارے میں یہود کا پہلا تاثر ہی ان کے لیے آخری تاثر بن گیا۔

صحابہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے بھی اگرچہ آپ کو پہلی بار اسی روپ میں دیکھا جس روپ میں یہود نے آپ کو دیکھا تھا مگر صحابہ اس ظاہری مشاہدہ پر نہیں رکے بلکہ انہوں نے آپ کو اندر تک دیکھنے کی کوشش کی۔ یہود آپ کو ظاہر کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو آپ کے حال کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو آپ کے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو محمد بن عبداللہ کے روپ میں دیکھ رہے تھے صحابہ نے آپ کو محمد رسول اللہؐ کے روپ میں دیکھا۔

گویا کہ صحابہ نے جوہر شناسی کا ثبوت دیا اور یہود جوہر شناسی کا ثبوت دینے سے عاجز رہے صحابہ نے حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھا اور اس کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہود نے

یہ ثابت کیا کہ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایک لفظ میں یہود کا کیس تقلید آبا کا کیس تھا اور صحابہ کرام کا کیس جوہر شناسی کا کیس۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ایک گروہ کو اللہ کی نظر میں مومن ٹھہرایا اور دوسرا گروہ اللہ کی نظر میں غیر مومن ہو کر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ والا ایمان معرفت والا ایمان ہے۔ صحابہ نے مجرد سطح پر حقیقت کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ آج بھی وہی ایمان حقیقی ایمان ہے جو آدمی کے اندر مجرد سطح پر حقیقت کو دیکھنے کی نظر پیدا کر دے۔

یہ فرق بے حد بنیادی فرق ہے۔ اسی سے وہ تمام اعلیٰ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو ہم صحابہ کرام کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

عبرت و نصیحت کا مزاج

ایک ایمان وہ ہے جو بس جامد عقیدہ ہو جو آدمی کے ذہنی اسٹور میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز کے طور پر پڑا ہوا ہو۔ وہ آدمی کی زندگی کا کل نہ ہو بلکہ وہ اس کا صرف ایک جزء ہو۔ دوسرا ایمان وہ ہے جو آدمی کے اندر اتنی گہرائی کے ساتھ اترے کہ وہی اس کی فکر و نظر بن جائے۔ آدمی ہر چیز کو اسی خاص زاویہ سے دیکھے۔ وہ ہر چیز میں اپنے ایمان کی جھلک پانے لگے۔ اس کا ایمان اس کا ایک جزء نہ ہو بلکہ وہی اس کا کل بن جائے۔

کوئی حقیقت جب گہرائی کے ساتھ کسی کو ملتی ہے تو وہ اس کی سوچ بن جاتی ہے۔ ایمان اسی قسم کی ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر کسی کے اندر داخل ہو اور وہ اس کی سوچ اور اس کے جذبات پر چھا نہ جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان اسی قسم کا زندہ ایمان تھا۔ ان کا ایمان ان کے پورے فکر و خیال پر چھا گیا تھا۔ وہ ہر چیز میں اسی کا عکس دیکھنے لگے تھے۔ ہر چیز جو ان کی نگاہ سے گزرتی تھی وہ ان کے ایمان کے سانچہ میں ڈھل جاتی تھی۔ ہر مشاہدہ ان کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر ایمانی سبق کا ذریعہ بن جاتا تھا۔

ایک صحابی کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک گاڑی گزری جس میں دو جانور جتے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے ایک جانور بیٹھ گیا اور دوسرا جانور کھڑا رہا۔ جو جانور

بیٹھ گیا تھا اس کو گاڑی ولے نے ڈنڈے سے مارا۔ اس کو دیکھ کر صحابی نے کہا، اِنَّ فِی ھٰذَا لَمُعْتَبَرًا (اس کے اندر بھی نصیحت ہے) یعنی جو جانور چلتا رہا وہ بچ گیا اور جس جانور نے سستی دکھائی اس پر مار پڑی۔ یہی معاملہ انسان کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔ جو انسان خدا کی ڈیوٹی پوری کرے گا وہ نجات پلئے گا اور جو انسان خدا کی ڈیوٹی نہیں پوری کرے گا اس کو سزا ملے گی۔

گاڑی کا واقعہ بظاہر ایک دنیوی واقعہ تھا مگر صحابی نے اس دنیوی واقعہ میں آخرت کی جھلک دیکھ لی۔ ایک مادی مشاہدہ صحابی کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر روحانی واقعہ میں ڈھل گیا۔ اسی فکری تبدیلی کا دوسرا نام نصیحت ہے۔

اعتراف

موجودہ دنیا میں کسی آدمی کے لیے سب سے زیادہ مشکل چیز دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اتنا زیادہ گم رہتا ہے کہ اس کو دوسرے کی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر ایک سچا مومن اس کمزوری سے پاک ہوتا ہے۔ ایمان درحقیقت خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے عجز کی دریافت ہے۔ جب یہ ایمان کسی کو گہرائی کے ساتھ ملتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ذات اس کی نظر سے حذف ہو جاتی ہے۔ اس کا ایمان اس سے اس کی انا کو چھین لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے اندر اعتراف کا مادہ کمال درجہ میں پیدا ہو جاتا ہے دوسرے کا اعتراف کرنے میں آدمی کی اپنی انا رکاوٹ بنتی ہے۔ جس شخص کی انا مٹ چکی ہو اس کے لیے کیا چیز ہو گی جو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بنے۔

لبید ایک صحابی ہیں۔ وہ عرب کے ایک شاعر تھے۔ انہوں نے جب قرآن کو سنا تو وہ فوراً اس کے مومن بن گئے۔ اس کے بعد ان کی شاعری چھوٹ گئی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی تو انہوں نے کہا: اَبَعْدَ الْقرآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کے اس جملہ کی اہمیت سمجھنے کے لیے ہم کو ۱۴سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔ حضرت لبید نے یہ جملہ اس وقت کہا جب کہ قرآن ابھی اتر رہا تھا۔ جب قرآن کو ماننے والے مظلوم تھے۔ جب دنیا میں قرآن کی وہ عظمت قائم نہیں ہوئی تھی جو بعد کو پیش آنے والے تاریخی واقعات کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔ اس وقت یہ کہنا کہ ”کیا قرآن کے بعد بھی“ ایک بے حد

مشکل کام تھا۔ اس کے لیے صحابہ والا ایمان درکار تھا جو آدمی کی خودی کو اس سے چھین لے تاکہ وہ اپنی ذات کے باہر کی حقیقتوں کو کھلے طور پر دیکھنے لگے۔

خدا کی نسبت سے دیکھنا

حضرت ابومسعود ایک صحابی تھے۔ ایک بار وہ اپنے غلام پر خفا ہو گئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ اتفاق سے اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ابومسعود اپنے غلام کو مار رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا: اعلم ابامسعود انّ اللہ اقدر علیک منک علیٰ ھٰذا الغلام۔ (اے ابومسعود، جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اس غلام کے اوپر قادر ہو) حضرت ابومسعود نے جب اس تنبیہ کو سنا تو ان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو اس سے پہلے اپنے غلام کو مار رہا تھا، اس کے بعد کیوں ایسا ہوا کہ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابومسعود معاملہ کو پہلے بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے۔ اب اس یاددہانی کے بعد وہ معاملے کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھنے لگے۔

جب وہ معاملے کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے تو وہ اپنے اور غلام کے درمیان فرق پا رہے تھے ــــــ میں مالک ہوں اور وہ ملازم، میں طاقت ور ہوں اور وہ کمزور، میں امیر ہوں اور وہ غریب، میں صاحب حیثیت ہوں اور وہ بے حیثیت۔ مگر جب یہ ذہن ختم ہوا اور انہوں نے معاملہ کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں اور غلام میں کوئی فرق نہیں۔ اب انہوں نے اپنے آپ کو بھی وہیں کھڑا ہوا پایا جہاں انہوں نے اس سے پہلے اپنے غلام کو کھڑا کر رکھا تھا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انسانوں کے درمیان ہمیشہ فرق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاملہ کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھا جائے تو ایک اور دوسرے کے درمیان فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہی فرق تمام ظلم اور فساد کا سبب ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو بڑا محسوس کرتا ہے وہ چھوٹے اور کمزور پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر معاملات کو خدا اور بندے کی نظر سے دیکھا جانے لگے تو سارا فرق مٹ جائے

گا۔ کیوں کہ خدا کی نظر میں سب حقیر اور کمزور ہیں۔ یہ ذہن خود بخود ظلم و زیادتی کے مزاج کو چھین لیتا ہے۔

صحابہ کرام کا حال یہی تھا۔ وہ ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتے تھے۔ وہ انسان کی طرف بڑھتے ہوئے سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاتھ ہر ظلم سے رکے رہتے تھے۔ ان کا قدم زیادتی کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کا ایمان بھی اسی وقت ایمان ہے جب کہ وہ اس قسم کا زندہ ایمان بن جائے۔ جب ان کے اوپر خدا کی عظمت اس طرح چھا جائے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اس کے زیر اثر محسوس کرنے لگیں۔ جب بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے بھی وہ یہ سوچ کر سنبھل جائیں کہ وہ خدا سے معاملہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ بندہ کمزور ہے مگر خدا تو کمزور نہیں۔

انتقام نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوہ بنی المُصطلِقؒ کہتے ہیں۔ یہ غزوہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے بعد ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ بعد کو قرآن (سورہ نور) میں آیت اتری جس نے حضرت عائشہ کی کامل برأت کر دی۔

اس وقت مدینہ میں ایک مہاجر مسلمان تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ وہ بھی منافقوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس الزام میں شریک ہو گئے۔ مسطح حضرت ابو بکر کے دور کے عزیز تھے۔ ان کی غربت کی وجہ سے حضرت ابو بکر ہر ماہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ حضرت ابو بکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کو اس واقعہ کے بعد مسطح سے سخت شکایت ہو گئی۔ مسطح کے اس فعل کے بعد حضرت ابو بکر نے قسم کھائی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ ــ تم میں جو لوگ وسعت والے ہیں ان کو نہیں چاہیے کہ وہ قسم کھائیں کہ وہ مسکینوں کی مدد نہیں کریں گے۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے۔ اور اللہ بہت معاف کرنے

والا مہربان ہے (**ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم**)

حضرت ابوبکر نے اس آیت کے بعد کہا : **بلیٰ واللہ انی لاحب ان یغفر اللہ لی** (ہاں خدا کی قسم میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے) اور مسطح کو جو اعانت وہ دیا کرتے تھے اس کو دوبارہ جاری کر دیا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق اس میں اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ذاتی شکایت کے معاملہ میں صحابہ کا طریقہ کیا تھا۔ ان کی شکایت کبھی نفرت اور انتقام کی اس حد تک نہیں پہونچتی تھی جو دل سے نکل ہی نہ سکے۔ اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ شکایت پیدا ہونے کے بعد وہ شکایت والے آدمی کے لیے ظالم بن جائیں۔ اور اس کے خلاف ہر کارروائی کو اپنے لیے جائز سمجھ لیں۔ صحابہ کرام ہر معاملے کو آخرت کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔ وہ دوسروں کے قصور کو معاف کرتے تھے تاکہ خدا ان کے قصور کو معاف کرے۔ وہ دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرتے تھے تاکہ خدا ان کی کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ آخرت کا مسئلہ ان کے ذہن پر اتنی شدت سے چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابلہ میں دوسرا ہر مسئلہ انہیں ہلکا نظر آتا تھا۔ وہ آخرت کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتے تھے۔ وہ آخرت کی خاطر ہر رنج کو بھلا دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکے کہ انہوں نے برائی کے بدلے بھلائی کا سلوک کیا۔ انہوں نے تکلیف پہونچانے والوں کو دعائیں دیں۔ جنہوں نے ان کو ستایا ان کے لیے وہ رحمت کا چشمہ بن گئے۔ یہی ایمان مثل صحابہ ایمان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو جو ایمان مطلوب ہے وہ وہی ہے جو مثل صحابہ ایمان ہو۔ جس شخص کو یہ تمنا ہو کہ آخرت میں خدا اس کے ایمان کو قبول کرے اس کو چاہیے کہ وہ صحابہ کے نمونے کو پکڑے۔ وہ صحابہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ وہ ایمان کے معاملے میں صحابہ کی تقلید کرنے والا بن جائے۔

ہر حال میں انصاف

عبدالرحمٰن بن عوف ایک صحابی تھے۔ اور حضرت خالد بن ولید بھی ایک صحابی تھے۔ دونوں کے درمیان کسی دنیوی معاملہ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ شکایت اتنی بڑھی کہ وہ عرصہ تک ختم نہ ہو سکی۔

اس درمیان میں ایک شخص حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آیا۔ اس نے ان کو خوش

کرنے کے لیے حضرت خالد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ تاثر دینا چاہا کہ حضرت خالد دینی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ان کا اسلام زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ یہ سن کر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سنجیدہ ہوگیے۔ انہوں نے مذکورہ آدمی سے کہا: **مه فان ما بيننا لم يبلغ ديننا۔** (دور رہو، ہمارے اور ان کے درمیان جو بات ہے وہ ہم دونوں کے دین تک نہیں پہنچے گی) یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دنیا کے معاملہ میں جو شکایت ہے اس کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ایک دوسرے کے اسلام کو ناپنے لگیں۔ اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دینی حیثیت سے بُرا کہنے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی شخص سے ایک معاملے میں شکایت پیدا ہو جائے تو اس کو بس اسی معاملہ تک محدود رکھا جائے۔ ایک معاملہ کی شکایت کو لے کر آدمی کو ہر معاملہ میں کنڈم نہ کیا جائے۔ وہ قرآن کی اس ہدایت کے سختی سے پابند تھے کہ: **ولا يجرمنكم شنآن قوم علىٰ الّا تعتدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوىٰ** (المائدہ ۸) یعنی کسی کی دشمنی تمہیں یہاں تک نہ لے جائے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بلکہ دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ یہی راستہ تقویٰ سے قریب ہے۔

یہ ایمانی طریقہ جو صحابہ کرام کا تھا یہی عام مسلمانوں کو بھی اختیار کرنا ہے۔

خلاصہ

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مثل یہود ایمان اور دوسرا مثل صحابہ ایمان۔ مثل یہود ایمان دوسرے لفظوں میں نسلی اور تقلیدی ایمان ہے۔ وہ جامد پتھر کی مانند ہے جس میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ اس سے کردار اور عمل کی شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ اس سے روحانی ترقی کے چشمے جاری نہیں ہوتے۔ ایسا ایمان آدمی کی دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ ایسا ایمان الگ رہتا ہے اور آدمی کی زندگی الگ۔

اس کے برعکس مثل صحابہ ایمان ایک معرفت ہے۔ وہ ایک ڈسکوری ہے۔ وہ ایک فکری انقلاب ہے۔ جب کسی آدمی کے اندر یہ ایمان پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے پورے وجود کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی ہستی خدا کے نور میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے سوچنے

اور عمل کرنے کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ وہ ظاہری چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے لگتا ہے۔ گردوپیش کی ہر چیز اس کے ایمان کی غذا بن جاتی ہے۔ ایمان اس کے لیے اتنی بڑی چیز ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہر چیز اس کی نظر میں چھوٹی ہو جاتی ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کی نفسیات سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کا ایمان اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہے۔ وہ کبھی صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔

دھلی ، یکم جولائی ۱۹۸۵

ایمانی برکتیں

دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ جامد اور نمو پذیر۔ جامد وہ ہے جو یکساں طور پر اپنی حالت پر باقی رہے۔ نمو پذیر وہ ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے۔ پتھر پہلی چیز کی مثال ہے اور درخت دوسری چیز کی مثال۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں۔ وہ درخت کی طرح اضافہ پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ درخت اپنے مادی وجود کے اعتبار سے بڑھتا ہے اور مومن کا ایمان اپنے شعوری وجود کے اعتبار سے۔ درخت کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی لکڑی اور پتی بڑھے۔ ایمان کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی معرفت بڑھے۔ اس کا یقین بڑھے۔ اس کا اعتماد علی اللہ بڑھے۔ اس کی ربانی گہرائیوں میں اضافہ ہو۔

اس اضافۂ ایمان کے دو خاص راستے ہیں۔ ایک فکر اور دوسرا صبر۔ آدمی جب اللہ کو یاد کرتا ہے۔ جب وہ اللہ کی کاریگری میں غور کرتا ہے تو اس کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے وہ معرفت کے نئے نئے پہلوؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ اسی طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں جب وہ مختلف قسم کے ناموافق حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اور ان حالات میں وہ اپنے ایمانی تقاضوں پر قائم رہتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ اپنی ایمانی قوت کو بڑھاتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کو پختہ سے پختہ تر کرتا چلا جاتا ہے

فکر کی راہ سے اضافہ

آدمی کے ایمان میں فکر کی راہ سے جو اضافہ ہوتا ہے، اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے:

وإذا ما أنزلت سورة فمنهم من يقول أيكم   اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض

زادتہ هٰذہٖ ایمانا۔ فاما الـــذین اٰمنوا فـزادتھم ایمانا وھـم یستبشرون۔ (التوبۃ ۱۲۴)	کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا۔ پس جو ایمان والے ہیں ان کا ایمان اس نے بڑھا دیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔

قرآن میں خالق کا تعارف ہوتا ہے۔ انسان کے اندر چھپے ہوئے بندگی کے احساسات کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کے لاشعور کو شعور کی سطح پر لے آتی ہیں۔ وہ اس کے اندر خالق و مخلوق کے تعلق کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں۔ اس طرح قرآن کو سن کر اور پڑھ کر آدمی کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے اور برابر بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اصحاب میں سے ایک یا دو آدمی کا ہاتھ پکڑتے اور کہتے کہ آؤ ہم اپنے ایمان میں اضافہ کریں (کان عمر رضی اللّٰہ عنہ یاخذ بیـد الرجل والرجلین من اصحابہ فیقول تعالوا حتی نـزداد ایماناً، مظہری، رابع ۳۲۶)

حضرت عبداللہ بن رواحہ کا ایک واقعہ امام بیہقی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

عن عطاء بن یسار۔ ان عبـد اللّٰہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعال۔ حتی نؤمنَ ساعۃ۔ قـال اَوَلسنـا بمؤمـنـین قال بلٰی۔ ولکنا نـذکر اللّٰـہ فـنزدادُ ایمـانًا۔	عطار بن یسار کہتے ہیں کہ عبداللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ ہم ایک گھڑی کے لیے ایمان لائیں۔ ساتھی نے کہا، کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ہاں۔ مگر ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم ایمان میں بڑھ جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ آؤ ہم بیٹھ کر اللہ کی بڑائی بیان کریں۔ ہم اللہ کے کمالات کو یاد کریں۔ ہم اللہ کے آلاء (کرشموں) کا اجتماعی تذکرہ کریں۔ اس سے اللہ کے بارہ میں ہمارا احساس تازہ ہوگا۔ اللہ کے بارہ میں ہمارا یقین بڑھے گا۔ اللہ کے بارہ میں ہماری معرفت مزید ترقی کرے گی۔

صحابہ کرام میں یہ مزاج قرآن کے مطالعہ سے بنا تھا جو اپنے پڑھنے والے کو بار بار اکساتا ہے کہ وہ ذکر و فکر کے ذریعہ اپنے ایمان کو بڑھائے۔ وہ اپنے ایمان کو مسلسل ترقی دیتا رہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کا تزکیہ کرتے ہیں۔ ویزکیہم، البقرہ ۱۲۹۔ اس تزکیہ کا خاص پہلو یہی ہے۔ ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال ابوذر: ولقد ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما یقلب طائر جناحیہ فی السماء الا ذکر لنا منہ علماً

تفسیر ابن کثیر، جزء ۲، صفحہ ۱۳۱

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور حال یہ تھا کہ ایک چڑیا بھی آسمان میں اپنا پر نہیں پھڑپھڑاتی تھی مگر آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے۔

ذکر و فکر سے کس طرح ایمان بڑھتا ہے، اس کی ایک تازہ مثال لیجئے۔

جدید معلومات کے مطابق ہماری دنیا ناقابل قیاس حد تک بڑی دنیا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ کائنات اتنی زیادہ بڑی ہے کہ ایک ہوائی جہاز اگر روشنی کی رفتار سے روانہ ہو۔ یعنی اس کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ ہو تو اس ناقابل قیاس حد تک تیز رفتار جہاز کو کائنات کے گرد ایک چکر لگانے میں ایک ارب سال سے زیادہ لگ جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ جہاز اور اس کے مسافر اتنی لمبی مدت تک باقی بھی رہیں۔

اس عظیم کائنات میں بے شمار ستارے ہیں۔ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں اس سے بھی زیادہ آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے۔ یہ ستارے بے حد بڑے ہیں۔ اتنے بڑے کہ ہماری زمین جیسی کروروں زمینیں کسی ایک ستارہ پر رکھ دی جائیں تب بھی اس کے اوپر جگہ باقی رہے گی۔ صرف ہماری کہکشاں میں ۱۰۰۰۰۰ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔

یہ تمام کے تمام ستارے آگ کے دہکتے ہوئے اتھاہ سمندر ہیں۔ ان میں انسانی آبادی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس عظیم کائنات میں ایک ہی معلوم شمسی نظام ہے اور اس میں ہماری زمین جیسی ایک ہی زمین ہے۔ ساری کائنات میں کوئی بھی دوسرا معلوم کرہ نہیں جس میں پانی ہو، جس میں سبزہ ہو جس میں زندگی پائی جاتی ہو۔ جہاں وہ تمام چیزیں اور وہ تمام متوازن اسباب موجود ہوں جن سے تمدن کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اس طرح کی ان گنت معلومات ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہماری دنیا کے بارہ میں حاصل ہوئی ہیں۔ اگر آدمی ان معلومات کو سامنے رکھ کر غور کرے تو خالق کی عظمت کے احساس سے اس کا دل دہل

اٹھے گا۔ نیز یہی مطالعہ اس کو بتائے گا کہ کائنات کے خالق نے انتہائی استثنائی طور پر اس کے لیے یہاں زندگی اور ترقی کا سامان کیا ہے۔ اس احساس سے اس کے سینے میں شکر کا سمندر موجزن ہوجائے گا۔ یہ چیزیں اس کی معرفتِ حق میں بے پناہ اضافہ کردیں گی۔

جس زمانہ میں میں اپنی کتاب "مذہب اور جدید چیلنج" کے سلسلہ میں فلکیات اور ارضیات کا مطالعہ کر رہا تھا، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کہ میں کارخانہ کائنات میں خدا کو بالکل عیاناً دیکھ رہا ہوں۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، اعظم گڈھ کے ایک صاحب (شاہ نصیر احمد مرحوم) نے مجھ سے پوچھا: کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ معاً میری زبان سے نکلا "کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر واقعی معنوں میں ذکر و فکر کرے تو وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ اس کا ایمان غیب سے آگے بڑھ کر شہود تک پہونچ جائے۔

صبر کی راہ سے اضافہ

ایمان میں اضافہ کا دوسرا ذریعہ وہ ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے۔ صبر کا مطلب ہے جمنا۔ آدمی کے سامنے جب ایسی صورت حال آئے کہ دین پر قائم رہنے کے لیے اسے قربانی دینی ہو، اسے اپنے جذبات کو کچلنا پڑے، خدا کا خوف اسے مجبور کردے کہ وہ اپنی سوچ کو موڑ کر خدائی سوچ کے تابع کرے اس قسم کا ہر عمل صبر ہے اور جب آدمی اس قسم کا عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے حق میں اپنی قوت ارادی کو بڑھاتا ہے، وہ خدا کے تعلق کا نیا تجربہ کرتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اسی قسم کی ایک مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ صلح حدیبیہ تمام تر دشمن کی یک طرفہ شرائط پر کی گئی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس پر سخت برہم تھے، ان کا دل و دماغ کسی طرح تیار نہ تھا کہ اس قسم کی ذلّت آمیز صلح پر راضی ہوجائیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس وقت اللہ کی مرضی یہی ہے تو سب نے جذبات کے طوفان کے باوجود اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دیا۔ انھوں نے اپنے دماغ کا سانچہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔ اس کا فوری فائدہ انھیں یہ ملا کہ ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔ قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

هوالذی انزل السكينة فی قلوب المومنين   وہ اللہ ہی ہے جس نے مومنین کے دل پر اطمینان

لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم (الفتح ۴)	اتارا تاکہ ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

حدیبیہ کے موقع پر دشمن نے صلح کی یک طرفہ شرطیں پیش کیں تھیں۔ صحابہ جب اللہ کی خاطر ان یک طرفہ شرطوں پر راضی ہوئے تو انھوں نے ایک نئے ایمان کا تجربہ کیا۔ پہلے اگر انھوں نے اللہ کو بطور ایک خارجی واقعہ کے مانا تھا تو اب انھوں نے اللہ کو اپنی نفی کی قیمت پر مانا۔ اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے اس ایمان کا تجربہ کیا کہ اپنی بڑائی ختم ہو تب بھی وہ خدا کے حکم کو مانیں۔ اپنی خواہشات پامال ہوں تب بھی وہ خدا کے طریقہ کو نہ چھوڑیں۔ اپنا ذہنی سانچہ ٹوٹے تب بھی وہ اپنی رائے کو خدا کی رائے کے تابع کریں۔ یہ ہے ایمان پر ایمان کا اضافہ۔

ایک حدیث

اضافۂ ایمان کے اس معاملہ کو ایک حدیث قدسی میں تمثیل کے انداز میں واضح کیا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

إذا ابتلَيتُ عَبدی المومن فَصَبَرَ فلم یَشکُنی الیٰ عُوّادِہٖ اطلقتُہٗ من إساری ثم ابدَلتُہ لحمًا خیرًا من لحمہ و دمًا خیرًا من دمہ ثم یستأنفُ العمل (رواہ الحاکم عن ابی ھریرہ)	اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب میں اپنے مومن بندے کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے، وہ حال پوچھنے والوں سے شکایت نہیں کرتا تو میں اس کو اپنی قید سے آزاد کر دیتا ہوں۔ پھر میں اس کے گوشت کو زیادہ بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو زیادہ بہتر خون سے بدل دیتا ہوں۔ پھر وہ از سر نو عمل کرنے لگتا ہے۔

تکلیف پر صبر کرنا یہ ہے کہ آدمی تکلیف کے حالات میں بھی حق پر قائم رہے۔ جب آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کا تجربہ کرتا ہے کہ جو حق اس نے پایا ہے وہ ہر دوسری چیز سے زیادہ بڑا ہے۔ ہر دوسری چیز کو کھونا قابل برداشت ہے، مگر حق کو کھونا اس کے لیے قابل برداشت نہیں۔

اس تجربہ سے پہلے حق اگر اس کی نگاہ میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز تھا تو اب حق اس کے لیے تمام چیزوں سے زیادہ بڑا اور قیمتی بن جاتا ہے۔ ایسی آزمائش کے موقعہ پر جو شخص صبر کا ثبوت دے اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اندر ایک نئے انسان کا تجربہ کرتا ہے اس کا خون اب نیا خون اور اس کا گوشت اب نیا گوشت بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے کردار میں نئی جان آجاتی ہے۔ اس کا عمل ایک نئے انسان کا عمل بن جاتا ہے۔

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ ان کے یہاں پہلی بیوی سے دو اولاد ہوئی۔ ایک یوسف، دوسرے بن یمین۔ یہ دونوں بھائی ابھی چھوٹے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یعقوب نے دوسرا نکاح کیا جس سے دس لڑکے پیدا ہوئے۔ سوتیلے بھائیوں کو شکایت ہوئی کہ ان کے والد یوسف کو زیادہ مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت یوسف کے دشمن ہوگیے۔ حضرت یوسف کی عمر تقریباً ۱۶ سال تھی کہ ان کے سوتیلے بھائی ان کو ایک سنسان مقام پر لے گیے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کے بعد انھوں نے آپ کے ایک کپڑے کو جانور کے خون میں رنگا اور اس کو اپنے والد کو دکھا کر کہہ دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔

حضرت یعقوب اپنے بیٹوں میں سے حضرت یوسف کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کو اس کا بے حد صدمہ ہوا۔ حتیٰ کہ غم سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ مگر اس دردناک حادثہ پر انھوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ قرآن کے مطابق انھوں نے اس پر صبر کر لیا اور زبان سے صرف یہ کہا :

انّما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ
(یوسف ۸۶)

میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

حضرت یعقوب پر جو غم پڑا تھا وہ بظاہر انسانوں کی طرف سے آیا تھا مگر اس کے بارہ میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا سے کہنا شروع کر دیا۔ اپنی توجہ کو انھوں نے انسانوں سے ہٹا کر خدا کی طرف کر لیا۔ اس طرح انھوں نے اس اعلیٰ حقیقت کا تجربہ کیا کہ واقعات خواہ بظاہر انسانوں کی طرف سے پیش آئے ہوں مگر حقیقۃً وہ خدا کی اجازت کے تحت ہوتے ہیں۔ اور وہی تنہا یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آدمی کے کھونے کی تلافی کر سکے۔

۲۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ مگر بعد کو ایک غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کو زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے :

فاثابکم غمًّا بغمٍّ لکیلا تحزنوا	پھر اللہ نے تم کو رنج پر رنج دیا تاکہ جو کچھ تم سے
علی ما فاتکم ولا ما اصابکم واللّٰہ خبیر	کھویا جائے یا جو مصیبت تم پر پڑے اس پر
بما تعملون (آل عمران ۱۵۳)	تم غمگین نہ ہو۔

احد کی جنگ میں شکست رسول کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ براہِ راست اللہ کے علم میں تھی۔ مگر اللہ نے اس کو ہونے دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے شعور ایمان میں اضافہ ہو۔ ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو کہ وہ کھونے کو برداشت کرسکیں۔ وہ ایک چیز کو کھو کر جانیں کہ دوسری اس سے زیادہ بڑی چیز اب بھی ان کے پاس موجود ہے اور وہ ان کا عقیدہ ہے۔

ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا کو کھونے کے بعد بھی خدا کو نہ کھوئے۔ نقصان اس کے لیے اس تجربہ کا ذریعہ بن جائے کہ فانی چیزوں کے درمیان ایک ایسی چیز بھی موجود ہے جو کبھی فنا نہ ہو جو کبھی آدمی سے کھوئی نہ جائے۔ دنیا کے کھونے کو برداشت کرکے اپنے اندر اس قسم کا احساس زندہ کرنا گویا ایک قسم کا ذہنی سفر کرنا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مزید آگے کی طرف لے جانا ہے۔ جو شخص اس غیر فانی سرمایہ کو پالے وہ محرومیوں کی اس دنیا میں کبھی احساس محرومی سے دوچار نہ ہوگا۔

۳۔ غزوۂ بنی المصطلق (۶ھ) کے بعد مدینہ کے کچھ شر پسندوں نے ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کو غلط رُخ دے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ پر نعوذ باللہ جھوٹا الزام لگایا۔ حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ اور حضرت ابوبکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر حضرت ابوبکر کو اس کا بے حد رنج ہوا۔ کسی باپ کے لیے اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کوئی نہیں کہ اس کی پاکباز لڑکی پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگایا جائے۔

اس جھوٹی مہم میں مدینہ کے ایک سادہ لوح مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ یہ حضرت ابوبکر کے ایک غریب رشتہ دار تھے اور حضرت ابوبکر ان کی ماہانہ امداد کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے شدت احساس کے تحت قسم کھالی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد

نہیں کروں گا ۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری :

ولایاتل اولوا الفضل منکم والسّعۃِ ان یوتوا اولی القربیٰ والمساکین و المهاجرین فی سبیل اللہ ۔ ولیعفوا ولیصفحوا ۔ الاتحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم ۔

(النور ۲۲)

تم میں سے جو لوگ فضل اور وسعت والے ہیں وہ اس کی قسم نہ کھالیں کہ وہ اپنے رشتہ دار اور مسکین اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے ۔ چاہیے کہ وہ انھیں معاف کردیں اور درگذر کریں ۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کردے ۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

حضرت ابوبکر نے یہ آیت سنی تو فوراً کہا : خدا کی قسم ہم ضرور چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ، تو ہمیں معاف کردے (بلیٰ واللہ انّا نحبُّ ان تغفر لنا یا ربّنا)

اس سے پہلے حضرت ابوبکر ایک ایسے ”مسطح“ کی مدد کر رہے تھے جس سے انھیں کوئی چوٹ نہیں لگی تھی ۔ اب مسطح کی مدد کرنا ایک ایسے شخص کی مدد کرنا تھا جس سے انھیں سخت چوٹ پہونچی تھی ۔ پہلے اگر وہ نفس سے لڑے بغیر مسطح کی مدد کر رہے تھے تو اب ان کے فیصلہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ نفس سے لڑکر مسطح کی مدد کریں گے ۔ اس طرح انھوں نے سیکھا کہ غصہ کو الگ کرکے ایک شخص کے ساتھ سلوک کریں ۔ انھوں نے جانا کہ صرف معمول کے حالات میں مومنانہ اخلاق نہیں برتنا ہے ۔ بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی مومنانہ اخلاق برتنا ہے ۔ ان کے اس عمل نے ان کے ایمان کو ایک درجہ اوپر کردیا ۔

۴ ۔ حضرت عائشہ صدیقہ پر نعوذ باللہ برائی کا جو الزام لگایا گیا ، اس سلسلہ میں مدینہ میں بہت سے واقعات پیش آئے ۔ ان میں سے ایک واقعہ روایات میں اس طرح آیا ہے :

عن افلح مولیٰ ابی ایوب قالت لہ امرأته امّ ایوب یا ابا ایوب الا تسمع ما یقول الناس فی عائشة ۔ قال بلیٰ وذالك الکذب ۔ افکنتِ یا امَّ ایوب فاعلة

حضرت ابو ایوب انصاری کے غلام افلح کہتے ہیں کہ ان کی بیوی ام ایوب نے ان سے کہا کہ اے ابو ایوب کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ۔ اور وہ

ذالك۔ قالت لا والله۔ قال فعائشة والله خير منك (تفسیر ابن کثیر ۲۷۳/۳)

جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب کیا تم ایسا کروگی۔ ان کی بیوی نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ پر جو الزام لگایا گیا اس کے معاملہ میں ایک طریقہ ان لوگوں کا تھا جن کا حال یہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا تحقیق بیان کرنے لگے۔ مگر حضرت ابو ایوب نے اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھایا۔ انھوں نے معاملہ کو اپنی عقل سے جانچا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود ایسا نہیں کر سکتے اس لیے انھوں نے کہہ دیا کہ عائشہ نے بھی ایسا نہیں کیا۔

یہ ایک شعوری صبر کا واقعہ تھا۔ حضرت ابو ایوب نے جب ایسا کیا تو حدیث کے الفاظ میں ان کا خون زیادہ بہتر خون اور ان کا گوشت زیادہ بہتر گوشت بن گیا۔ ان کے اندر وہ شخصیت پیدا ہوئی جو دوسرے کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا کر دیکھے۔ وہ ہر معاملے کو اصول کی روشنی میں جانچے نہ کہ سطحی خواہشات کی روشنی میں۔

خلاصہ

ایک اسلام معمول والا اسلام ہے۔ دوسرا اسلام وہ ہے جب کہ آدمی معمول کے خلاف اسلام پر عمل کرے۔ خدا کی دنیا کو ظاہری طور پر دیکھنا بھی خدا کی یاد دلاتا ہے۔ مگر جب آدمی دنیا کے ظاہر سے گزر کر اس کے اندرونی عجائب پر غور کرتا ہے تو اس کی معرفت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ معتدل حالات میں اخلاق برتنا بھی ایک اچھا کام ہے۔ مگر جب آدمی ایک ایسے شخص سے اخلاق برتے جس سے اس کے تعلقات خراب ہو گیے ہوں تو وہ ایسے ایمان کا تجربہ کرتا ہے جس کا اس نے پہلے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک ایسے شخص سے انصاف کرنا بھی انصاف ہے جس سے آپ کا بناؤ ہو۔ مگر جب آپ ایک ایسے شخص سے انصاف کریں جس سے آپ کا بگاڑ ہے تو اس وقت آپ کا عمل سادہ معنوں میں محض انصاف کا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کو خدا سے براہِ راست ملانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ عمل کے دوران ایمان کی یہی مزید خوراک ہے جس کو اضافۂ ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان ہمیشہ بڑھتا ہے۔ مگر یہ بڑھنا ہمیشہ اس نسبت سے ہوتا ہے جتنا آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔

حصّہ دوم

ایمان اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ایمان ایک طرف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پتھر کی طرح جامد نہ رہے، بلکہ درخت کی طرح ہمیشہ بڑھنے والا اور ترقی کرنے والا وجود بن جائے۔ اسی طرح ایمان آدمی کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا کرتا ہے جو دنیا میں ہر قسم کی کامیابی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ اس صفت کا نام ایک لفظ میں صبر ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان اللہ مع الصابرین (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اعلم ان النصر مع الصبر (جان لو کہ خدا کی مدد صبر کے ساتھ وابستہ ہے) یعنی اللہ بلاشبہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اللہ کی مدد کامیابی کا یقینی ذریعہ ہے۔ مگر اللہ کی مدد کا دروازہ صرف اس شخص یا گروہ کے لیے کھلتا ہے جو مشکل پیش آنے کے وقت صبر کا ثبوت دے۔ مدد ہمیشہ اللہ کی طرف سے آتی ہے مگر اس کو لینے کے لیے بندے کی طرف سے صبر کا پیمانہ درکار ہے۔

یہ کوئی پر اسرار قسم کی اعتقادی بات نہیں۔ بلکہ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا عام قانون ہے۔ اس قانون کو زیادہ واضح طور پر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۴ میں بیان کیا گیا ہے جس کا نام الانشراح ہے۔ اس سورۃ میں اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ ان مع العسر یسرا (بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے) یعنی اس دنیا میں خدا نے آسانیوں کو مشکلات کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ یہاں جو شخص آسانی کی منزل تک پہونچنا چاہے اس کو جاننا چاہیے کہ وہ دشواریوں سے بھرے ہوئے راستے سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون ہے اور اس قانون میں کوئی استثنار نہیں۔

مشکل میں آسانی

سورہ الانشراح یا سورہ الم نشرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس دور میں اتری جس کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ اس وقت مکہ کے حالات بہت سخت تھے۔ اس وقت کے مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو ناقابل بیان تکلیفوں میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ تکلیف

کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو قدیم مکہ کے لوگوں نے آپ پر نہ ڈالی ہو۔

حضرت طارق بن عبداللہ المحاربی کہتے ہیں کہ میں نے بعثت کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذو المجاز کے بازار میں پہلی بار دیکھا تھا۔ آپ لوگوں کے درمیان یہ کہتے ہوئے گزر رہے تھے کہ : یاایھاالناس قولوا لاالٰہ الاّ اللّٰہ تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے) آپ یہ کہتے جاتے تھے اور ایک شخص آپ کے پیچھے آپ کو پتھر مارتا ہوا چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کہتا جاتا تھا : یاایھاالناس لاتطیعوہ فانہ کذاب (اے لوگو اس کی بات نہ مانو کیوں کہ وہ جھوٹا ہے)

حضرت عروہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کہا کہ قدیم مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہونچاتے تھے اس کا کچھ حال بیان کیجئے۔ عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حطیم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں عقبہ بن ابی معیط آیا۔ اس نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اتنے زور سے کھینچا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ قدیم مکہ میں اسلام کے دشمن آپ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی سالوں میں یہ حال تھا کہ نماز پڑھنا یا قرآن کی تلاوت کرنا بھی مشرکین کو گوارا نہ تھا۔ ابن ہشام اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو نماز پڑھنا ہوتا تو وہ پہاڑ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے۔ وہ اپنی نماز کو اپنی قوم سے چھپاتے تھے۔ (کان اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا صلّوا ذھبوا فی الشعاب وَاسْتَخْفَوْا بصلاتھم من قومھم، صفحہ ۲۷۵)

قدیم مکہ کے مشرکین صرف برا بھلا کہنے پر نہیں رکتے تھے، وہ باقاعدہ مارپیٹ بھی کرتے تھے۔ وہ ہر طرح مسلمانوں کو ستاتے تھے جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہی سخت حالات تھے جب کہ قرآن میں یہ آیت اتری :

فان مع العسر یُسرا	پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔
انّ مع العسر یُسرا	بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے :

خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومًا مسرورًا وھو یضحک وھو یقول : لن یغلبَ عسرٌ یُسرین لن یغلبَ عسر یسرین فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرًا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے ۔ آپ خوش تھے اور ہنس رہے تھے اور یہ فرمارہے تھے کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ، ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ۔

یہ آیت موجودہ دنیا میں خدا کے قانون کو بتارہی ہے ، اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جب بھی آدمی کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے مشکلات آتی ہیں ۔ مگر ہر مشکل میں آسانی کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے ۔ یہاں ہر ڈِس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے یہاں آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی مشکل پیش آئے تو وہ مشکل میں چھپی ہوئی آسانی کو دریافت کرے ، وہ ڈِس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج کو پالے ۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے ۔ جو لوگ اس راز کو دریافت کرسکیں وہ کامیاب ہیں اور جو لوگ اس راز کو دریافت نہ کرسکیں وہی وہ لوگ ہیں جو ناکام ہوگیے ۔

انسانی علم کی تصدیق

زندگی کی یہ حقیقت جو قرآن میں بیان کی گئی ہے ، یہ اتنی واضح ہے کہ علمار نفسیات جنھوں نے انسان کا مطالعہ خالص علمی انداز سے کیا ہے انھوں نے بھی اس راز کو پالیا ہے ۔ اور اس کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے ۔

یہاں میں مشہور عالم نفسیات ڈاکٹر الفرڈ ایڈلر (۱۹۳۷– ۱۸۷۰) کا حوالہ دوں گا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے احساس کمتری (Inferiority feeling) کا لفظ استعمال کیا ۔ اور اس کی سختی سے تردید کی ۔

الفرڈ ایڈلر نے پوری زندگی اس مطالعہ میں صرف کردی کہ انسان کیا ہے اور وہ کس طرح اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے ۔ وہ ایک ممتاز ترین ماہر نفسیات تھا ۔ اس نے تمام عمر کے مطالعہ کے بعد ایک کتاب

لکھی جس کا نام ہے (*The Individual Psychology*) اس میں اس نے لکھا ہے کہ انسانوں کے اندر میں نے ایک انتہائی حیرت ناک خصوصیت پائی ۔ ان کی یہ طاقت کہ وہ ایک نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکیں :

...... their power to turn a minus into a plus.

الفرڈ ایڈلر نے جس چیز کو انسان کی طرف منسوب کیا ہے ۔ وہ دراصل خدا کا عطیہ ہے ۔ انسان بلاشبہ اس دنیا میں اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرتا ہے ۔ مگر یہ معجزہ انسانی طاقت کی بنا پر نہیں ہوتا ۔ وہ اس لیے ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا کو اس ڈھنگ سے بنایا ہے کہ اس کے اندر یہ امکان بے پناہ حد تک موجود ہے کہ ناموافق حالات کبھی بھی انسان کے لیے آخری اور کلی معنوں میں ناموافق نہ بنیں یہاں ہمیشہ ناموافق میں موافق پہلو موجود رہے تاکہ انسان اس کو استعمال کر کے کامیابی کی منزل تک پہونچ سکے ۔

یہاں ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کریں گے جو اس حقیقت کی زندہ مثال ہیں ۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ جو عُسر پیش آیا ، کس طرح اس کے اندر خدا نے یُسر کا پہلو رکھ دیا تھا ۔ اور اللہ کے یہ بندے جب منفی نفسیات کا شکار نہیں ہوئے تو انھیں اس پہلو کو جاننے میں دیر نہیں لگی ۔ انھوں نے یُسر کے پہلو کو استعمال کر کے تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا ۔ جو واقعہ بظاہر ان کے خلاف جا رہا تھا اس کو انھوں نے اپنے موافق بنا لیا ۔

مخالفت سے رفع ذکر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے مکہ میں اسلام پھیل گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا ۔ یہاں ابن ہشام نے یہ الفاظ لکھے ہیں : ثم دخل الناس في الاسلام ارسالاً من الرجال والنساء حتى فشا ذكر الاسلام بمكة ، وتُحُدِّثَ به ، صفحہ ۲۷۴) پھر عورتوں اور مردوں کی ایک جماعت اسلام میں داخل ہوگئی ، یہاں تک کہ اسلام کا ذکر مکہ میں پھیل گیا اور اس کا چرچا کیا جانے لگا ۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ اسلام کی رفتار دن بدن بڑھ رہی ہے تو ان کے سردار ولید بن مغیرہ کے مکان پر جمع ہوئے ۔ انھوں نے یہ مشورہ کیا کہ حج کا موسم قریب آگیا ہے اور تمام عرب کے قبائل مکہ میں جمع ہوں گے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محمد کی باتوں سے متاثر ہو جائیں ۔ اس لیے ہمیں پہل کر کے آنے والے قبائل

سے کوئی ایسی بات کہدینی چاہیے کہ وہ محمد کی طرف سے بدگمان ہوجائیں اور ان کی طرف دھیان نہ دیں۔

اس سلسلہ میں مختلف سرداروں نے مختلف رائیں دیں۔ آخری مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ عرب کے وفود جب حج کے موسم میں مکہ میں جمع ہوں تو تمام سرداران کے درمیان جائیں اور انھیں قومی تفریق پیدا کرنے والا بناکر لوگوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

اس وقت مکہ میں اسلام بہت کمزور حالت میں تھا۔ ایسی حالت میں مکہ کے تمام سرداروں کا متفق ہوکر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا بظاہر ایک مایوس کن بات تھی۔ عرب کے قبائل پر مکہ کے سرداروں کا زبردست اثر تھا۔ اس لیے ان کا متفقہ طور پر اسلام کے خلاف کھڑا ہونا بظاہر یہ معنی رکھتا تھا کہ لوگ اسلام سے بدک جائیں اور اس کے پیغام کو سننے کے لیے تیار نہ ہوں۔

مگر یہ واقعہ کا ایک پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس طرح اسلام کی زبردست تشہیر ہوگئی۔ اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں نے اسلام کو جان لیا جن کو بتانا اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہ تھا۔ مکہ کے سردار اگرچہ اسلام کی مخالفت میں بولتے تھے۔ مگر انسان کی یہ نفسیات ہے کہ جس چیز کی مخالفت کی جائے اس کے بارے میں اس کے اندر تجسس (Curiosity) پیدا ہوتا ہے۔ وہ سنی ہوئی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مزید اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسلام کو جاننے کے لیے ان کے اندر مزید اشتیاق بڑھ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر سرداروں کی اس مخالفانہ مہم پر غم زدہ تھے۔ مگر قرآن نے اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو لیا اور قرآن میں یہ آیت اتری :

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا مذکور بلند کیا) قریش کی مہم ایک اعتبار سے مخالفانہ پروپیگنڈے کی مہم تھی۔ مگر دوسرے اعتبار سے وہ اسلام کا چرچا کرنے کی مہم تھی۔ قرآن نے دوسرے پہلو کو لیتے ہوئے بتایا کہ اس مہم کے تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہے۔ جو چیز ایک پہلو سے مخالفانہ پروپیگنڈا ہے وہ دوسرے پہلو سے رفع ذکر ہے۔ تم اس دوسرے پہلو کو جانو اور اس کو استعمال کرو۔

اس طرح اس وقت کے مسلمانوں کو سوچ کی ایک مثبت لائن مل گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قریش کے پیدا کیے ہوئے تجسس کو وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے سے زیادہ متحرک ہوگیے۔ جو لوگ قریش کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اس سوال سے دوچار تھے کہ —— "یہ نیا دین کیا ہے"

ان کو بتایا کہ اسلام کا اصل پیغام یہ ہے۔ اس طرح اچانک اسلام کا رفع ذکر ہو گیا۔ مسلمانوں کی اپنی کوشش سے برسوں میں جتنا اسلام پھیلا تھا، دشمنوں کی مخالفت کے بعد وہ اس سے کئی گنا زیادہ مقدار میں تھوڑے، دنوں میں پھیل گیا۔

تاخیر نعمت بن گئی

قدیم مکہ کے لوگوں نے اسلام کے خلاف جو تدبیریں کیں ان میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ انھوں نے اپنے دو خاص آدمی، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط مدینہ بھیجے۔ وہ وہاں یہودی علماء سے ملے اور ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اہل تورات ہو۔ ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمارے آدمی کے بارہ میں بتاؤ۔ یہود نے کہا کہ تم لوگ ان سے چند چیزوں کی بابت سوال کرو۔ اگر وہ ان کے بارہ میں بتا دیں تو وہ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں اور اگر وہ نہ بتا سکیں تو وہ صرف باتیں بنانے والے ہیں۔

(فَاِنْ اخبرکمْ بھنّ فھو نبیٌّ مرسل والّا فرَجل متقوِل)

ان باتوں میں سے ایک سوال اس شخص کے بارے میں تھا جو مشرق سے لے کر مغرب تک پہونچا۔ دوسرا سوال ان نوجوانوں کے بارے میں تھا جو غار میں جا کر سو گیے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سوالات کو سنا تو فرمایا: اخبرکم غداً عما سألتم عنہ۔ جن چیزوں کے بارے میں تم نے پوچھا ہے ان کے بارے میں تم کو میں کل بتاؤں گا۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے یہ فرمایا مگر انشاء اللہ نہ کہا۔ آپ کو خیال تھا کہ حضرت جبریل کل آئیں گے تو ان سے پوچھ کر بتا دوں گا۔ مگر خلافِ معمول حضرت جبریل کل کے دن نہ آئے۔ حتی کہ پندرہ دن گزر گیے اور حضرت جبریل نہ آئے۔

یہ بے حد نازک معاملہ تھا۔ یہودی علماء نے جن شخصیتوں کی بابت سوال کیا تھا وہ اس وقت عام لوگوں کے لیے سراسر نامعلوم شخصیتیں تھیں۔ ان کا ذکر صرف یہود کے بعض نوشتوں میں تھا۔ چونکہ اس وقت تک پریس کا دور نہیں آیا تھا، یہ نوشتے صرف بعض یہودی علماء کے پاس تھے۔ عام لوگوں کو ان کی مطلق کوئی خبر نہ تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی بابت اس وقت کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

مکہ کے مشرکین ہر روز آپ سے پوچھتے ۔ اور آپ سوال کا جواب نہ دے پاتے ۔ اس طرح مکہ کے مخالفین کو موقع مل گیا کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں اور لوگوں سے کہیں کہ یہ سچے پیغمبر نہیں ہیں ۔ اگر وہ سچے پیغمبر ہوتے تو یقیناً خدا انھیں بتا دیتا اور وہ سوال کا جواب دیدیتے ۔

بہ ظاہر یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو اسلام کے خلاف تھا ۔ یہ اسلام کی صداقت کو مشتبہ کر رہا تھا ۔ مگر یہاں بھی "عسر" کے اندر ایک "یسر" چھپا ہوا تھا ۔ وحی کا رکنا اور مخالفین کا اس کو استعمال کرکے پروپیگنڈا کرنا اپنے اندر ایک روشن پہلو رکھتا تھا ۔ اس طرح یہ ہوا کہ سارے مکہ میں اسلام ایک سوالیہ نشان بن گیا ۔ ہر گھر میں اس کا چرچا پہونچ گیا ۔ پوری آبادی کے اندر سننے کی فضا پیدا ہوگئی ۔

پندرہ دن وحی رکنے کے بعد حضرت جبریل سورہ الکہف لے کر آئے جس میں مذکورہ سوالات کا تفصیلی جواب تھا ۔ عام حالت میں یہ سورہ اترتی تو اس کا اترنا لوگوں کو زیادہ قابلِ توجہ واقعہ نظر نہ آتا مگر اب وہ اتری تو سارا مکہ اس کو سننے کے لیے کان لگائے ہوئے تھا ۔ چنانچہ اس کے اترتے ہی وہ سارے مکہ میں پھیل گئی ۔ ہر آدمی اس کو جاننے کے لیے دوڑ پڑا کہ دیکھیں "محمد" نے ان سوالات کا کیا جواب دیا ہے ـــــ جو چیز بظاہر اسلام کے غیر موافق تھی وہ اسلام کے موافق بن گئی ۔

ہجرت سے تبلیغ

مشرکین مکہ کی مخالفت کے باوجود اسلام برابر پھیل رہا تھا ۔ مشرکین کی ہر تدبیر اسلام کی مزید اشاعت کا سبب بن رہی تھی ۔ اس کو دیکھ کر مکہ کے مشرکین اور زیادہ سخت ہوگیے ۔ انھوں نے مسلمانوں کے اوپر اپنی سختیاں تیز تر کر دیں ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ کو چھوڑ کر باہر چلے جائیں (تفرقوا فی الارض فان اللہ سیجمعکم) لوگوں نے پوچھا کہ کہاں جائیں تو آپ نے فرمایا کہ حبش چلے جاؤ ۔

حبش افریقہ کی طرف عرب کا ایک پڑوسی ملک ہے ۔ دونوں کے درمیان بحر احمر حائل ہے ۔ اس سمندر کی چوڑائی یمن کے پاس بہت کم ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں یہیں سے لوگ کشتیوں کے ذریعہ عرب سے حبش کا اور حبش سے عرب کا سفر کیا کرتے تھے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کے بعد ۵ھ نبوی میں ایک درجن آدمی مکہ کو چھوڑ کر حبش چلے گیے ۔ جلد ہی بعد دوسرا زیادہ بڑا قافلہ مکہ کو چھوڑ کر حبش گیا ۔ ابن ہشام کے مطابق ان کی تعداد

۸۶ تھی۔ اس طرح مجموعی طور پر تقریباً ایک سو مسلمان افریقہ کے ملک حبش پہونچ گیے۔

بظاہر یہ واقعہ پسپائی کا واقعہ تھا۔ مگر خدا کے فضل سے اس کے اندر اقدام کا پہلو نکل آیا۔ یہ لوگ جو مکہ سے حبش گیے تھے یہ کوئی اسٹیچو نہ تھے بلکہ اسلام کے زندہ مبلغ تھے۔ ان کا حبش جانا قدرتی طور پر اسلام کے مبلغین کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم جانا بن گیا۔ ان کے حبش پہونچتے ہی سمندر پار کے اس ملک میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ ان کی دعوتی اور اخلاقی تاثیر سے حبش کے لوگوں میں اسلام پھیلنے لگا۔ حتی کہ جب اس کا چرچا بڑھا تو خود شاہ حبش نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا۔ جو حبش کے قدیم شہر اکسوم میں واقع تھا۔

اس وقت حضرت جعفر نے مسلمانانِ حبشہ کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ جو لوگ کسی مقصد کے لیے ستائے جائیں اور پھر بھی اس سے نہ پھریں خواہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینا پڑے، ایسے لوگوں کی آواز میں قدرتی طور پر سوز پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کے الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جعفر نے جب بھرے دربار میں تقریر کی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ حتیٰ کہ خود شاہ نجاشی رونے لگا۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ حضرت جعفر بظاہر ستائے گیے تھے۔ مگر اسی ستائے کے واقعہ نے آپ کے کلام میں وہ زور اور تاثیر پیدا کردی جس نے بادشاہ کو اور اس کے تمام درباریوں کو تڑپا دیا۔

ہجرت حبشہ سے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ اس طرح ایک بظاہر پسپائی کا واقعہ اقدام کا واقعہ بن گیا۔ اسلام کی دعوت ایشیا کے علاقہ سے نکل کر افریقہ کے علاقہ میں پہونچ گئی۔ اس کے بعد وہ افریقہ میں بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ افریقہ کا نصف سے زیادہ حصہ اسلام میں داخل ہوگیا۔ ایک مقامی دعوت عالمی دعوت میں تبدیل ہوگئی۔ اریٹریا کا علاقہ جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ وہ اسی ہجرت حبشہ کے بعد وجود میں آیا۔

خاتمہ میں نیا آغاز

عُسر میں یُسر کے اسی امکان کی ایک مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کا قصہ ابتداءً اسوء القصص معلوم ہوتا ہے۔ مگر قرآن کے الفاظ میں بالآخر وہ احسن القصص بن گیا۔ حضرت یوسف کے دشمنوں نے جہاں آپ کی تاریخ ختم کرنی چاہی تھی، وہیں آپ کے لیے ایک شاندار تر تاریخ

کے امکانات پیدا ہوگیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ نئے امکانات کیسے پیدا ہوئے۔ اس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ ملتا ہے: وقال ادخلوا مصر (یوسف ۹۹) وجاء بکم من البدو (یوسف ۱۰۰) اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضرت یوسف اور ان کے خاندان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص احسان یہ تھا کہ وہ ان کو دیہات سے نکال کر مصر جیسے متمدن ملک میں لایا اور وہاں کی راجدھانی میں ان کے قیام کے اسباب پیدا کیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام فلسطین کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ عام حالات میں وہ اسی گاؤں میں پڑے رہتے۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں گاؤں کے حالات میں اپنے ظہور کا راستہ نہ پاتیں۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ نوجوانی کی عمر میں آپ کے سوتیلے بھائیوں کو آپ سے ضد ہوگئی۔ ان کی ضد یہاں تک پہونچی کہ وہ ایک روز آپ کو دور جنگل میں لے گیے اور آپ کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔

بظاہر یہ ایک زبردست ناکامی کا واقعہ تھا۔ مگر اس ڈس ایڈوانٹج میں ان کے لیے ایک ایڈوانٹج نکل آیا۔ وہ ایک تجارتی قافلہ کے ہاتھ لگ گیے جو مصر کی راجدھانی کی طرف تجارت کے لیے جارہا تھا۔ آپ کی پرکشش شخصیت کو دیکھ کر ان تاجروں کو دلچسپی ہوئی۔ کیوں کہ انھیں امید ہوئی کہ وہ آپ کو مصر کے بازار میں فروخت کرکے کچھ رقم حاصل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت یوسف کو اپنے قافلہ میں شامل کرلیا اور ان کو لے جاکر مصر کی راجدھانی میں ایک سرکاری افسر کے ہاتھ فروخت کردیا۔

حضرت یوسف کا کنویں میں ڈالا جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اسی ناپسندیدہ واقعہ کے اندر سے یہ امکان نکل آیا کہ وہ معمولی دیہات سے نکل کر ترقی یافتہ شہر میں پہونچیں۔ اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے زیادہ وسیع میدان حاصل ہو۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اپنے گاؤں میں وہ صرف بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مگر مصر میں آخرکار وہ ملک کے اقتدار تک پہونچا دیے گیے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں اسوء القصص بھی احسن القصص بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی تقویٰ اور صبر کا ثبوت دے۔ تقویٰ آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے۔ اور صبر سے

آدمی کے اندر انتظار کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ سنجیدگی آدمی کو حقیقی اور درست رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے اور انتظار کی طاقت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بے فائدہ قسم کے عاجلانہ اقدام سے بچتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ محفوظ طور پر اپنی منزل تک پہونچ جائے۔

مثبت شعور کی ضرورت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ناموافق صورت حال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثنار نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں کہ آدمی کو صرف ناموافق حالات گھیرے ہوئے ہوں۔ اور کوئی موافق امکان اس کے لیے سرے سے موجود نہ ہو۔

مگر اس موافق پہلو کو پانے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے مثبت شعور کی ضرورت ہے۔ جب آدمی کسی ناموافق صورت حال میں گھر جائے تو عام طور پر وہ اس سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناموافق حالات بیشتر آدمیوں کو صرف ایک ہی تحفہ دیتے ہیں اور وہ ہے ردعمل میں مبتلا ہو جانا۔ جب آدمی ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو وہ اپنے حالات سے صرف مایوسی اور نفرت کی غذا لے گا۔ وہ اس سے کبھی مثبت فکر کی غذا نہیں لے سکتا۔

ناموافق حالات میں چھپے ہوئے موافق امکان کو جاننے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی قریبی حالات سے الگ ہو کر سوچ سکے۔ وہ اپنے آپ کو فکری اعتبار سے اس مقام پر لے جائے جہاں وہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

آدمی ہر تاریکی میں روشنی پا سکتا ہے۔ وہ ہر ناموافق صورت حال میں اپنے لیے ایک موافق پہلو ڈھونڈ سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت پسند بنائے۔ وہ جھنجھلاہٹ کی نفسیات سے دور رہے۔ وہ دشمن کو بھی غیر دشمن کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے آپ کو پڑھ سکے۔ اسی کا نام مثبت طرز فکر ہے اور اس دنیا میں بلاشبہ مثبت طرز فکر ہی کے اندر تمام کامیابیوں اور ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

اخلاق

اس وقت ہماری بات چیت کا موضوع اسلامی اخلاق ہے۔ اخلاق کو اسلام کا سب سے اونچا معیار بتایا گیا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّ مِنْ خِیَارِکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا (متفق علیہ بحوالہ ریاض الصالحین صفحہ ۱۸۵)

اسلامی اخلاق کی حقیقت تواضع ہے۔ اسلامی اخلاق تواضع والے انسان کے کردار کا دوسرا نام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الاَرْضِ هَوْنًا وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں) یعنی جو لوگ خدا کے واقعی بندے بن جائیں وہ جب زمین پر چلتے ہیں تو ان کا چلنا عجز کا چلنا ہوتا ہے۔ جو لوگ خدا کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا احساس کھو دیں وہ انسانوں کے درمیان بھی بڑے بن کر نہیں رہتے۔ خدا کی نسبت سے جس کیفیت کو خشوع کہا جاتا ہے وہی کیفیت جب بندوں کی نسبت سے ظاہر ہو تو اسی کو متواضع اخلاق کہتے ہیں۔ اور متواضع اخلاق ہی کا دوسرا نام اسلامی اخلاق ہے۔

حضرت عیاض بن حمار کی ایک روایت صحیح مسلم میں ان الفاظ میں آئی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰی لَا یَبْغِیَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ وَلَا یَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ	اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی کی کہ تم لوگ تواضع کا طریقہ اختیار کرو۔ یہاں تک کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فخر نہ کرے۔

خدا سے پانے کے لیے

اسلامی اخلاق کا نہایت گہرا تعلق خدا کی معرفت سے ہے۔ جب ایک شخص حقیقی معنوں میں خدا کو دریافت کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اس دنیا میں وہ آزاد نہیں ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ یہاں حالتِ امتحان میں ہے۔ خدا نے اس کو محدود مدت کے لیے یہاں رکھا ہے۔ اس کے بعد اس پر موت طاری کر کے وہ اس کو اپنے یہاں بلائے گا۔ اور اس کے عمل کے مطابق اس کو یا جنت کے باغوں میں بسائے گا یا جہنم کی آگ میں ڈال دے گا۔

جب آدمی پر زندگی کی یہ حقیقت کھلتی ہے تو اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ وہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے بچائے۔ وہ آخرت میں خدا کی رحمت اور معافی حاصل کر سکے۔ اس کا یہ مزاج اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے حد درجہ نرم اور مہربان بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو معاف کرتا ہے تاکہ خدا اس کو معاف کرے۔ وہ لوگوں کے ساتھ وسعتِ ظرف کا معاملہ کرتا ہے تاکہ خدا اس کے ساتھ وسعت اور رحمت کا معاملہ فرمائے۔

اس مومنانہ سلوک کو حدیث میں مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں چند حدیثیں نقل کرتے ہیں :

إِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ (الجامع الصغیر)	بے شک اللہ اپنے بندوں میں سے مہربان بندوں پر مہربانی کرتا ہے
اِسْمَحُوا يُسْمَحْ لَكُمْ (الجامع الصغیر)	تم لوگوں سے درگزر کرو، تمہارے ساتھ بھی درگزر کیا جائے گا۔
اِرْحَمْ مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكَ مَنْ فِي السَّمَاءِ (الجامع الصغیر)	تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تمہارے اوپر رحم کرے گا
مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ (متفق علیہ)	جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا

حضرت ابو ہریرہ سے ایک لمبی حدیث مروی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں :

مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ

(صحیح مسلم)

جو شخص ایک مومن کی دنیا کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ اس کی قیامت کی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت کو دور کرے گا۔ جو شخص ایک تنگدست کو آسانی دے گا تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کو آسانی دے گا۔ جو شخص ایک مسلم کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ اور اللہ بندہ کی مدد پر رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے بھائی کی مدد پر رہے۔

عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ

حضرت جریرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس شخص پر رحم نہ کرے گا جو لوگوں پر رحم نہ کرے۔ (متفق علیہ)

اعلیٰ ظرفی

ایک شخص نے ٹیکسی کرایہ پر لی۔ جب وہ سفر پورا کرکے اترا تو ٹیکسی والے نے پچاس روپیہ کرایہ بتایا۔ اب اگر مسافر کی جیب میں صرف پچاس روپے ہوں تو وہ ٹیکسی والے سے جھگڑا کرے گا۔ کیونکہ وہ ڈرے گا کہ اس کو دے کر میں خالی ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ وہ ٹیکسی والے سے کہے گا کہ تم نے کرایہ زیادہ بتایا ہے۔ مگر جس شخص کے بیگ میں پچاس ہزار روپیہ کے نوٹوں کے بنڈل بھرے ہوئے ہوں وہ کبھی پچاس روپیہ کے لیے جھگڑا نہیں کر سکتا۔ وہ فوراً ٹیکسی والے کو اس کا کرایہ ادا کرکے آگے بڑھ جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو شخص بڑی چیز پائے ہوئے ہو وہ کبھی چھوٹی چیز کے لیے جھگڑا نہیں کرتا۔ کم ظرفی چھوٹی یافت کا نتیجہ ہے اور عالی ظرفی بڑی یافت کا نتیجہ۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ وہ تمام خوبیوں اور کمالات کا خزانہ ہے۔ جو شخص

خدا کو پاتا ہے وہ گویا سب سے بڑی چیز کو پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دل سب سے بڑا دل بن جاتا ہے۔ اس کے اندر کھونے کو برداشت کرنے کی اتھاہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر یہ مزاج آجاتا ہے کہ وہ اونچی سطح سے لوگوں کے ساتھ معاملہ کر سکے۔ اس کے اندر سے تنگ ظرفی کا مزاج ختم ہو جاتا ہے۔ لوگ اس کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کو اعلیٰ ظرف پاتے ہیں۔ وہ کردار اور اخلاق کے اعتبار سے ایک اونچا انسان بن جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم) یقیناً تم اعلیٰ اخلاق پر ہو۔ اعلیٰ اخلاق جوابی اخلاق نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اصول کی بنیاد پر بنتا ہے۔ آدمی دوسروں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے یہ دیکھ کر نہیں کرتا کہ دوسرے لوگ اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں بلکہ یہ سوچ کر کرتا ہے کہ بہ اعتبار اصول اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔ لوگوں کے درمیان اس کا سلوک لوگوں کی روش کے تابع نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے معیار اخلاق کے تابع ہوتا ہے۔

یہی بات ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ اَسَاؤُا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاؤُا فَلَا تَظْلِمُوْا (مشکوٰۃ، باب الظلم)

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو، اِمَّعَہ نہ بنو۔ تم یہ کہنے لگو کہ اگر لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور اگر لوگ برا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی برا برتاؤ کریں گے۔ بلکہ تم اپنے آپ کو تیار کرو کہ اگر لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی ہم ان سے اچھا سلوک کریں گے اور اگر وہ بُرا سلوک کریں تو ہم خود ان کے ساتھ برائی نہیں کریں گے۔

اسی بات کو ایک اور حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلَا اُخْبِرُكَ

حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو دنیا اور آخرت کے

بِاَفْضَلِ اَخْـلَاقِ اَهْلِ الدُّنیاوَالْاٰخِـرَةِ قَالَ نَعَمْ ۔ قَالَ تَصِلُ مَنْ قَطَعَكَ وَ تُعْطِی مَـنْ حَـرَمَكَ وَتَعْفُوا عَمَّـنْ ظَلَـمَكَ (البیهقی)

لوگوں کا بہترین اخلاق نہ بتا دوں ۔ کہا کہ ہاں ۔ فرمایا کہ جو تم سے کٹے تم اس سے جڑو ۔ جو تم کو محروم کرے تم اسے دو ۔ اور جو شخص تم پر ظلم کرے اس کو تم معاف کر دو ۔

اسی لیے مذکورہ آیت (اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ) کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد خدا کے اُس حکم پر قائم ہونا ہے جو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں آیا ہے: عفو و درگذر کا طریقہ اختیار کرو اور معروف کی تلقین کرو اور جاہلوں سے اعراض کرو (قیل هو ما امره الله تعالیٰ به فی قوله: خذ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاهلین، تفسیر نسفی جلد ۳، صفحہ ۲۷۹)

یعنی جہاں لوگ دوسروں سے بدلہ لیتے ہیں وہاں تم دوسروں کو معاف کر دو ۔ جہاں لوگ دوسروں کے درمیان برائی پھیلاتے ہیں وہاں تم نیکی پھیلاؤ ۔ جہاں لوگ دوسروں سے الجھ جاتے ہیں وہاں تم نظر انداز کر کے گزر جاؤ ۔

اخلاق کی دو قسمیں

اسلامی نقطہ نظر سے اخلاق کی دو قسمیں ہیں ۔ پست اخلاق اور اعلیٰ اخلاق ۔ پست اخلاق کا کوئی مستقل اصول نہیں ہوتا جس کا ہمیشہ لحاظ کیا جائے ۔ وہ حالات کے لحاظ سے بنتا ہے اسی لیے وہ کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ ۔ جس موقع پر جس قسم کے جذبات آدمی کے اندر ابھرے وہی اخلاق اور کردار کی صورت میں ڈھل گیے ۔

کسی کو اپنے سے کم دیکھا تو اس کو حقیر سمجھ لیا اور کسی کو اپنے سے زیادہ پایا تو اس کے خلاف حسد کرنے لگے ۔ کسی سے فائدہ نظر آیا تو اس کے دوست بن گیے اور کسی کو دیکھا کہ اس سے اپنا کوئی فائدہ وابستہ نہیں ہے تو اس سے بے رُخی اختیار کر لی ۔ کسی نے اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے اچھے بن گیے ۔ اور کسی نے برا سلوک کیا تو اس کے ساتھ برائی کرنا شروع کر دیا ۔ اتفاق سے کوئی بڑی حیثیت حاصل ہو گئی تو گھمنڈ میں مبتلا ہو گیے اور اگر کوئی بڑی حیثیت نہیں ملی تو مایوسی کا شکار ہو گیے ۔ کسی سے خوش ہو گیے تو اس کے ساتھ فیاضی کرنے لگے اور اگر کسی

سے ناخوش ہوے تو اس کے لیے اپنے دروازے بند کرلیے۔ کسی کو اپنے موافق پایا تو اس کی تعریف کرنے لگے اور اگر کسی سے ناموافقت ہوگئی تو سمجھ لیا کہ اس سے زیادہ برا کوئی آدمی نہیں۔

یہ سب پست اخلاق کے طریقے ہیں۔ اور مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پست طریقے سے بچے اور اعلیٰ اخلاقی طریقے اختیار کرے۔

اخلاق کی بلندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اعلیٰ اخلاق پر قائم تھے اور آپ کا یہی مشن تھا کہ لوگوں کو اعلیٰ اخلاق اختیار کرنے کی تلقین کریں۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ	حضرت امام مالکؒ کہتے ہیں کہ انھیں یہ بات پہونچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ حُسن اخلاق کی تکمیل کردوں

(موطا الامام مالک)

یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے۔ کسی میں حسن الاخلاق کا لفظ ہے، کسی میں صالح الاخلاق اور کسی میں مکارم الاخلاق کا۔ وہ مکارم اخلاق کیا ہیں جن کی دعوت اور اقامت کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے گیے۔ اس کی وضاحت دوسری روایت سے ہوتی ہے:

ثَلَاثَةٌ مِنْ مَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَكَ وَتُعْطِيَ مَنْ حَرَمَكَ وَتَصِلَ مَنْ قَطَعَكَ	تین چیزیں اللہ کے نزدیک اعلیٰ اخلاق سے ہیں۔ یہ کہ جو شخص تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کردو۔ اور جو شخص تم کو محروم کرے تم اس کو دو۔ اور جو شخص تم سے کٹے تم اس سے جُڑو۔

(الجامع الصغیر، للسیوطی)

گویا اعلیٰ اخلاق وہ ہے جس میں آدمی فریق ثانی کی روش سے بلند ہوکر اس سے معاملہ کرے۔ وہ فریق ثانی کے رویہ سے متاثر ہوئے بغیر اس سے اچھی طرح پیش آئے۔ اس کا اخلاق مثبت اخلاق ہو نہ کہ جوابی اخلاق۔

قابل اعتماد اخلاق

ایک انجینئر جب لوہے کا پُل بناتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ لوہا اُس بوجھ کو بھرپور طور پر سنبھالے گا جس کو سنبھالنے کے لیے پُل بنایا گیا ہے۔ انجینئر کو اگر لوہے کی اس خصوصیت پر یقین نہ ہو تو وہ کبھی لوہے کا پُل بنانے کی ہمت نہ کرے۔ اسی طرح تمام مادی چیزوں میں کچھ متعین خواص (Properties) ہیں۔ یہ خواص اتنے یقینی ہیں کہ نہایت صحت کے ساتھ ان کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ مادے کے خواص کی اسی قطعیت کی بنا پر تمدن کا سارا نظام چل رہا ہے۔ اگر مادی چیزیں اپنے خواص کو کھو دیں تو انسانی تمدن کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

مادہ کے لیے خواص کی جو حیثیت ہے وہی حیثیت انسانی زندگی کے لیے اخلاق کی ہے۔ اخلاق کی مضبوطی ہی وہ واحد چیز ہے جس پر سماجی زندگی کا نظام کھڑا ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کے اندر اخلاقی مضبوطی باقی نہ رہے تو کبھی انسانی زندگی کی ٹھوس تعمیر ممکن نہ ہو۔

بہتر سماجی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد قابلِ پیشین گوئی کردار کے حامل ہوں۔ ایک شخص سے معاملہ کرتے ہوئے یہ یقین کیا جاسکے کہ وہ جو کہے گا اس کو وہ ضرور پورا کرے گا۔ ایک شخص کے سامنے ایک ثابت شدہ حق کو پیش کیا جائے تو ہمیں اس پوزیشن میں ہونا چاہیے کہ ہم پیشگی طور پر یہ یقین کرسکیں کہ وہ اس کو ضرور قبول کرے گا۔ ایک شخص سے شکایت اور اختلاف ہو جائے تو یہ فضا ہونی چاہیے کہ ہم یہ یقینی اندازہ کرسکیں کہ وہ انصاف سے ہٹ کر کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ ایسے سماج کا انسان گویا لوہا انسان (لوہ پرش) ہے۔ وہ حدیدی کردار کا حامل ہے۔ اس سے از روئے حق جو امید کی جاتی ہے وہ اس میں پورا اترتا ہے۔ جس سماج کے افراد ایسے ہوں اس سماج کی ترقی کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

جس سماج کی حالت اس کے خلاف ہو جائے وہ ایک برباد سماج ہے۔ جہاں افراد کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے وعدوں پر پورے نہ اتریں۔ ان کے سامنے حق آئے مگر وہ اس کو قبول نہ کریں ان کو کسی سے شکایت ہو جائے تو وہ اس کے خلاف ہر کارروائی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ انصاف اور انسانیت کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جس سماج کی اخلاقی حالت ایسی ہو جائے وہ اُس دنیا کی مانند ہے جہاں لوہے نے اپنا لوہا پن کھو دیا، جہاں پتھر پتھر نہ رہا، بلکہ وہ دیمک زدہ لکڑی کی طرح بے جان ہو گیا۔

قدرت کے باوجود

سب سے زیادہ سخت امتحان آدمی کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے مخالف پر قابو پا جائے ۔ جب اس کا دشمن پوری طرح اس کی گرفت میں آچکا ہو ۔ ایسے مواقع پر آدمی اپنی ساری طاقت استعمال کرکے اپنے مخالف کو پیس ڈالتا ہے ۔ ایسے دشمن کے معاملہ میں آدمی اپنی کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں سمجھتا جو پوری طرح اس کے قبضہ میں آچکا ہو ۔

مگر اللہ سے ڈرنے والے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس وقت بھی خدا اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ خدا کی طاقت کا احساس اس کے ذہن پر اس طرح چھا تا ہے کہ انسان کی کمزوری اسے بھول جاتی ہے ۔ وہ اپنے دشمن کو معاف کر دیتا ہے ۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہی وہ موقع ہے جب کہ وہ اپنے دشمن کو معاف کرکے اپنے آپ کو عبدیت کے بلند ترین مرتبہ پر پہونچا سکتا ہے حدیث کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

عَن ابی هُرَیرۃَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلی اللّٰہ عَلیہِ وَسلَّمَ قَالَ مُوسَیٰ بْنُ عِمرَانَ عَلیہِ السَّلَام یَارَبِّ مَنْ اَعَزُّ عِبَادِکَ عِندَکَ ۔ قَالَ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ (البیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالے سے کہا کہ اے میرے رب ، تیرے بندوں میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ معزز بندہ کون ہے ۔ اللہ نے فرمایا : وہ شخص جو قدرت پانے کے بعد معاف کر دے ۔

غصّہ نہیں

جو چیز اخلاق کی سب سے بڑی قاتل ہے وہ غصّہ ہے ۔ عام حالات میں اکثر لوگ صحیح رہتے ہیں ۔ مگر جب ایک آدمی کو کسی بات پر غصہ آجائے تو اس کے بعد وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے ۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ کوئی اخلاقی اصول ہے جس کو اسے ہر حال میں برتنا چاہیے ۔

اس دنیا میں صرف ایک ہی چیز ہے جو غصّہ اور اشتعال کی حالت میں آدمی کو حد کے اندر رکھ سکتی ہے ۔ اور وہ خدا کا خوف ہے ۔ اگر آدمی کے دل میں واقعۃً خدا کی عظمت بیٹھ جائے اور وہ جان لے کہ خدا اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا تو یہ احساس اس کے اوپر ایک

قسم کی لگام لگا دیتا ہے۔ خدا کا ڈر اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک حد سے آگے نہ جانے دے۔ اسی لیے قرآن میں خدا کے مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے :

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوریٰ)	جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں

خدا سے ڈرنے والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں جب انسانوں کی طرف سے غصہ آتا ہے تو خدا کا تصور سامنے آکر ان کے غصہ کو دبا دیتا ہے۔ وہ انسان کے رویہ سے مشتعل ہوتے ہیں مگر خدا کی پکڑ کا اندیشہ انھیں ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ غصہ کے سلسلے میں چند حدیثیں یہ ہیں :

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصِنِیْ قَالَ لَا تَغْضَبْ۔ فَرَدَّ ذٰلِكَ مِرَارًا قَالَ لَا تَغْضَبْ (صحیح بخاری)	حضرت ابوهریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھے نصیحت کیجئے۔ آپ نے فرمایا غصہ نہ کر۔ آدمی نے بار بار پوچھا۔ آپ نے ہر بار فرمایا کہ غصہ نہ کر۔
عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ۔ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ مَنْ يَّمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ (صحیح مسلم)	حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو حریف کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔
اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ (الجامع الصغیر)	جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ چپ ہو جائے۔

غصہ دراصل ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ ان آیتوں اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا طریقہ ردعمل کا طریقہ نہیں ہوتا۔ مومن کو کسی کے خلاف غصہ آتا ہے تو اس کے جواب میں وہ اس کو معافی لوٹاتا ہے۔ وہ منفی نفسیات سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتا ہے۔ وہ غصہ اور تلخی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اندر ہی اندر اس کو پی جاتا ہے۔ مومن اس دنیا میں پھول کی طرح رہتا ہے۔ اس کو برا کہیں تب بھی وہ برا کہنے والے کو خوشبو دے گا۔ اس کو پتھر ماریں تب بھی اس کا سکون بھنگ نہیں ہوگا۔

غلطی ہو جانے کے بعد

انسان خواہ کتنا ہی اچھا ہو، دوسروں کے درمیان رہتے ہوئے بار بار اس سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ بار بار لوگوں کے حقوق کے ادا کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع کے لیے یہ اخلاق بتایا گیا ہے کہ جب کوئی بُرائی ہو جائے تو فوراً بھلائی کرو۔ اس سے تمہاری برائی کا اثر دھل کر ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے :

اِتَّقِ اللّٰہَ حَیْثُمَا کُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (الجامع الصغیر)	تم جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جب برائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرلو، وہ اس کو مٹا دے گی۔ اور لوگوں کے درمیان اچھے اخلاق کے ساتھ رہو۔

برائی کے بعد اچھائی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً جس کے ساتھ برائی ہوئی ہے اس سے معافی مانگنا۔ اس کے حق میں خدا سے اچھی دعائیں کرنا۔ اس کو ہدیہ دینا۔ اس کا ذکر لوگوں کے درمیان اچھے الفاظ سے کرنا۔ مختلف مواقع پر اس کی خیر خواہی کرنا۔ وغیرہ

جنّت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جنّت میں کوئی لغو بات یا گناہ کی بات نہ سنائی دے گی (واقعہ ۲۶) معلوم ہوا کہ جنّت کا ماحول اعلیٰ اخلاق کا ماحول ہوگا۔ وہاں جھوٹ، تہمت، غیبت، بے ہودگی، گالی، طنز و تمسخر اور فضول باتیں نہیں ہوں گی۔ وہاں ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے سلامتی اور خیر خواہی کے جذبات ہوں گے۔ وہاں ہر ایک وہی بولے گا جو اسے بولنا چاہیے اور وہ نہیں بولے گا جو اسے نہیں بولنا چاہیے۔ جنّت بد اخلاق لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی۔ جنّت شریف انسانوں کا معاشرہ ہوگا۔

دنیا میں اچھے اخلاق والا بننا دراصل اسی جنّتی سماج کا امیدوار بننا ہے۔ جو شخص دنیا میں جنّتی اخلاق کا ثبوت دے وہی آئندہ جنّت کے ماحول میں بسایا جائے گا۔ باقی تمام لوگ رد کر کے جہنّم کے کوڑا خانہ میں ڈال دیے جائیں گے تاکہ ہمیشہ کے لیے اپنی بدکرداری کی سزا بھگتتے رہیں۔

حصّہ دوم

اخلاق ایک طاقت ہے۔ بلکہ اخلاق سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایک اچھا سلوک دشمن کو دوست بنا سکتا ہے۔ ایک میٹھا بول ایک سرکش آدمی سے اس کی سرکشی چھین سکتا ہے۔ ایک ہمدردانہ برتاؤ ایک ایسے جھگڑے کو ختم کر سکتا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے لاٹھی اور گولی کی طاقت ناکام ہو چکی تھی۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے :

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔ اِدْفَعْ	اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم جواب
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ	میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے
بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ	کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا
(حٰم السجدہ)	ہے جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

اسلام میں تالیف قلب کا اصول بھی اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن میں زکوٰۃ کی رقم کی کئی مدیں بتائی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک خاص مد تالیف قلب (التوبہ) کی ہے۔ اس مد کے تحت ان لوگوں کی مالی اعانت کی جاتی ہے جن کے دل کو اسلام کے لیے نرم کرنا مطلوب ہو۔ اس اصول کے تحت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب کے متعدد سرکش سرداروں کو رقمیں دیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد وہ لوگ بالکل ٹھنڈے پڑ گیے۔ اسلام کی یہ تعلیم اس بات کی ایک کھلی ہوئی تصدیق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاق کے اندر زبردست تسخیری طاقت رکھی ہے۔

اخلاق ایک طاقت ہے، اس کی مثالوں سے انسانی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ جس شخص یا قوم نے بھی اس دنیا میں کوئی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی گہرائی میں جاکر دیکھیں تو اس کے پیچھے اخلاق کی طاقت کام کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں ہم اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں پیش کریں گے۔

دشمن دوست بن گیا

انھیں میں سے ایک مثال صفوان بن امیہ بن خلف کی ہے۔ وہ قریش کے بڑے سرداروں

میں سے تھے ۔ ان کا خاندان مکہ کا ایک ممتاز خاندان تھا ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ خاندان آپ کا زبردست مخالف ہو گیا ۔ صفوان کے والد امیہ بن خلف جنگ بدر میں آپ کے مخالف لشکر میں شامل تھے ۔ وہ آپ کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گیے ۔

جب مکہ فتح ہوا تو صفوان بن امیہ مکہ سے باہر نکل گیے اور بھاگ کر جدہ پہونچ گیے ۔ ان کے چچازاد بھائی عُمیر بن وہب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کے لیے امان کی درخواست کی ۔ آپ نے ان کو امان دیدی ۔ مزید یہ کہ آپ نے اپنی چادر بھی ان کو علامتِ امان کے طور پر عطا فرمائی ۔ عمیر بن وہب جدہ گیے اور صفوان کو چادر دی اور امان کی خبر بتائی ۔ صفوان ان کے ساتھ مکہ واپس آئے ۔

صفوان بن امیہ مکہ واپس آگیے مگر ابھی انھوں نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا ۔ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ مجھ کو سوچنے کے لیے دو مہینے کی مہلت دیجیے ۔ آپ نے فرمایا کہ تم کو چار مہینے کی مہلت ہے ۔ اس کے جلد ہی بعد ہوازن کی جنگ میں کافی مال غنیمت ملا ۔ آپ نے اس میں سے صفوان کو ایک سو اونٹ دیے ۔ اس کے بعد بھی آپ ان پر اخلاقی مہربانی کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا ۔ صفوان بن امیہ خود اپنے بارہ میں کہتے ہیں :

لَقَدْ اَعْطَانِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطیہ دیا جب
وَاِنَّہٗ لَاَبْغَضُ النَّاسِ اِلَیَّ فَمَا زَالَ	کہ وہ میرے لیے سب سے زیادہ مبغوض شخص تھے
یُعْطِیْنِیْ حَتّٰی اِنَّہٗ لَاَحَبُّ النَّاسِ	مگر وہ مجھے دیتے رہے ۔ یہاں تک کہ وہ میرے لیے
اِلَیَّ (تفسیر طبری)	سب سے زیادہ محبوب شخص بن گیے ۔

اس مثال میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ صرف اخلاق نے ایک کٹّر دشمن کو قریبی دوست بنادیا ۔ ایک شخص جس کو مادی طاقت نہیں جھکا سکی تھی اس کو اخلاقی طاقت نے جھکا دیا ۔

قلعہ کے دروازے کھل گیے

مکہ ۸ھ میں فتح ہوا ۔ اس کے بعد دو بڑی بستیوں کا مسئلہ باقی تھا ۔ ایک حنین ، اور دوسرے طائف ۔ ان دونوں بستیوں میں ہوازن اور ثقیف نامی قبیلے آباد تھے جو ایک دوسرے کے حلیف تھے ۔ حنین والوں کو اپنی جنگی قابلیت پر بہت ناز تھا ۔ چنانچہ انھوں نے مکہ کی فتح کے

باوجود اطاعت نہیں کی۔ ان کا سردار مالک بن عوف ۲۰ ہزار آدمیوں کی جمعیت لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا تاکہ آپ کے اوپر حملہ کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ بھی ۱۲ ہزار آدمیوں کو لے کر اس کی طرف بڑھے حنین کی وادی میں مقابلہ ہوا۔ ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ مگر مسلمان دوبارہ جم گیے۔ اور انھوں نے ہوازن کو فیصلہ کن شکست دی۔ ان کے ۶ ہزار آدمی گرفتار کر لیے گیے۔

اس شکست کے بعد ہوازن کا سردار مالک بن عوف اور اس کے ساتھی بھاگ کر طائف میں قلعہ بند ہو گیے تھے۔ اس لیے آپ نے اموال غنیمت کو جِعرانہ کے مقام پر رکھا اور پھر وہاں سے روانہ ہو کر طائف پہونچے۔ مگر طائف والوں نے زبردست سرکشی دکھائی۔ طائف عرب کا واحد قلعہ بند شہر تھا۔ ان کے تیر انداز قلعہ کی فصیل پر بیٹھ گیے اور مسلمانوں کو اپنے تیروں کے نشانہ پر لینا شروع کیا۔ اس میں بارہ مسلمان شہید ہو گیے۔ حضرت خالد بن ولید نے پکار کر کہا کہ نیچے اترو اور دست بدست مقابلہ کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو قلعہ سے اُترنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس کئی سال کی ضرورت کا غلّہ موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائے گا تو ہم تلواریں لے کر اُتریں گے۔

طائف کی جنگ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود بھی شریک تھے۔ یہی نہیں بلکہ عملاً بھی آپ نے اس میں حصہ لیا۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے طفیل بن عمر الدوسی کی قیادت میں ایک وفد شام کے علاقہ میں بھیجا تھا جہاں اس وقت کے اعلیٰ جنگی ہتھیار تیار ہوتے تھے۔ وہ لوگ وہاں سے ایک دبابہ اور ایک منجنیق لے آئے۔ ان لوگوں کی واپسی میں کسی قدر تاخیر ہوئی۔ چنانچہ وہ لوگ طائف کے محاصرہ کے چار روز بعد طائف پہونچے (زرقانی، جلد ۳)

اس سلسلہ میں ابن ہشام کی ایک روایت ابن کثیر نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

حَدَّثنی مَن اَثق بہ اَن النَّبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسلم اَوَّلُ مَنْ رمٰی فِی الْاِسلَام بِالْمَنْجَنِیقِ رمٰی بہ اَھلَ الطَّائِف (جلد ۳، صفحہ ۶۵۸)

مجھ سے بیان کیا جس پر میں اعتماد کرتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص ہیں جس نے اسلام میں منجنیق سے گولہ پھینکا۔ آپ نے منجنیق سے طائف والوں پر گولہ پھینکا۔

مگر طائف کے لوگ اتنے سرکش تھے کہ پھر بھی وہ قبضہ میں نہیں آئے۔ انھوں نے فصیل کے اوپر سے لوہے کی گرم سلاخیں پھینکنا شروع کیا جس کی وجہ سے متعدد مسلمان ہلاک ہوگیے۔ آپ اٹھارہ دن تک طائف کا محاصرہ کیے رہے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ حضرت عمر فاروق نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ طائف والوں کے لیے بد دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ نے ہاتھ اٹھایا اور فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ ثَقِیفاً وَائتِ بِھِمْ اے اللہ، قبیلہ ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس لے آ۔

کسی شخص کے حق میں دعا کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ اس کے حق میں خیر خواہی کا آخری عمل ہے۔ جب آدمی کسی کا اتنا زیادہ خیر خواہ ہوجائے کہ اس کی ہدایت اور نجات کے لیے خدا سے دعا کرنے لگے اسی وقت اس کو وہ اعلیٰ اخلاقی تدبیریں سوجھتی ہیں جن کے اندر تسخیری صلاحیت ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنے فریق کے لیے بد دعا کریں، جن کا سینہ ان کی نفرت اور بدخواہی سے بھرا ہوا ہو وہ لوگ نفسیاتی پیچیدگی سے آزاد نہیں ہوتے، اس لیے وہ نہ اعلیٰ اخلاقی تدبیریں سوچ سکتے اور نہ اس پر عمل کرسکتے۔

آخر کار صحابہ نے رائے دی کہ بظاہر موجودہ حالت میں طائف کی تسخیر مشکل ہے اس لیے واپس چلنا چاہیے۔ مگر یہ مشکل صرف تلوار کی راہ میں تھی۔ اخلاق کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہ تھی۔ چنانچہ آپ نے تلوار میان میں کرلی اور اخلاق کی طاقت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

آپ طائف سے واپس ہوکر جعرانہ پہونچے جہاں قبیلہ ہوازن کے لوگ ۶ ہزار کی تعداد میں قیدی بنے ہوئے تھے۔ آپ نے نہایت حکیمانہ انداز میں تمام کے تمام ۶ ہزار قیدیوں کو آزاد کردیا۔ اور اسی کے ساتھ ان کو اپنے وطن واپس جانے کے لیے سواری اور زاد راہ بھی دیا اور مزید انعامات سے نوازا۔

یہ سلوک قدیم زمانہ کے آداب جنگ کے سراسر خلاف تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ قدیم رواج کے مطابق یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ سب کے سب غلام بنائے جائیں گے یا قتل کیے جائیں گے۔ ناممکن تھا کہ اتنا بڑا اخلاقی سلوک انھیں متاثر نہ کرے۔ چنانچہ اس نے متاثر کیا اور وہ سب

کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگیے۔

ہوازن کی جنگ میں زبردست مالِ غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ روایات کے مطابق اس کی مقدار ۲۴ ہزار اونٹ، ۴۰ ہزار بکریاں، ۴ ہزار اوقیہ چاندی اور دوسرے سامان تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مزید یہ کیا کہ ان کثیر اموال میں سے نہ تو خود کچھ لیا اور نہ انھیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کیا۔ بلکہ ان کو نہایت فیاضانہ طور پر مکہ کے غیر مسلموں اور مشترک سرداروں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یہ اخلاقی سلوک بھی قدیم رواج کے اعتبار سے انتہائی غیر معمولی تھا۔ اس لیے ناممکن تھا کہ اس کا اثر نہ ہو۔ چنانچہ اس کا زبردست اثر ہوا اور بہت بڑی تعداد میں لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوگیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے ذریعہ ان کے دلوں کو جیت لیا۔ ہاری ہوئی قوم کے ساتھ بُرا سلوک کیا جائے تو وہ دوبارہ تخریبی سرگرمیوں کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہاری ہوئی قوم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو وہ فاتح قوم کی وفادار بن کر اس کی طاقت میں اضافہ کرتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو اخلاقی تدبیر کی اس کا اثر براہِ راست طور پر طائف کے لوگوں پر پڑا۔ اس کے ذریعہ آپ نے طائف کے لوگوں کو ان کے حلیف (ہوازن) اور دوسرے قبائل سے کاٹ دیا تھا۔ طائف کے لوگ اب عرب میں اکیلے رہ گیے۔ یہ خبر جب طائف کے قلعہ بند شہر میں پہونچی تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی سرکشی عرب میں بے زمین ہوکر رہ گئی ہے۔ چنانچہ رمضان ۹ھ میں ان کے وفد نے مدینہ حاضر ہوکر اطاعت قبول کر لی۔ ابن ہشام نے اس موقع پر محمد بن اسحاق کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

ثُمَّ اَقَامَتْ ثَقِيْفُ بَعْدَ قَتْلِ عُرْوَةَ
اَشْهُرًا۔ ثُمَّ اِنَّهُمْ اِئْتَمَرُوْا بَيْنَهُمْ
وَرَأَوْا اَنَّهُ لَاطَاقَةَ لَهُمْ بِحَرْبِ
مَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْعَرَبِ وَقَدْ بَايَعُوْا
وَاَسْلَمُوْا

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۹۵)

عروہ بن مسعود کے قتل کے بعد قبیلہ ثقیف کے لوگ چند مہینے ٹھہرے۔ پھر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور محسوس کیا کہ اپنے گرد عرب کے تمام قبائل سے جنگ کی ان کے اندر طاقت نہیں ہے جب کہ انھوں نے رسول اللہ پر بیعت کر لی ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے۔

اس مثال میں مادی طاقت کے استعمال کے باوجود قلعے کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ مگر اخلاق نے یہ کرشمہ دکھایا کہ قلعے کے بند دروازے دوبارہ زیادہ وسعت کے ساتھ کھل گئے۔ اخلاقی طاقت کے لیے کوئی دیوار روک نہیں بن سکتی۔ اخلاق کا اثر وہاں تک پہونچ جاتا ہے جہاں کسی مادی طاقت کا اثر نہیں پہونچ سکتا۔ مادی طاقت اگر پتھر کی مانند کام کرتی ہے تو اخلاقی طاقت ہوا کی مانند۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہوا کے نفوذ کے لیے اس دنیا میں کوئی روک روک نہیں۔

تخریبی سرگرمیاں ختم

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی۔ آپ کی دعوت سراسر پُرامن تھی۔ مگر وہاں کے لوگ آپ کے سخت دشمن ہوگیے۔ انھوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں دیں۔ حتیٰ کہ آپ کے قتل پر آمادہ ہوگیے۔ آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے تب بھی وہ خاموش نہ ہوئے اور آپ کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ مکہ کے لوگ اپنی انھیں مخالفانہ سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ مکہ فتح ہوگیا۔

اس وقت آپ نے کیا کیا۔ آپ نے سب کو بلا شرط معاف کر دیا۔ سیرت کی روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے۔ آپ نے لوگوں کے سامنے ایک مفصل تقریر کی۔ اس سلسلہ میں روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامعشر قریش ما ترون انی فاعل بکم قالوا خیرا، اخٌ کریم وابن اخٍ کریم۔ قال فانی اقول لکم کما قال یوسف لاخوتہ لاتثریب علیکم الیوم اذھبوافانتم الطلقاء (زادالمعاد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے قریش کے لوگو، تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں۔ آپ نے کہا، میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

رسول اللہ صلی للہ علیہ وسلم کا یہ اخلاقی معاملہ لوگوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

چنانچہ اس نے نہایت گہرائی کے ساتھ لوگوں کو متاثر کیا۔ لوگ کثرت سے اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھی بننے لگے۔ یہاں تک کہ سارے لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیے۔ اگر آپ فتح کے بعد اپنے دشمنوں پر سختی کا سلسلہ شروع کر دیتے تو وہ لوگ اسلام کے خلاف دوبارہ تخریبی سرگرمیوں میں مشغول ہو جاتے۔ وہ سازشوں کا جال بچھاتے۔ وہ خفیہ تحریکیں چلا کر اسلام کی راہ میں ایسی مشکلات پیدا کرتے کہ اہل اسلام کی ساری طاقت ان سے مدافعت میں خرچ ہونے لگتی اور اصل تعمیری کام ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔

کھونے کے بعد پالیا

سمرقند وسط ایشیا کا نہایت قدیم شہر ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں وہ عربوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد وہ مختلف انقلابات کا شکار رہا۔ اب ۱۹۲۴ سے وہ اشتراکی روس کے قبضہ میں ہے۔

پہلی بار حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ میں خراسان کے مسلم گورنر نے اس پر چڑھائی کی تھی یہاں کے رئیسوں نے سات لاکھ درہم سالانہ کے عوض ان سے امان حاصل کر لی۔ اُس وقت یہاں بدھ مت کو ماننے والوں کی آبادی تھی۔ اس کے بعد مسلم فوج واپس چلی گئی اور مقامی رئیس نے زر امان کے عوض اپنی ریاست سمرقند میں باقی رکھی۔

ولید بن عبد الملک اموی نے ۸۶ھ میں خلافت کا عہدہ سنبھالا۔ اس کے زمانہ میں قتیبہ بن مسلم الباہلی کو خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ سمرقند اور دریائے جیحون کے اُس پار کے دوسرے علاقے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ چنانچہ قتیبہ کو یہ کام سپرد ہوا کہ وہ ان علاقوں پر چڑھائی کر کے انھیں مسخر کریں اور ان سے زر امان کے معاہدے ختم کر کے انھیں براہ راست خلافت کی ماتحتی میں لے آئیں۔

سمرقند کے سرداروں کو قتیبہ کی فوج کشی کی خبر ہوئی تو انھوں نے بھی اپنی فوجیں جمع کیں۔ دونوں میں زبردست مقابلہ ہوا۔ آخر کار قتیبہ کو فتح ہوئی۔ سمرقند کی بقیہ فوج شہر پناہ کے اندر داخل ہو گئی اور اس کے دروازے بند کر لیے۔ قتیبہ نے منجنیق کے ذریعہ شہر کے کنارے بنی ہوئی دیواروں پر پتھر کے گولے مارنے شروع کیے۔ اس کے نتیجہ میں دیوار میں اتنا بڑا شگاف

ہوگیا کہ قتیبہ کی فوج اس راستہ سے اندر داخل ہو جائے۔

سمرقند کے سردار اس صورت حال سے گھبرا گیے۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر قتیبہ کی فوج اندر آگئی تو زیادہ بڑا نقصان کرے گی۔ چنانچہ انھوں نے صلح کی بات چیت شروع کی۔ یہ بات چیت کئی دن تک جاری رہی۔ آخر کار صلح کی دفعات طے ہو گئیں۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ سمرقند کے لوگ بارہ لاکھ درہم سالانہ باقاعدگی کے ساتھ ادا کریں گے۔ شہر میں ایک مسجد بنائی جائے گی۔ قتیبہ مع اپنے فوجیوں کے اس مسجد میں نماز ادا کریں گے اور پھر شہر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔

حسب معاہدہ قتیبہ ابن مسلم چار ہزار آدمیوں کی فوج لے کر شہر میں داخل ہوئے۔ وہاں انھوں نے طے شدہ کارروائی کی۔ مگر اس کے بعد انھوں نے شہر نہیں چھوڑا۔ جب شہر کے سرداروں نے پوچھا تو ان سے کہہ دیا کہ شہر سے باہر جانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میرے ساتھ میری فوج بھی شہر میں رہے گی۔ یہ واقعہ سمرقند والوں کے لیے بہت تکلیف دہ تھا تاہم اس وقت وہ خاموش ہو کر رہ گیے۔ یہاں تک کہ کئی برس بعد انھیں معلوم ہوا کہ عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱-۹۹ھ) اسلام کے خلیفہ مقرر ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ بے حد متقی اور عادل خلیفہ ہیں۔

اب سمرقند والوں کو دوبارہ ہمت ہوئی۔ انھوں نے اپنا نمائندہ وفد دمشق بھیجا۔ وفد نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ قتیبہ بن مسلم طے شدہ معاہدہ کے خلاف شہر کے اندر داخل ہو گیے اور وہاں اپنے فوجیوں کو آباد کر دیا۔

اس وقت اس واقعہ پر تقریباً سات سال گزر چکے تھے اور قتیبہ بن مسلم کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ پر دوسرا شخص سمرقند کا حاکم تھا۔ بظاہر سیاسی مفاد کا تقاضا تھا کہ اس دفتر کو اب نہ کھولا جائے۔ موجودہ زمانہ کے قوم پرست لیڈر اس وقت ہوتے تو وہ کہتے کہ اگر ہم نے اس بند دفتر کو کھولا تو پھر تمام مفتوحہ ملکوں سے وفود آنا شروع ہو جائیں گے اور ہم کو پسپا ہوتے ہوتے مدینہ لوٹ جانا ہوگا۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز خدا سے ڈرنے والے انسان تھے۔ ان کی نظر میں مفاد کے مقابلہ میں اصول کی زیادہ اہمیت تھی۔ سیاسی تقاضے کے مقابلہ میں اخلاقی تقاضا زیادہ قابل لحاظ تھا۔ چنانچہ انھوں نے فوراً وفد کی درخواست کو قبول کر لیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے خراسان کے گورنر کو لکھا کہ ایک قاضی مقرر کیا جائے جو وفد کی

شکایت کی جانچ کرے۔ چنانچہ گورنر نے قاضی جُمیع بن حاضر کو اس کی تحقیق کے لیے مقرر کیا۔ انھوں نے سمرقند جاکر پورے معاملہ کی جانچ کی۔ انھوں نے پایا کہ شکایت درست ہے۔ انھوں نے فوراً حکم دیدیا کہ مسلم فوج شہر کو مکمل طور پر خالی کر دے اور شہر سے باہر چلی جائے۔

اس فیصلہ کے تحت بظاہر مسلمان سمرقند کو کھو رہے تھے۔ مگر اس قسم کا اخلاقی عمل محض ایک سادہ عمل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے اندر زبردست طاقت رکھتا ہے۔ مسلمانوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ وہ اس قدر پابند لوگ ہیں کہ محض ایک اصول کی خاطر وہ سات سال پرانا دفتر کھول سکتے ہیں اور صرف ایک اخلاقی تقاضے کے تحت فتح کے باوجود واپس جانے کے لیے تیار ہیں۔ سمرقند کے لوگوں نے جب اس کو دیکھا تو ان کے دل پگھل گیے۔ انھوں نے سوچا کہ اس سے زیادہ لائق اور انصاف پسند لوگ کہاں ملیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ آپ لوگ شہر سے باہر نہ جائیں بلکہ یہیں قیام کریں۔ آپ کا قیام ہم کو خوشی کے ساتھ منظور ہے۔ (فتوح البلدان للبلاذری)

حضرت عمر بن عبد العزیز کا فیصلہ بظاہر ملک کو کھو رہا تھا۔ مگر اخلاقی طاقت نے ملک کو دوبارہ زیادہ قوت کے ساتھ آپ کی طرف لوٹا دیا۔

یک طرفہ اخلاق

اخلاق میں بلاشبہ فتح کی طاقت ہے۔ مگر فتح کی طاقت صرف اُس اخلاق میں ہے جو یک طرفہ ہو۔ یعنی دوسرے آدمی نے آپ کے ساتھ برائی کی ہو پھر بھی آپ اس کے ساتھ بھلائی کریں۔ آپ بھلائی کرنے کے لیے مجبور نہ ہوں اس کے باوجود آپ اپنے فریق کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کریں۔ دوطرفہ اخلاق میں معاملہ برابر ہو جاتا ہے اس لیے اس میں غلبہ کی شان پیدا نہیں ہوتی۔ یک طرفہ اخلاق میں معاملہ برابر نہیں ہوتا اس لیے اس کے مقابلے میں آدمی دبنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

جب بھی آپ یک طرفہ طور پر بہتر سلوک کرنے کی پوزیشن میں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ آپ تلوار اور بندوق کے بغیر جنگ جیتنے کی پوزیشن میں ہیں۔ آپ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر فریق ثانی پر غالب آسکتے ہیں۔ اِس دنیا میں اس سے بڑا نادان کوئی شخص نہیں جو یک طرفہ

حسن سلوک کا موقع پائے اور پھر بھی اسے استعمال کیے بغیر ضائع کر دے ۔

اخلاقی فتح میں ایک خاص صفت ہے جو کسی دوسری فتح میں موجود نہیں ۔ فتح کی دوسری قسموں میں فتح اِس قیمت پر حاصل ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ ختم ہو کر دوسرا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً جنگ کے ذریعہ فتح میں طرفین کی بربادی ، فاتح میں بے جا فخر اور مفتوح میں بے جا نفرت۔ وغیرہ ۔ مگر اخلاقی فتح مسئلہ کو مکمل طور پر حل کر دیتی ہے ۔ بغیر اس کے کہ اس نے کوئی نیا مسئلہ پیدا کیا ہو۔

اخلاق ایک ایسی طاقت ہے جو دشمن کو اندر سے زیر کر دیتی ہے ۔ جو دشمنی کو حقیقی دوستی میں تبدیل کر دیتی ہے ۔ وہ سرکشوں کی سرکشی کو ختم کرتی ہے اور خون بہائے بغیر قلعہ کے دروازے کھول دیتی ہے ۔ اخلاقی تدبیر میں آدمی بظاہر دیتا ہے مگر وہ اس کو دوبارہ زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل کر لیتا ہے ۔ اخلاقی طاقت حریف کو اس طرح مغلوب کرتی ہے کہ وہ اس سے یہ حوصلہ چھین لے کہ وہ غالب کے خلاف اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھے ۔

دہلی یکم اکتوبر ١٩٨٥

اتحاد

قرآن اور حدیث میں اتحاد پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ شخصی اعتبار سے ایک آدمی کے لیے سب سے اہم چیز ایمان ہے۔ اور اجتماعی اعتبار سے اہل ایمان کے مجموعہ کے لیے سب سے اہم چیز اتحاد۔ ایمان کے بغیر فرد کی کوئی قیمت نہیں۔ اسی طرح اتحاد کے بغیر اجتماع کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

واعتصموا بحبل الله جميعا و	(اے ایمان والو) تم سب مل کر اللہ کی رسّی کو
لاتفرقوا واذكروا نعمت الله عليكم	مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو۔ اور اللہ کا یہ انعام
اذ كنتم اعداءً فالّف بين قلوبكم	اپنے اوپر یاد رکھو کہ تم آگ کے گڑھے کے
فاصبحتم بنعمته اخوانا وكنتم	کنارے تھے تو اللہ نے تم کو اس سے
على شفا حفرة من النار فانقذكم	بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی
منها كذلك يبين الله لكم اٰياته	نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت
لعلكم تهتدون (آل عمران ۱۰۳)	پاؤ۔

اس آیت میں اہل ایمان کو اتحاد کی تاکید کی گئی ہے۔ اتحاد کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ اتحاد ہر اسلامی عمل کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔

اسلام میں اتحاد کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف عام اجتماعی معاملات میں اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ بلکہ خالص عبادتی معاملات کا نظام بھی اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ اس کو سب مسلمان مل کر اجتماعی طور پر ادا کریں۔

نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک انفرادی فعل ہے۔ نماز کا مطلب یہ ہے کہ ایک

شخص اللہ کے آگے جھک جائے۔ ایک شخص اللہ کو یاد کرنے والا بن جائے۔ مگر اس قسم کے انفرادی اور روحانی عمل کے لیے بھی یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی طور پر ایک امام کی قیادت میں ادا کیا جائے۔

زکوٰۃ بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک انفرادی فعل ہے۔ ایک شخص اپنی کمائی کو پاک کرنے کے لیے اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کی راہ میں نکالتا ہے۔ اسی کا نام زکوٰۃ ہے۔ مگر زکوٰۃ کے لیے یہ حکم ہے کہ ہر آدمی الگ الگ اپنی زکوٰۃ نہ خرچ کرے۔ سب کی زکوٰۃ ایک مرکزی بیت المال میں جمع ہو اور وہاں سے اس کو اجتماعی طور پر خرچ کیا جائے۔

اسی طرح روزہ ایک خالص انفرادی اور روحانی نوعیت کا عمل ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ ہر ایک سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم اپنے طور پر سال میں ۳۰ دن کے روزے رکھ لیا کرو۔ بلکہ اس کے لیے سال کا ایک خاص مہینہ مقرر ہوا۔ اور تمام لوگوں کو حکم دیا گیا کہ اسی خاص مہینہ میں ایک ساتھ روزہ رکھیں اور ایک ساتھ افطار کریں۔

حج خدا کی پکار پر ایک بندہ کا خدا کی طرف دوڑ پڑنا ہے۔ اس اعتبار سے حج بھی ایک انفرادی عبادت ہے۔ مگر اس انفرادی عبادت کو اتنے بڑے پیمانے پر اجتماعی بنایا گیا کہ حکم ہوا کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک وقت میں مقامات حج پر جمع ہو کر ایک ساتھ حج کے مراسم ادا کریں۔ حج میں اجتماعیت کا پہلو بے حد نمایاں ہے۔ برٹانیکا میں اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> About 2,000,000 persons perform the Hajj each year, and the rite serves as a unifying force in Islam by bringing followers of diverse background together in religous celebration (Vol. IV, p.844).

تقریباً دو ملین آدمی ہر سال حج کرتے ہیں۔ اور یہ عبادت مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک مذہبی تقریب میں اکھٹا کر کے اسلام میں اتحادی طاقت کا کام کرتی ہے۔

اختلاف کا اثر دین پر

امام بخاری نے حضرت عبادہ بن صامت کی ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے کہ ہم کو شب قدر کی خبر دیں۔ پھر مسلمانوں میں سے دو آدمی جھگڑا کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دیدوں تو فلاں اور فلاں جھگڑ پڑے پس اس کا

علم اٹھالیاگیا (قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم لیخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحی رجلان من المسلمین فقال: خرجت لاخبرکم بلیلۃ القدر فتلاحی فلان و فلان فرفعت، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۲۶۲)

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں: باہمی جھگڑا فائدہ سے محروم کردیتا ہے اور نفع بخش علم جاتا رہتا ہے جیساکہ دوسری حدیث میں ہے کہ بندہ گناہ کے باعث رزق سے محروم کردیا جاتا ہے (ان المماراۃ تقطع الفائدۃ والعلم النافع کما جاء فی الحدیث ان العبد لیحرم الرزق بالذنب یصیبہ)

حقیقت یہ ہے کہ اتحاد کا بہت گہرا تعلق دوسرے اسلامی اعمال اور عبادات سے ہے۔ مثال کے طور پر مسجد میں اگر امامت اور تولیت کا جھگڑا چھڑ جائے تو مسجد کے اندر عبادت اور خدا کی طرف رجوع کی فضا ختم ہوجائے گی۔ حتیٰ کہ یہ نوبت بھی آسکتی ہے کہ ایک مسجد میں دو جماعت ہونے لگے یا سرے سے مسجد ہی بند ہوجائے۔ دینی مدرسہ میں اگر ذمہ داروں کے درمیان لڑائی ہوجائے تو مدرسہ میں تعلیم کا ماحول باقی نہیں رہے گا۔ گروہ بندی اور سیاست بازی میں ساری طاقتیں صرف ہونے لگیں گی۔

مسلم ملکوں کے درمیان اگر لڑائی چھڑ جائے تو اس کا براہ راست اثر حج کی عبادت پر پڑے گا۔ کتنے حاجی حجاز کے سفر سے روک دیئے جائیں گے۔ جو لوگ جائیں گے ان کی اتنی تلاشی ہوگی اور ان کے ساتھ اتنی سختی کی جائے گی کہ وہ حج کے لیے جانے سے گھبرانے لگیں۔ ایسی فضا بنے گی کہ سکون کے ساتھ حج کے تمام مراسم ادا کرنا مشکل ہوجائے گا۔

مسلم ممالک اگر باہم اختلاف کرکے الگ الگ دھڑوں میں تقسیم ہوجائیں تو دنیا بھر کے مسلمان بھی اسی کے ساتھ تقسیم ہوجائیں گے۔ کچھ لوگ ایک مسلم ملک کے ساتھ وابستہ ہوجائیں گے اور کچھ لوگ دوسرے مسلم ملک کے ساتھ اور پھر ہر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی شروع کردے گا۔ ایک طرف کے افراد دوسری طرف کے افراد کے لوگوں کو بدنام کریں گے۔ ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کے لوگوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچانا اپنے لیے جائز کریں گے۔ پوری امت میں دینی ماحول ختم ہوکر اکھیڑ پچھاڑ کا ماحول پیدا ہوجائے گا۔ لوگوں کو مسلمان بنانے کے بجائے

لوگوں کو کافر بنانے کا عمل شروع ہو جائے گا۔

ہوا اکھڑ جانا

قرآن میں آپس کے اختلاف کا ایک نقصان یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد دوسری اقوام کی نظر میں تمہارا وزن گھٹ جائے گا۔ دوسری قومیں تمہارے اوپر جری ہو جائیں گی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں :

واطیعوااللّٰہ ورسولہ ولا تنازعوا	اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔
فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا	اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تمہارے اندر
اِنّ اللّٰہ مع الصابرین	کمزوری آجائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی
(الانفال ۴۶)	اور صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تقریبًا اسی مضمون کی آیت سورۃ آل عمران (۱۵۲) میں آئی ہے جہاں غزوہ اُحد کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : حتّٰی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون۔ (یہاں تک کہ جب تم کمزور پڑ گئے۔ اور تم نے حکم میں اختلاف کیا اور نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھا دی تھی جس کو تم چاہتے تھے)

نزاع یا تنازع کے لفظی معنیٰ وہی ہیں جس کو انگریزی میں Controversy کہتے ہیں۔ یعنی باھم جھگڑنا۔ کسی معاملہ میں اختلاف برپا کرنا۔ کوئی بات کہی جائے اور اس میں ایک شخص ایک پہلو نکال کر کچھ اور رائے دے اور دوسرا شخص دوسرا پہلو نکال کر دوسری رائے دے تو اسی کو تنازع کہتے ہیں۔

یہی صورت غزوہ اُحد میں پیش آئی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ اُحد پہاڑ کے ایک درّہ پر بٹھا دیا تاکہ دشمن پشت کی طرف سے حملہ نہ کر سکے۔ آپ نے حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو اس دستہ کا امیر مقرر کیا اور فرمایا کہ جنگ میں ہم کو فتح ہو یا شکست کسی حال میں تم یہاں سے نہ ہٹنا۔ ہر حال میں یہیں قائم رہنا۔ بعد کو جب مسلمانوں کو فتح ہونے لگی تو ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ ہم کو یہیں جمے رہنا چاہیے۔ یہ اختلاف رائے اتنا بڑھا کہ دس آدمی کو

چھوڑ کر بقیہ لوگ وہاں سے چلے گئے اور اس کے بعد دشمن نے اسی درہ سے عقبی حملہ کر کے فتح کو شکست میں بدل دیا ۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کیا چیز ہے اور وہ کیسے پیدا ہوتا ہے ۔ اختلاف اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ مرکزی قیادت کی طرف سے جو بات کہی جائے اس میں ہر آدمی نئے نئے پہلو نکال کر الگ رائے دینے لگے اور اپنی رائے پر اس حد تک اصرار کرے کہ وہ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو ۔ اس قسم کا اختلاف بدترین گمراہی ہے ۔ اجتماعی معاملات میں ہر آدمی کو اظہار رائے کا حق ہے ۔ مگر اپنی رائے پر اصرار کرنے کا حق کسی کو نہیں ۔ آدمی کو رائے دینے کے ساتھ اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ وہ اس پر کسی حال میں اصرار نہیں کرے گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی ہی کی بنیاد پر اتحاد قائم ہوتا ہے ۔ جن لوگوں کے اندر اپنی رائے کی قربانی دینے کا حوصلہ نہ ہو ان کے درمیان کبھی حقیقی اتحاد وجود میں نہیں آسکتا ۔ اور اگر وجود میں آجائے تو قائم نہیں رہ سکتا ۔

آدمی کو اپنی منفرد رائے پر چلنے کا اختیار صرف ان امور میں ہے جن کا تعلق سراسر اس کی اپنی ذات سے ہو ۔ دوسروں سے اس کا کوئی براہ راست یا بالواسطہ تعلق نہ ہو ۔ اس کے علاوہ جو جماعتی امور ہیں ان میں افراد کے لیے لازم ہے کہ وہ مرکزی قیادت کے حکم کی پابندی کریں ۔ اپنے ذہنی ارتعاش کے تحت اجتماعی امور میں نئے نئے شوشے نکالنا سراسر ناجائز ہے ۔

اختلاف کا لازمی نتیجہ کمزوری اور کم ہمتی ہے ۔ ایک لاکھ آدمیوں کی ایک جماعت اگر متحد ہو تو اس کا ہر آدمی اپنے کو ایک لاکھ کے برابر محسوس کرتا ہے ۔ اس سے اس کے اندر حوصلہ پیدا ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس اگر اس کے افراد اختلاف کر کے الگ الگ ہو جائیں تو ہر آدمی بس ایک آدمی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ایسے گروہ کے افراد مایوسی کا شکار ہو کر حوصلہ کھو دیتے ہیں ۔ وہ نازک مواقع پر اقدام کی جرأت نہیں کر سکتے ۔

ایک لاکھ آدمیوں کے اندر اگر اتحاد ہو تو ان کے دشمن ان کو "ایک لاکھ" کے گروہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ ان کے دلوں میں ایسے گروہ کی دھاک بیٹھی رہتی ہے ۔ وہ ان کے خلاف کسی کارروائی کی ہمت نہیں کرتے ۔ اس کے برعکس جب گروہ کے افراد اختلاف کر کے ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو ان کے دشمن ان پر جری ہو جاتے ہیں ۔ دشمنوں کی نظر سے ان کی ہیبت اٹھ جاتی ہے ۔

اختلاف کا سبب

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس خطرہ سے ڈرایا تھا وہ آپس کا اختلاف تھا۔ یہ اندیشہ آج مسلمانوں کے بارہ میں پوری طرح صحیح ثابت ہوچکا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آج کی دنیا کی واحد قوم ہیں جو سب سے زیادہ آپس میں لڑتے ہیں۔ جن کے درمیان سب سے زیادہ باہمی جھگڑا برپا رہتا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان اس کمزوری کی ایک خاص نفسیاتی وجہ ہے، اور وہ ہے جھوٹا احساس برتری۔ مسلمان اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ہمیشہ اُس وقت جھوٹے احساس برتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں جب کہ خدا کا خوف ان کے دلوں سے نکل گیا ہو۔

مسلمان کا عقیدہ ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ حق صرف وہ ہے جو اس کے پاس ہے۔ دوسری طرف اس کا عقیدہ اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا ہی طاقت ور ہے، باقی سب لوگ عاجز ہیں۔ اس طرح مسلمان بیک وقت دو احساسات کے درمیان ہوتا ہے۔ بندوں کی نسبت سے سب سے بہتر ہونے کا احساس، اور خدا کی نسبت سے سب سے کم تر ہونے کا احساس ”صرف میرے پاس حق ہے، میرے سوا کسی کے پاس حق نہیں“ یہ عقیدہ عین اپنی فطرت کے مطابق آدمی کے اندر اپنی برتری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ احساس کہ خدا ہی ہر چیز کا مالک ہے، میرے پاس اپنی کوئی چیز نہیں“، یہ احساس اس کے اندر عجز کا جذبہ ابھارتا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا احساس پہلے احساس کو متوازن کرتا رہتا ہے۔ اپنے کو خیر امت سمجھتے ہوئے بھی آدمی دوسروں کے درمیان اس طرح رہتا ہے گویا اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

مگر جب مسلمانوں کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو ان کے اندر سے جو چیز نکل جاتی ہے وہ یہی خدا کا ڈر ہے۔ اب مسلمان بے جان عقیدہ کے طور پر خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کی عظمت اور کبریائی کے احساس سے ان کا دل خالی ہوچکا ہوتا ہے۔ یہی وہ خاص نفسیات ہے جو ان کے درمیان آپس کی لڑائی کو جنم دیتی ہے، جو ان کے اندر عدوان کا مزاج پیدا کرتی ہے۔

سمندر کا پانی اگر اڑ جائے تو وہاں صرف نمک باقی رہے گا۔ اسی طرح ”میں حق پر ہوں“ کے احساس سے جب ”میں عاجز ہوں“ کا احساس نکل جائے تو اس کے بعد آدمی کے اندر جو چیز باقی رہے گی وہ صرف اپنی برتری کا جذبہ ہے۔ اور برتری کا جذبہ عجز سے خالی ہونے کے بعد، ظلم اور فساد کے سوا کوئی اور چیز آدمی کے اندر پیدا نہیں کرتا۔

اتحاد کے لیے صبر کی اہمیت

اختلاف سے بچنا اور اتحاد پر قائم رہنا کیسے ممکن ہوتا ہے، اس کا راز آیت میں صبر بتایا گیا ہے۔ صبر تقریبًا وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانے میں ڈسپلن کہا جاتا ہے۔ ڈسپلن سے مراد ہے ــــ نظم، سلف کنٹرول، حقائق کی رعایت کرنا، اپنے کو قابو میں رکھ کر عمل کرنا۔

یہی صبر ہے۔ صبر دراصل منظم عمل کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی کا یہ حال ہو جائے کہ وہ محض اپنے ذاتی جذبے سے بھڑک نہ اٹھے بلکہ خارجی پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر اپنے عمل کا نقشہ بنائے تو اسی کو صبر کہتے ہیں۔ یہ صبر اتحاد کے لیے لازمی شرط ہے۔ جہاں صبر ہو وہاں لازمًا اتحاد بھی ہوگا اور جہاں صبر نہ ہو وہاں یقینی طور پر اتحاد بھی پایا نہیں جا سکتا۔

اتحاد اور دعوت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اپنے اصحاب کو جمع کیا۔ آپ نے ان کو ابھارا کہ وہ آپ کے پیغام توحید کو لے کر اٹھیں اور اس کو تمام لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس سلسلے میں روایت میں حسب ذیل الفاظ آئے ہیں :

ان اللہ بعثنی رحمۃ للناس کافۃ	اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر
فادّوا عنی ولا تختلفوا کما اختلف	بھیجا ہے تو تم میری طرف سے لوگوں کو دعوت
الحواریون علی عیسیٰ بن مریم	پہنچاؤ اور آپس میں اختلاف نہ کرو جس طرح حواریین
(وفی روایۃ) فقال المہاجرون یا	نے عیسیٰ بن مریم سے اختلاف کیا۔ مہاجرین نے جواب
رسول اللہ اِنا لا نختلف علیک فی شیئٍ	دیا کہ اے اللہ کے رسول، ہم آپ سے کبھی کسی معاملہ میں
ابدًا فمُرنا وابعثنا۔	اختلاف نہیں کریں گے۔ پس آپ ہم کو حکم دیجئے اور ہم کو بھیجئے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کے لیے بھی اتحاد لازمی طور پر ضروری ہے۔ دعوت حق کا کام ایک بہت بڑا کام ہے اس کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے مشترکہ جدّوجہد بے حد ضروری ہے۔ ایک دوسرے کے تعاون اور اتحاد ہی سے یہ کام انجام پا سکتا ہے۔

چار آدمی کہیں تبلیغ کے لیے نکلیں اور راستہ میں وہ آپس میں اختلاف کر لیں تو دوسروں تک پہونچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ وہ آپس ہی میں لڑ بھڑ کر الگ ہو جائیں گے۔ کوئی دعوتی

مہم شروع کی جائے جس میں بہت سے لوگ کام کرنے والے ہوں۔ اب اگر وہ ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگیں تو ادارہ کا کام معطل ہو جائے گا اور ساری طاقت آپس کے مسائل نمٹانے پر صرف ہونے لگے گی۔ تبلیغ و دعوت کے کام کے لیے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ مختلف مقامات پر اس کی بہت سی شاخیں ہوں۔ اب اگر ہر شاخ کے ذمہ دار کے ذہن میں آزادی کا خیال آجائے، ہر شاخ مرکز سے الگ ہونے کی بات سوچنے لگے تو ساری طاقت اندرونی مسائل کو نمٹانے میں صرف ہونے لگے گی اور باہر تبلیغ کرنے کا کام دھرا رہ جائے گا۔

تبلیغی عمل لازمی طور پر اتحاد چاہتا ہے۔ جہاں افراد کے درمیان اختلافات پیدا ہو جائیں وہاں موثر تبلیغی کام نہیں کیا جا سکتا۔

تقویٰ سے اتحاد

اختلاف کی سب سے بڑی وجہ انانیت ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوں ان کے درمیان کبھی اختلاف اس بُری حد تک نہیں پہونچ سکتا جو قوموں کو ھلاک کرنے والا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اختلاف کا قاتل ہے۔ جہاں تقویٰ ہوگا وہاں اختلاف نہیں ہوگا اور جہاں اختلاف ہوگا وہاں تقویٰ نہیں ہوگا۔

ایک بار مجھے ایک اجتماع میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ یہ علماء اسلام کا اجتماع تھا۔ اور اس میں ملّی اداروں کے مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہر آدمی ایک الگ خیال لے کر اٹھتا اور اس پر الفاظ کا دریا بہانا شروع کر دیتا۔ جتنے مقررین تھے اتنی ہی رائیں تھیں۔ ہر آدمی کو اپنی رائے پر اتنا شدید اصرار تھا کہ وہ کسی طرح اپنی رائے چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

میں خاموش بیٹھا ہوا لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ میرے دل پر ایک غم کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ بھی بولیے۔ میں کھڑا ہوا تو میں نے کہا کہ میں زیر بحث مسائل پر کوئی براہِ راست کلام نہیں کروں گا۔ بلکہ ایک اصولی بات کہوں گا۔ اور وہ یہ ہے کہ ہماری ملّت کا اصل مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ ہم نے تقویٰ کو کھو دیا ہے۔ ساری قوم بے خوفی کی نفسیات میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس کے مختلف نتائج میں سے ایک وہ ہے جس کا منظر یہاں دکھائی دے رہا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اگر ہمارے دل اللہ کے ڈر سے کانپنے والے ہوں تو رایوں کی کثرت اور جتنوں

کا طوفان اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ — شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اتنے میں انہیں سانپ کی شکل کی ایک چیز نظر آتی ہے۔ اگر وہ بالکل بے حرکت ہو اور بظاہر اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوتا ہو تو اس کو دیکھ کر لوگ طرح طرح کی طبع آزمائی کریں گے۔ کوئی شخص کہے گا کہ یہ ایک مرا ہوا سانپ ہے، کوئی مار کر اس کو یہاں ڈال گیا ہے۔ دوسرا آدمی کہے گا کہ نہیں یہ پلاسٹک کا بنا ہوا سانپ ہے۔ اور اس کے بعد وہ پلاسٹک صنعت کے بارے میں اپنی معلومات بکھیرنا شروع کرے گا۔ کوئی اور شخص بولے گا کہ نہیں یہ ایک اسٹف کیا ہوا سانپ ہے یعنی اصل سانپ کی کھال میں بھس وغیرہ بھر دیا گیا ہے۔

یہ طرح طرح کی رائیں اس وقت ہوں گی جب کہ سانپ بالکل بے حس وحرکت پڑا ہوا ہو۔ لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہو یعنی وہ سانپ اپنا خوفناک پھن نکال کر کھڑا ہو جائے تو اس وقت اچانک رایوں کی کثرت رایوں کی وحدت میں تبدیل ہو جائے گی۔ سب لوگ بیک زبان کہہ اٹھیں گے کہ سانپ، سانپ۔ اسی حقیقت کو میں نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ — شدت خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دیتا ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: راس الحکمة مخافة اللّٰہ (اللہ کا ڈر دانائی کا سرا ہے) یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے لیے سب سے زیادہ طاقتور نفسیات خوف کی نفسیات ہوتی ہے۔ انسان کی اصلاح جتنی زیادہ خوف کے ذریعہ ہوتی ہے کسی اور چیز کے ذریعہ نہیں ہوتی۔ پھر یہ خوف جب خداوند ذوالجلال کا خوف ہو تو اس کی تاثیر بے پناہ حد تک زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر ایک انا ہے۔ ہر آدمی اپنی بڑائی چاہتا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کی بات دوسروں کی بات سے اوپر رہے۔ انسان کی یہی نفسیات ہر قسم کے اختلاف کا اصل سبب ہے۔ جہاں ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہو وہاں جتنے آدمی ہوں گے اتنی ہی رائیں ہوں گی۔ ایسی حالت میں لوگوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر اللہ پر آدمی کا ایمان اتنا گہرا ہو کہ وہ تقویٰ بن جائے۔ یعنی اللہ پر ایمان آدمی کو اللہ سے ڈرنے والا بنا دے تو ایسی حالت میں قدرتی طور پر ایسا ہو گا کہ آدمی کی انا اس سے چھن جائے گی۔ اس

کے اندر گھمنڈ کے بجائے تواضع کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ وہ دوسروں کے احتساب سے زیادہ خود اپنا احتساب کرنے لگے گا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے دیکھے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو اپنا وجود ہمیشہ چھوٹا نظر آئے گا۔ کیوں کہ خدا کی نسبت سے کوئی بھی انسان بڑا نہیں۔ خدا کی نسبت سے سارے انسان چھوٹے ہیں۔

سچا مومن اسی قسم کے احساسات میں جیتا ہے اور انہیں احساسات کے نقد انجام کا نام اتحاد ہے۔ قرآن و حدیث میں بار بار بتایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا وہ تمہارے سب کام بنا دے گا اس کا مطلب ایک اعتبار سے یہ ہے کہ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو تمہارے اندر وہ خصوصیات پیدا ہوں گی جو دنیا کی زندگی میں آدمی کو طاقت ور بناتی ہیں۔ اس سے تمہارے اندر وہ کردار ابھرے گا جو دنیا میں مضبوط زندگی کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ اس سے تمہاری قوم وہ قوم بن جائے گی جس سے لوگ ہیبت زدہ ہوں اور جس کے خلاف اقدام کی جرأت نہ کر سکیں۔

اسلامی تاریخ میں مسلمانوں کو جو غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئی ہیں ان میں سے ایک نمایاں فتح وہ ہے جو صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳ — ۱۱۳۸) کے زمانہ میں حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں سارا یورپ فلسطین کو مسلمانوں سے واپس لینے پر آمادہ ہو گیا اور عملاً لے لیا۔ صلاح الدین وہ شخص ہے جس نے یروشلم پر مسیحی یورپ کے ۸۸ سالہ قبضہ کو ختم کیا اور مسیحی اقوام کو شکست دے کر ۱۱۸۷ء میں اس کو دوبارہ مسلم سلطنت میں شامل کیا۔ صلاح الدین کی اس کامیابی کا راز اتحاد تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> Saladin succeeded in turning the military balance of power in his favour — more by uniting and disciplining a great number of unruly forces than by employing new or improved military techniques (16/177).

صلاح الدین فوجی طاقت کے توازن کو اپنے موافق بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کامیابی ان کو زیادہ تر منتشر قوتوں کو جوڑنے اور منظم کرنے سے ہوئی نہ کہ نئی یا ترقی یافتہ فوجی تدبیروں کو اختیار کرنے سے ـــــــ یہ تاریخ کا سبق ہے اور تاریخ سے بڑی کون سی چیز ہے جو اس معاملہ میں آدمی کو سبق دے۔

حصہ دوم

اتحاد ایک اجتماعی واقعہ ہے جو انفرادی قربانی کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ جس گروہ کے افراد اپنے آپ کو پیچھے کرنے پر راضی کر لیں وہی گروہ اس دنیا میں وہ گروہ بنتا ہے جو متحدہ طاقت سے آگے بڑھ سکے۔ جماعت کا آگے بڑھنا افراد کے پیچھے ہٹنے کی قیمت ہے۔ ذاتی شکایتوں کو پی جانا سرکشی کا موقع ہوتے ہوئے تواضع اختیار کرنا، جزئی اختلاف کو کلی اختلاف نہ بنانا، قومی تقاضے کو انفرادی تقاضے کے اوپر رکھنا، اجتماعی مفاد کی خاطر ذاتی رائے کو دفن کر دینا یہی وہ خصوصیات ہیں جو کسی گروہ میں اتحاد پیدا کرتی ہیں۔

ذاتی شکایت سے اوپر اٹھ جانا

حضرت خالد بن ولید اسلامی تاریخ کے بہت بڑے سپہ سالار گزرے ہیں۔ ابتدائی زمانہ کی اسلامی فتوحات میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ حضرت عمر فاروق بعض اعتبار سے ان سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت خالد کو سرداری کے مقام سے معزول کر دیا اور ان کو حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا ماتحت سپاہی بنا دیا۔

اس وقت حضرت خالد بن ولید ایران میں تھے اور فتوحات پر فتوحات کیے چلے جا رہے تھے۔ حضرت عمر فاروق کا یہ حکم عین انہیں فتوحات کے زمانہ میں پہونچا جب کہ حضرت خالد نے ایک ہیرو کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ عام رواج کے مطابق اس واقعہ کے بعد فوجی بغاوت ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر حضرت خالد نے کسی قسم کی کوئی جوابی کارروائی نہ کی۔ انہوں نے نہایت پر سکون طور پر سرداری کا عہدہ حضرت ابو عبیدہ کے حوالہ کر دیا اور اپنے آپ کو ان کا ماتحت بنا لیا۔

حضرت خالد بن ولید چوں کہ اپنے کارناموں کی وجہ سے فوج میں بہت زیادہ مقبول تھے۔ اس خبر کے پھیلنے کے بعد فوجیوں میں ناراضگی پیدا ہو گئی۔ بہت سے فوجی ان کے خیمہ میں جمع ہوئے اور کہا کہ آپ خلیفہ کے حکم کو نہ مانیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر حضرت خالد نے نہایت بے نیازی کے ساتھ سب کو واپس لوٹا دیا۔ اس وقت انہوں نے جو جملہ کہا وہ تاریخ نے ان الفاظ میں محفوظ رکھا ہے:

انی لا اقاتل فی سبیل عمرو لکن	میں عمر کے راستہ میں نہیں لڑتا، بلکہ میں عمر کے
اقاتل فی سبیل رب عمر	رب کے راستہ میں لڑتا ہوں۔

حضرت خالد اگر خلیفہ کے اس حکم پر بگڑ جاتے تو فوراً آپس کی لڑائی چھڑ جاتی اور اسلام کی تاریخ جہاں پہنچی تھی وہیں رُک جاتی۔ مگر جب حضرت خالد نے اس حکم کو مان لیا تو انہوں نے اسلامی تاریخ کو آگے بڑھا دیا۔

اس نازک موقع پر یہ جملہ بلاشبہ ایک عظیم الشان جملہ ہے۔ ایسے موقع پر ایسا جملہ بولنا ہمالیہ پہاڑ کو اٹھانے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے، مگر یہی اتحاد کی اصل قیمت ہے۔ یہ گویا انسان کی طرف سے پیش آنے والی شکایت کو اللہ کے خانہ میں ڈالنا ہے۔ ایسا جملہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے اللہ کو اتنی بڑی چیز کی حیثیت سے پایا ہو کہ اس کے بعد ہر دوسری چیز اس کے لیے چھوٹی ہو جائے۔ بڑی چیز کو پانے والے ہی چھوٹی چیز کی قربانی برداشت کرتے ہیں اس لیے اتحاد کی قربانی بھی وہی لوگ دے پاتے ہیں جو اپنے لیے اتنی بڑی چیز پا چکے ہوں کہ اس کے بعد ہر چیز ان کو چھوٹی معلوم ہونے لگے۔

صحابہ کرام کا ایمان ان کے لیے یہی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کو ایمان سب سے بڑی چیز کے طور پر ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے نقصان کو برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بڑی سے بڑی شکایت کو بھلا دیتے تھے۔ بڑی سے بڑی قربانی بھی انہیں ہلکی معلوم ہوتی تھی۔ ان کے ایمان نے ہر چیز کو ان کی نظر میں چھوٹا کر رکھا تھا۔ پھر انہیں کسی چیز کے کھونے کا غم ہوتا تو کیوں ہوتا۔ صحابہ کرام کا بے مثال اتحاد ان کے ایمان کی نقد قیمت تھی۔ آئندہ بھی اگر کسی گروہ میں حقیقی اتحاد پیدا ہوگا تو اسی وقت پیدا ہوگا جب کہ اس کے اندر صحابہ والا ایمان پیدا ہو جائے۔

اتحاد ایک طاقت

اتحاد کتنی بڑی طاقت ہے اور اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے اسلامی تاریخ کی ایک مثال لیجیے۔

حضرت علی جب خلیفہ مقرر ہوئے اس وقت حضرت امیر معاویہ ملک شام کے حاکم تھے۔ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دونوں کے درمیان شکایات پیدا ہو گئیں۔ یہ شکایتیں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ جنگ کی نوبت آ گئی۔ مسلمانوں کی جماعت دو بڑے مسلم رہنماؤں کے ساتھ بٹ کر

آپس میں لڑنے لگی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ مسلمانوں نے رومی (بازنطینی) سلطنت کا بڑا حصہ فتح کر لیا تھا۔ رومی شہنشاہیت کے مشرقی حصہ کو بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) کہا جاتا تھا۔ بازنطینی سلطنت ۳۳۰ عیسوی میں قائم ہوئی۔ اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ (استانبول) تھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں اس کو بہت پھیلاؤ حاصل ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے مصر و شام سے لے کر شمالی افریقہ تک اس کا بیشتر حصہ فتح کر ڈالا۔ اس کے بعد بازنطینی سلطنت قسطنطنیہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں محصور ہو کر رہ گئی۔ اس ساحلی حصہ میں وہ دیر تک باقی رہی یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے اس کو فتح کر کے آخری طور پر اس کا خاتمہ کر دیا۔

رومی سلطنت کا وارث قسطنطین جو اس وقت سمندر کے کنارے قسطنطنیہ کے قلعہ میں موجود تھا اس کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑ رہے ہیں اور خلیفۂ وقت (حضرت علی) کی تمام توجہ داخلی محاذ پر لگی ہوئی ہے تو رومی بادشاہ کے اندر نیا حوصلہ پیدا ہو گیا اس نے سوچا کہ یہ بہترین موقع ہے جب کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اس نے قسطنطنیہ میں بڑے پیمانہ پر فوجی تیاری شروع کر دی تاکہ شام و فلسطین کے علاقہ پر حملہ کرے۔

حضرت معاویہ کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ رومی بادشاہ مسلم دنیا پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ انہوں نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا اور فوراً ایک خط تیار کر کے خصوصی قاصد کے ذریعہ قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس خط کا مضمون مختصر طور پر یہ تھا:

"اے رومی احمق، اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے باہمی اختلاف سے فائدہ اٹھا کر تو مسلم دنیا پر حملہ کرے تو تجھ کو جاننا چاہیے کہ جب تو ایسا کرے گا تو اس وقت تیرے مقابلہ کے لیے علی کا جو لشکر آگے بڑھے گا، معاویہ اس لشکر کا ادنیٰ سپاہی ہو گا۔"

یعنی جب تم مسلم دنیا پر حملہ کرو گے تو ہم اپنے اختلاف کو ختم کر دیں گے اور متحد ہو کر تمہارا مقابلہ کریں گے۔ اس خط کا قسطنطنیہ پہنچنا تھا کہ رومی بادشاہ کی ہمت پست ہو گئی۔ اس نے

فوجی تیاریوں کو بند کرنے کا حکم دے دیا اور مسلم دنیا پر حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اتحاد تو درکنار اتحاد کی خبر بھی اپنے اندر عظیم الشان طاقت رکھتی ہے۔ مذکورہ واقعہ میں جو چیز پیش آئی تھی وہ صرف خبر اتحاد تھی نہ کہ اتحاد۔ اس کے باوجود رومی بادشاہ کے قدم ہل گئے۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا ارادہ ترک کر دیا۔

اختلاف کے باوجود متحد رہنا

اتحاد ہمیشہ ایسے لوگوں کے ذریعہ قائم ہوتا ہے جو اتنے عالی حوصلہ ہوں کہ یک طرفہ طور پر اپنے اختلاف کو ختم کر لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ـــــ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا۔ اختلاف کے بغیر اتحاد نہ انسانی دنیا میں کبھی قائم ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی قائم ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو غزوات پیش آئے ان میں سے ایک وہ ہے جس کو غزوہ ذات السلاسل کہا جاتا ہے۔ جمادی الثانی ۸ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی قضاعہ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ قبیلہ شام کی سرحد پر آباد تھا۔ آپ نے اس کی حوصلہ شکنی کے لیے حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں ایک دستہ روانہ کیا۔ اس میں تین سو آدمی تھے۔

یہ لوگ جب سَلسَل نامی جگہ پر پہونچے تو معلوم ہوا کہ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ عمرو بن العاصؓ یہاں ٹھیر گیے اور رافع بن مَکیث کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ مدد کے طور پر کچھ اور آدمی بھیجے جائیں۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو روانہ کیا۔ ان کے ساتھ دو سو مہاجرین تھے۔ ان میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر جیسے لوگ بھی شامل تھے۔

یہ لوگ مقام سُلسُل پر پہنچے تو سوال پیدا ہوا کہ ان کی امارت کا نظم کیا ہو۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ جو مہاجرین تھے انہوں نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا کہ آپ اپنے آدمیوں کے امیر رہیں اور ابو عبیدہ ہمارے امیر رہیں گے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ میں دونوں دستوں کا امیر ہوں۔ کیونکہ دوسرا دستہ میری ہی مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اختلاف بڑھا تو حضرت ابوعبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو جو آخری نصیحت کی وہ یہ تھی کہ جب تم اپنے آدمی کے پاس پہنچو تو مل کر کام کرنا، ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنا۔ خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمہاری بات مانوں گا۔ (تعلم یاعمرو انّ اٰخر ماعهد الیّ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانّك واللّٰہ ان عصیتنی لاطیعنّك) یہ کہہ کر حضرت ابوعبیدہ نے اپنے دستہ کی امارت حضرت عمرو بن العاص کے حوالہ کردی۔

اب مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ہوگئی۔ حضرت ابوعبیدہ اگر اپنی رائے کی قربانی نہ دیتے تو مسلمان دو ٹکڑے ہو کر آپس میں لڑتے۔ جو کام ان کا دشمن کرنا چاہتا تھا اس کو یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں انجام دے لیتے۔ مگر جب حضرت ابوعبیدہ نے اپنی ذاتی رائے کو دفن کردیا تو وہ پانچ سو کی متحد اور مضبوط جماعت بن گئے۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ متحدہ گروہ جب آگے بڑھا تو دشمن ان کی خبر سن کر دہشت زدہ ہوگیے اور خود ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔

صحابہ کے اندر بے شمار اختلافات تھے۔ مگر یہی عالی حوصلگی تھی جس نے تمام اختلافات کو دبا دیا۔ وہ اختلاف کے باوجود متحد رہے۔ انہوں نے یک طرفہ قربانی کے ذریعہ اسلامی اتحاد کو برقرار رکھا۔

اسلامی اتحاد کا مقصد

اتحاد بلاشبہ ایک طاقت ہے۔ مگر یہ طاقت اس لیے نہیں ہے کہ مسلمان متحد ہو کر کسی کے خلاف جارحیت کریں۔ وہ صرف اس لیے ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کو دیکھ کر دوسرے لوگ اپنی جارحیت سے باز رہیں۔ اسلامی اتحاد کا مقصد دوسروں کو جارحیت سے روکنا ہے نہ کہ خود جارحیت کرنا۔

قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اندر اجتماعی قوت فراہم کریں۔ (واعدوا لهم مااستطعتم من قوة) پھر اسی آیت میں آگے یہ بھی بتا دیا گیا کہ قوت فراہم کرنے کا مقصد کیا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وہ یہ ہے: ترهبون به عدواللّٰہ وعدوکم

(اس کے ذریعہ تم اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤگے) گویا کہ اسلام میں قوت سے مراد قوتِ مرہبہ ہے نہ کہ قوت جارحہ۔ اسلام ہر قسم کی قوت فراہم کرنے کی تاکید کرتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ دوسروں کے خلاف جارحانہ اقدام کیا جائے بلکہ صرف اس لیے کہ دوسرے لوگ خوفزدہ رہیں اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اقدام سے رک جائیں

اسلام کا جو اصل مقصد ہے اس کا طاقت آزمائی یا ٹکراؤ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اسلام کا مقصد دعوت ہے۔ اسلام لوگوں کے دلوں کی گرہیں کھولنا چاہتا ہے۔ تاکہ لوگ دین حق کو سمجھیں اور اپنے آپ کو اللہ کی پسند والے راستے پر چلائیں۔

یہ مقصد ایک پُرامن مقصد ہے۔ یہ مقصد تفہیم اور تبلیغ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے نہ کہ لڑائی بھڑائی کے ذریعہ۔ تاہم اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان بقدر استطاعت اپنے گرد وہ چیز بھی فراہم کریں جو لوگوں کی نظر میں طاقت کا درجہ رکھتی ہے۔ تاکہ شرپسند لوگ اس کے رعب سے دبے رہیں اور اسلامی دعوت کا تعمیری کام کسی خارجی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔

مظاہرۂ طاقت نہ کہ استعمال طاقت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: نصرتُ بالرعب علیٰ مسیرۃ شھر (ایک مہینہ کی مسافت تک کے رعب سے میری مدد کی گئی ہے) اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو عملی تدبیر اور طریق کار بتایا وہ یہ تھا کہ اپنے گرد ایسے حالات فراہم کرو کہ اس کا اثر دور دور تک پہونچے۔ نہ صرف قریبی دشمن بلکہ دور کے دشمن بھی مرعوبیت کی وجہ سے تمہارے خلاف اقدام کرنے سے باز رہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت ایک جاری نبوّت ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آپ کی خصوصیات آپ کی امت تک بھی پہونچ رہی ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جن انعامات سے نوازا ان کو اللہ نے آپ کی امت تک وسیع کر دیا۔

بنو امیہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ حجاج بن یوسف عراق کا حاکم تھا۔ عراق کے ایک سرحدی علاقہ سے خبر ملی کہ ایک قبیلہ بغاوت پر آمادہ ہے۔ حجاج کے مشیروں نے کہا کہ قبیلہ کی سرکوبی کے لیے ہمیں فوراً ایک فوجی دستہ (کتیبہ) بھیجنا چاہیے۔ حجاج نے جواب دیا:

کتابٌ ینوبُ عن کتائب (ایک خط فوجی دستوں کا کام کرے گا) اس کے بعد اس نے ایک سخت دھمکی کا خط لکھ کر قبیلہ کے سردار کے نام روانہ کیا۔ خط پاکر قبیلہ کی ہمت پست ہوگئی۔ وہ بغاوت کرنے سے رُک گیے۔

اسی واقعہ پر شاعر نے یہ شعر کہا تھا:

اذا ما اَرسلَ الامراءُ جَیشًا   الیَ الاعداءِ اَرسلْنا الکتابا

جب حاکم لوگ دشمن کی طرف فوج بھیجتے ہیں تو ہم صرف ایک خط بھیج دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی یہ ہیبت اس وقت تھی جب کہ ان کے اندر اتحاد تھا۔ جب دشمن سمجھتا تھا کہ ایک مسلمان کو نشانہ بنانا پوری مسلم قوم کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ جب مسلمان صحیح معنوں میں ایک واحدامت بنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد جب مسلمانوں کے اندر اختلاف اور انتشار پیدا ہوگیا تو دشمنوں پر ان کی دھاک بھی ختم ہوگئی۔ دشمن ان کے خلاف جری ہوگیے۔ اس کی ایک تاریخی مثال اسپین کا واقعہ ہے۔ اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ انہوں نے وہاں جدید سائنسی تمدن کی بنیاد رکھی۔ مگر بعد کو ان کے اندر اختلاف پیدا ہوگیا۔ صوبوں کے مسلم حکام مرکز کے خلاف بغاوتیں کرنے لگے۔ جو شخص جس علاقہ کا حاکم تھا اس نے چاہا کہ اس کو ایک آزاد سلطنت قرار دے کر اس کا خود مختار حکمراں بن جائے۔ اس طرح کے اختلافات کی بنا پر عیسائی ان کے خلاف جری ہوگیے۔ انہوں نے مسلم حکومت پر حملے شروع کر دیے۔ اس وقت مسلمانوں کا باہمی اختلاف اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مسلمان مرکزی خلافت کو ختم کرنے کے لیے عیسائیوں سے مل کر اس سے جنگ کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت ذلت کے ساتھ اسپین سے مسلمانوں کا وجود مٹا دیا گیا۔

اختلاف سب سے بڑا خطرہ

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے سورہ انعام آیت ۶۵ کی تفسیر کے تحت جو روایت نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

حضرت خباب بن ارت کہتے ہیں کہ میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

تھا جب کہ آپ نے ساری رات نماز پڑھی۔ یہاں تک کہ جب فجر کا وقت آگیا تو آپ نے سلام پھیر کر اپنی نماز ختم کی۔ میں نے کہا، اے خدا کے رسول آج کی رات آپ نے ایسی نماز پڑھی جیسی نماز پڑھتے ہوئے اس سے پہلے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، وہ ڈر اور اشتیاق کی نماز تھی۔ میں نے اس میں اپنے رب سے تین باتیں مانگیں۔ اس نے دو باتیں مجھ کو دے دیں اور ایک سے منع فرمایا۔ میں نے اپنے رب سے یہ مانگا کہ وہ ہم کو اس طرح ہلاک نہ کرے جس طرح پچھلی امتیں ہلاک کی گئیں۔ یہ اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہمارے اوپر باہر کے دشمن کو (کامل طور پر) مسلط نہ کرے۔ یہ بھی اس نے مجھ کو دے دیا۔ پھر میں نے اپنے رب سے مانگا کہ وہ ہم کو گروہوں میں نہ بانٹے۔ اس کی قبولیت سے اس نے انکار کر دیا۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اگر دوسری غلطیاں کریں تو اس کا امکان ہے کہ اللہ کی رحمت کی وجہ سے وہ اس کے برے انجام سے بچ جائیں لیکن اگر وہ باہمی اختلاف کر کے آپس میں لڑنے لگیں تو اس کے بُرے انجام سے وہ کسی حال میں بچ نہیں سکتے۔ مسلمانوں کو دوسرے معاملات میں خدا کی عصمت حاصل ہے۔ مگر اختلاف کے معاملہ میں انھیں خدا کی عصمت حاصل نہیں۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ جس معاملہ میں چوکنا رہنا ہے وہ آپس کا اختلاف اور آپس کا ٹکراؤ ہے۔ ہر اس چیز سے انھیں دور رہنا ہے جو باہمی اختلاف پیدا کرے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وقت ان کی عقل باہمی اختلاف والے کام کو اچھا بنا کر دکھائے تب بھی ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی عقل کو غلط سمجھیں اور باہمی اختلاف پیدا کرنے والی ہر بات سے کامل پرہیز کریں۔

مسلمان اگر ان چیزوں میں پڑیں جو آپس کا اختلاف پیدا کرنے والی ہیں تو دنیا میں بھی وہ اس کا سخت انجام بھگتیں گے اور اندیشہ ہے کہ آخرت میں بھی ان کو خدا کے غضب کا شکار ہونا پڑے۔

باہمی اختلاف ہر حال میں قابل ترک ہے خواہ کسی کے پاس اس کی بظاہر معقول وجہ کیوں نہ موجود ہو۔ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کا اصل مسئلہ صرف ایک ہے۔ اور وہ باہمی اختلاف ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس دین

کو اس حدتک قائم کر دیا ہے اور اس کو اتنا مستحکم بنا دیا ہے کہ اب اس کو کوئی بیرونی طاقت کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتی۔ اس کو جب بھی نقصان پہونچے گا اپنوں کے ذریعہ پہونچے گا۔ اور اپنوں کا یہ عمل وہی ہے جس کو اختلاف کہا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث میں باہمی لڑائی کو مطلق طور پر ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔ کثرت سے احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ اور حضرت عثمان کی شہادت کی صورت میں یہ مثال بھی قائم کر دی گئی ہے کہ مسلمان اگر تم کو قتل کرنے آجائیں تب بھی تم مسلمانوں سے جنگ نہ کرو۔

دین کا خلاصہ

صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ کی ایک روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ یرضٰی لکم ثلاثا۔ یرضٰی	اللہ تم سے تین باتوں پر راضی ہوگا۔ وہ تم سے اس
لکم اَن تعبدوہ ولا تشرکوا بہ	پر راضی ہوگا کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ
شیئًا۔	کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور یہ کہ تم سب کے سب
وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا	اللہ کی رسی میں بندھ جاؤ اور متفرق نہ ہو۔ اور یہ
ولا تفرقوا۔ وان تناصحوا مَن	کہ اللہ جس کو تمہارے معاملہ کا ذمہ دار بنا دے
ولّاہ اللہ امرکم۔	اس کی خیر خواہی کرو۔

یہ حدیث پورے دین کا خلاصہ ہے۔ اس حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تین باتیں بتائی گئی ہیں جن میں سے دو کا تعلق اتحاد سے ہے، ایک براہِ راست اور دوسری بالواسطہ۔

اس حدیث کے مطابق اللہ تعالیٰ کا پہلا مطالبہ ہم سے یہ ہے کہ ہم اللہ کے عبادت گزار بندے بنیں، اس کے سرکش اور غافل بندے نہ بنیں۔ ہم اسی کے آگے جھکنے والے ہوں اور اسی کی طرف دوڑنے والے ہوں۔

دوسری چیز یہ کہ سارے مسلمان ایک اللہ کی رسّی میں بندھ جائیں۔ یعنی دین کی مرکزی دعوت پر متحد ہو جائیں۔ وہ اس میں ذیلی اور ضمنی اختلافات نکال کر منتشر نہ ہوں۔ "خدا کی رسّی"

سے مراد خدا کی کتاب کی واضح تعلیمات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غیر خدا کی رسی یہ ہے کہ لوگ دین میں خود ساختہ مسئلے نکالیں اور ان پر الگ الگ ٹولیاں بنانے لگیں۔

تیسری چیز باہمی اتحاد قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی جس شخص کو اللہ سرداری کے مقام پر پہونچا دے، اس کی سرداری کو تمام مسلمان تسلیم کرلیں۔ وہ اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں نہ کہ اختلاف اور بغاوت کا۔ قائم شدہ اجتماعی نظام سے بغاوت مسلمانوں کے لیے کسی حال میں جائز نہیں۔ خواہ بظاہر بغاوت کرنے والوں کے پاس اس کی کتنی ہی خوبصورت تاویل کیوں نہ موجود ہو۔ قائم شدہ مسلم حکومت سے ٹکراؤ کرنا سراسر غیر دینی فعل ہے۔ اس کو دین کے نام پر کرنا اس کو جائز نہیں قرار دیتا۔

تاریخ میں مسلمانوں کے اندر جتنے بڑے بڑے باہمی اختلافات پیش آئے ہیں ان سب کے پیچھے یہی وجہ کارفرما رہی ہے۔ یعنی ایک قائم شدہ حکومت کو غیر صالح قرار دے کر اس کے خلاف تحریک چلانا۔ مسلمان اگر اس ہدایت کو پکڑ لیں اور قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف "اصلاح سیاست" کی مہم چلانا چھوڑ دیں تو بیشتر باہمی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ جس کام سے خدا اور رسول نے منع کیا ہو اس میں کبھی بھلائی نہیں ہو سکتی، خواہ بظاہر وہ ہم کو کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو۔ خواہ اس کے لیے ہم نے بطورِ خود کتنا ہی خوبصورت نظریہ گھڑ رکھا ہو۔

دینِ کامل

قرآن کی سورہ نمبر ۵ (المائدہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخر میں اتری۔ اس کے شروع میں کچھ قانونی احکام ہیں، اس کے بعد ارشاد ہوا ہے:

الیوم یئسَ الذین کفروا من دینِکُم فَلاتخشوهم واخشونِ۔ الیومَ اکملتُ لکم دینکم وَاتممتُ عَلیکم نِعمَتی ورضیت لکم الاسلَام دیناً

(المائدہ ۳)

آج انکار کرنے والے لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گیے، پس تم ان سے نہ ڈرو، تم صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی۔ اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

اس آیت میں دین کامل سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیروں میں دو قسم کے اقوال ہیں۔ (۱) دین مستحکم، (۲) دین مکمل۔ علامہ ابو البرکات النسفی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(الیوم یئس الذین کفروا من دینکم) یئسوا منه اَن یُبطلوه او یئسوا من دینکم ان یغلبوه لانّ اللّٰه تعالیٰ وفی بوعده من اظهاره علی الدین کلّه (فلاتخشوهم) بعد اظهار الدین وزوال الخوف من الکفار وانقلابهم مغلوبین بعد ما کانوا غالبین (واخشون) ای اخلصوا لی الخشیة (الیوم اکملتُ لکم دینکم) بان کفیتُم خوف عدوکم واظهرتکم علیهم، کما یقول الملوك: الیوم کمل لنا الملك ای کفینا

(آج منکرین تمہارے دین سے مایوس ہو گیے) یعنی وہ اس بات سے مایوس ہو گیے کہ وہ دین اسلام کو باطل کر سکیں۔ یا اس سے مایوس ہو گیے کہ وہ اس پر غالب آ جائیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام دینوں پر بالا کرنے کا اپنا وعدہ پورا کر دیا (پس ان سے نہ ڈرو) بعد اس کے کہ دین بالا ہو گیا اور منکرین کی طرف سے ڈر کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ مغلوب کر دیئے گیے، جب کہ اس سے پہلے وہ غالب تھے۔ (اور مجھ سے ڈرو) یعنی ڈر اور اندیشہ کو صرف میرے لیے خاص کر دو۔ (آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے

من كنّا نخافه ۔	لیے کامل کر دیا اس طرح کہ تمہارے دشمن کے خوف کے مقابلہ میں میں تمہارے لیے کافی ہوگیا۔ اور تم کو ان کے اوپر غالب کر دیا۔ جیسا کہ بادشاہ کہتے ہیں کہ آج ہمارا اقتدار کامل ہوگیا، یعنی جس سے اندیشہ تھا اس کے مقابلہ میں ہم کافی ہوگیے۔
تفسیر النسفی. الجزء الاول، صفحہ ۲۷۰	

ایک اور مفسر قاضی محمد ثناء العثمانی (م ۱۲۲۵ھ) مذکورہ آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں :

وقیل اظھرتُ دینکم علی الادیان کلّھا واٰمنتُکم من الاعداء	اور کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیا اور تم کو دشمنوں سے امن دے دیا۔

(التفسیر المظہری، المجلد الثالث، صفحہ ۲۵)

ایک حدیث

اکمال یا تکمیل کے معنی عربی زبان میں صرف گنتی پورا کرنے کے نہیں ہیں۔ اس سے مراد کسی بھی حقیقت کی تکمیل ہو سکتی ہے جو زیر بحث کلام میں مقصود ہو۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ :

مَن احبَّ للّٰہ وابغضَ لِلّٰہِ وَاعطی للّٰہِ ومَنَعَ للّٰہ فَقَدْ استکملَ الایمانَ (رواہ ابوداؤد)	جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔

اس حدیث میں ایمان کا کامل ہونا گنتی اور فہرست کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایمان کے ستّر سے زیادہ شعبے ہیں (الایمان بضع وسَبعُون شعبةً) اب اگر کامل ہونے کا تعلق گنتی اور فہرست سے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستّر سے زیادہ باتیں شمار کر کے فرمانا چاہیے تھا کہ جس شخص میں یہ تمام باتیں پائی جائیں اس کا ایمان کامل ہوگیا۔ مگر مذکورہ روایت میں صرف چار باتوں کو ایمان کامل کی پہچان بتایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس حدیث میں "استکمال ایمان" سے مراد تکمیل حقیقت ہے نہ کہ تکمیل فہرست۔ اسی طرح سورہ مائدہ (آیت ۳) میں بھی "اکمال دین" سے حقیقت دین کی تکمیل مراد ہے نہ کہ فہرستِ دین

کی تکمیل ۔

لغات عرب

عربی کے مشہور لغت لسان العرب میں " کمل " کی تشریح کے تحت کہا گیا ہے :

وقال الله تعالیٰ : الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی (الآیۃ) ومعناہ واللّٰہ اعلم ۔ الآن اکملت لکم الدین بان کفیتکم خوف عدوّکم واظہرتکم علیہم کما تقول الآن کُمل لنا الملك وکمل لنا ما نرید بان کفینا من کنا نخافہ

لسان العرب لابن منظور ، طبع بیروت

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا : آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی ۔ اس کا مطلب ، اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے ، یہ ہے کہ اب میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اس طرح کہ تمہارے دشمن کے لیے میں تمہاری طرف سے کافی ہو گیا اور تم کو ان کے اوپر غالب کر دیا ۔ جس طرح تم کہتے ہو کہ اب ہمارا اقتدار کامل ہو گیا ۔ اور جو ہم چاہتے تھے وہ پورا ہو گیا کیوں کہ جن سے ہمیں خوف تھا ان کے لیے ہم کافی ہو گیے ۔

آیت میں " تمہارا دین " کا لفظ بتاتا ہے کہ یہاں از اول تا آخر تمام پیغمبروں کی نسبت سے مطلق تکمیلِ دین کا ذکر نہیں ہے ، بلکہ یہاں صرف اہل اسلام کی نسبت سے تکمیلِ دین کا ذکر ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا دین (قرآن) جو ابتداءً غار حرا سے اترنا شروع ہوا تھا ، وہ ۲۳ سال تک اترتے اترتے اب میدانِ عرفات میں آخری طور پر مکمل ہو گیا ۔ اب یہ کتاب پوری ہو گئی ، اب اس میں کوئی مزید اضافہ ہونے والا نہیں ۔

آیت میں جس کمال یا غلبہ کا ذکر ہے ، اس سے مراد محض سیاسی معنوں میں عرب میں ہونے والا غلبہ نہیں ہے بلکہ عالمی حالات میں پیش آنے والی وہ تبدیلی ہے جس نے ہمیشہ کے لیے اسلام کو محفوظ کر دیا ، اور اس کو فکری حیثیت سے ایک برتر دین بنا دیا ۔ اس سے مراد محدود طور پر ملک عرب میں حکومت قائم ہونا نہیں ، بلکہ اس سے مراد عالمی حالات میں برپا ہونے والی وہ دور رس تبدیلیاں ہیں جو خدا کے دین کے حق میں استحکام کی ابدی ضمانت بن چکی ہیں ۔

سیاق کلام

سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں دین کی تکمیل کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ فہرستِ احکام کے اعتبار سے دین مکمل ہو گیا۔ کیوں کہ آیت میں عمل تکمیل کا جو فائدہ بتایا گیا ہے، اس کا فہرستِ احکام سے کوئی تعلق نہیں۔ آیت کے مطابق دین کی تکمیل کا فائدہ یہ ہے کہ اب "خشیت" کا تعلق انسانوں سے نہ رہا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہو گیا۔ جہاں تک فہرستِ احکام کا تعلق ہے، وہ نازل ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے، باعتبار فہرست اس میں کوئی کمی ہونے والی نہیں۔ اب کمی کا امکان جس چیز میں ہے، وہ خشیت الٰہی میں ہے نہ کہ فہرستِ احکام میں۔

آیت کہتی ہے کہ دین کامل ہونے کے بعد اب اہل کفر کی طرف سے تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ جو کچھ ہے وہ اس میں ہے کہ خدا کے معاملہ میں تم بے خوف ہو جاؤ اور دین کے تقاضے پورے کرنے میں کوتاہی کرو۔ آیت کا یہ سیاق بتاتا ہے کہ یہاں دینِ کامل سے مراد دینِ مستحکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے اسلام کو دینِ مستحکم کی حیثیت دیدی ہے۔ اب اغیار اس کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ البتہ اگر خود مسلمان ہی اپنی غفلت اور سرکشی سے اس کے استحکام کو توڑیں تو الگ بات ہے۔

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ------- یہ اندازِ کلام بتاتا ہے کہ یہاں تکمیل باعتبار اعتدارِ کفار مراد ہے۔ قدیم زمانہ میں دین کے لیے اہل کفر کی طرف سے تعدی کا خطرہ رہتا تھا، اب دین کے ساتھ وہ حالات جمع کر دیئے گئے کہ اس قسم کا اندیشہ اس کے لیے باقی نہ رہا۔

ایک شخص کو فارسٹر (افسر جنگلات) کے عہدہ پر مقرر کیا جائے اور اس کو اسلحہ کے بغیر جنگل کے علاقہ میں بھیجا جائے تو ابتدائی حالت میں وہ جنگلی جانوروں کے حملہ کی زد میں رہے گا۔ مگر اس کے بعد جب اس کو ضروری اسلحہ دیدیا جائے تو گویا اس کا معاملہ مکمل ہو گیا، اب وہ پوری طرح فارسٹری کی ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔

اس مثال سے "دین کامل" کا مطلب پوری طرح واضح ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کا قافلہ پہلے اگر خشیت انسانی کے دور سے گزر رہا تھا تو اب وہ خشیتِ خداوندی کے دور میں داخل کر دیا گیا۔ پہلے مخالفین دین، اہل دین کو نقصان پہونچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اب ان

کے لیے اس کا موقع باقی نہ رہا۔ اب اندیشہ کی بات صرف یہ ہے کہ اہل دین خود کوئی کوتاہی کریں اور اس کی وجہ سے خدا کی پکڑ میں مبتلا ہو جائیں۔

پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ جو انقلاب لایا گیا ہے اس کے بعد اب خدا کا دین ہمیشہ کے لیے قائم اور مستحکم ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے اب ایسا کر دیا ہے کہ دعوتِ توحید کے ساتھ ایسے مزید معاون اسباب جمع کر دیئے ہیں جس کے بعد یہ دعوت منکرین کی دسترس سے باہر جا چکی ہے، اب وہ اس کے لیے کوئی حقیقی مسئلہ بننے کی طاقت کھو چکے ہیں۔ اسلام کے اس کی اصل صورت میں محفوظ ہونے کی بنا پر اس کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ جو شخص اسلام پر کھڑا ہو گا وہ یقینی طور پر کامل حق پر کھڑا ہو گا۔ اور جو شخص کامل حق پر کھڑا ہو۔ اس کے لیے کامیابی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب محمدی دو مذہبی دوروں کے درمیان حدفاصل ہے۔ اس انقلاب نے مذہب حق کے لیے اندیشہ کا دور ختم کر دیا۔ اس سے پہلے منکرین حق کی طرف سے ڈر لگا رہتا تھا۔ مگر اب اہل حق کو صرف خدا سے ڈرنا ہے۔ انھیں اب منکرین حق سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ نئے دور میں اہل حق کو اپنا جو حصہ ادا کرنا ہے اس کو وہ کسی اندیشہ کا لحاظ کیے بغیر ادا کرتے رہیں۔ وہ ہمیشہ صرف داعی حق بنے رہیں۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو وہ اپنے عمل کی بنیاد نہ بنائیں۔ وہ مدعو سے یک طرفہ طور پر اعراض کریں وہ ہرگز ان سے ٹکراؤ کی فضا نہ قائم ہونے دیں۔ وہ دوسری قوموں سے ہمیشہ مدعو کا معاملہ کریں نہ کہ حریف اور رقیب کا۔ یہی سب اللہ سے ڈرنا ہے۔ مسلمان اگر اس "ڈر" کے تقاضے پورا کرتے رہیں تو منکرین حق کی کوئی بھی سازش یا دشمنی انھیں ہرگز نقصان نہیں پہونچا سکتی۔

ایک مثال

۱۸ویں صدی میں پورے یورپ میں بادشاہی نظام قائم تھا۔ اس وقت مختلف مفکرین کی تحریروں کے زیر اثر جمہوریت کی تحریک اٹھی۔ انھیں میں سے ایک ممتاز نام فرانس کے جے جے روسو (۱۷۱۲–۱۷۷۸) کا ہے۔ اس کی مشہور کتاب معاہدۂ عمرانی (Social Contract) نے فرانس کے لوگوں پر گہرا اثر ڈالا۔ اس کتاب میں شخصی بادشاہت کے مقابلہ میں عوامی جمہوریت کی وکالت کی گئی تھی۔ مگر

وقت کا بادشاہی نظام اس کا سخت مخالف ہوگیا۔ یہاں تک کہ روسو کو اپنا وطن چھوڑ کر سوئزرلینڈ بھاگ جانا پڑا۔ مگر سوئزرلینڈ میں بھی اس کو سکون حاصل نہ ہو سکا۔ وہ نام بدل کر دوبارہ فرانس واپس آیا۔ یہاں وہ بے کسی کی حالت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہا۔ اس کی بیوی پاگل ہوگئی اور خود روسو کا یہ انجام ہوا کہ وہ مایوسی کے عالم میں ۲ جولائی ۱۷۷۸ کو انتقال کر گیا۔

روسو اور دوسرے مفکرین کی تحریروں کے نتیجہ میں فرانس میں جمہوریت کی تحریک اٹھی۔ اس وقت فرانس کا آخری بادشاہ لوئی (Louis XVI) وہاں کا حکمراں تھا۔ اس نے جمہوری تحریک کی سخت مخالفت کی۔ بادشاہ اور عوام کی اس جنگ میں تقریباً ۳۵ ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔ بہت سے لوگوں کو ملک چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ یہاں تک کہ ۱۷۸۹ میں فرانس کا جمہوری انقلاب آیا۔ اور پھر سارے یورپ میں چھا گیا۔

دو سو سال پہلے جمہوریت صرف ایک نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس وقت اس کو سخت اجنبیت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آج جمہوریت ایک قائم شدہ حقیقت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ پھیل رہی ہے۔ جب کوئی "دین" قائم شدہ دین کی حیثیت اختیار کر لے تو اس کا حال یہی ہوتا ہے۔ اب وہ اپنے آپ میں ایک طاقت بن جاتا ہے۔ اب وہ خود بخود پھیلتا ہے، خواہ اس کو پھیلانے کی کوشش کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔

یہی معاملہ اسلام کا ہے۔ مکی دور میں اسلام کی حیثیت ایک نظری صداقت کی تھی۔ اس وقت وہ قائم شدہ دین نہیں بنا تھا۔ اسی لیے مکی دور میں اسلام کو سخت مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر آج اسلام ایک قائم شدہ دین بن چکا ہے۔ اس کی کتاب ایک محفوظ کتاب ہے۔ وہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک ارب تک پہونچ چکی ہے۔ اس قسم کے حقائق نے اسلام کو اب ایک قائم شدہ دین کی حیثیت دیدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ پھیل رہا ہے، وہ اپنے آپ لوگوں کو مسخر کر رہا ہے۔ یہ عمل صدیوں سے تمام دنیا میں جاری ہے۔

دعوتِ دین، اظہارِ دین

اسلام میں دو اصطلاحیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے، دعوت دین۔ اور دوسری ہے اظہارِ دین۔ دعوتِ دین ایک عام حکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور کے لوگوں کو خدا کے

دین سے آگاہ کیا جائے اور اس کو اتمام حجت کے مرحلہ تک پہونچا دیا جائے۔ دعوت کا یہ عمل تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں کیا۔ اب امت محمدی کو یہ عمل قیامت تک پیدا ہونے والی تمام نسلوں کے سامنے انجام دینا ہے۔

اظہارِ دین کا مطلب حکومت یا قانون کا نفاذ نہیں ہے۔ یہ ایک خصوصی اور استثنائی معاملہ ہے جس کا تعلق خاتم النبیین سے تھا۔ آپ کے ظہور سے پہلے اسلام یا توحید کو صرف ایک نظری حقیقت کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ فکری اور نظریاتی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہونچی تھی۔ یعنی دین توحید کے ساتھ بھی تقریباً وہی صورت قائم تھی جس کا ذکر دین جمہوریت کے سلسلہ میں اوپر کیا گیا ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی خصوصی مدد سے ایسا کیا کہ توحید کی دعوت کو نظری حقیقت کے مرحلہ سے آگے بڑھا کر فکری انقلاب کے مرحلہ تک پہونچا دیا۔

اظہارِ دین حقیقۃً اسی واقعہ کا نام ہے جس کو دوسری جگہ اکمال دین (المائدہ ۳) کہا گیا ہے۔ یہ کام پیغمبر آخر الزماںؐ اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ آخری طور پر انجام پا چکا اب ہمارا کام یہ ہے کہ نئے پیدا شدہ موافق حالات کو استعمال کر کے خدا کے پیغام کو خدا کے تمام بندوں تک پہونچا دیں۔

ابدی تکمیل

آیت تکمیل کا ایک وقتی مفہوم ہے اور ایک اس کا ابدی مفہوم ہے۔ وقتی اور فوری اعتبار سے اس کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب میں آپ کی دعوت توحید کے خلاف جو شدید مزاحمت ظاہر ہوئی تھی، نبوت کے ۲۳ ویں سال میں اس کا زور بالکل ٹوٹ گیا۔ اب شرک آخری طور پر مغلوب ہو گیا اور توحید کے لیے فتح آخری طور پر مقدر ہو گئی۔

مگر قرآن ایک دائمی کتاب ہے جو قیامت تک رہنے والی ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ ان الفاظ میں گویا خدا ماضی سے لے کر مستقبل تک کی پوری انسانیت کو خطاب فرما رہا ہے۔ وہ ابدی پس منظر میں اپنا ایک بیان دے رہا ہے۔

قرآن میں جو دعوت توحید ہے، وہی پچھلے تمام پیغمبروں کی دعوت بھی تھی۔ جس طرح پیغمبر اسلامؐ کی مزاحمت کی گئی، اسی طرح ہر پیغمبر کی مزاحمت کی گئی۔ اس مزاحمت میں منکرین حق کو یہ کامیابی ہوئی کہ انھوں نے دعوتِ توحید کی تاریخ بننے نہیں دی۔ چنانچہ قرآن سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں آئیں،

سب معدوم یا غیر محفوظ ہوگئیں۔ خدا کا تصور صحیح صورت میں باقی نہ رہا۔ انسانی تاریخ سے تمام پیغمبروں کا نام حذف کر دیا گیا۔

اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت (۳) کو پڑھیے تو محسوس ہوگا گویا ہزاروں برس کے درمیان پیدا ہونے والے حق دشمنوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ اب ان کے لیے یہ موقع ختم ہوگیا کہ حق کے خلاف اپنے منفی عزائم کو پورا کر سکیں۔ اب دعوت توحید کی تاریخ ایک نئے مرحلہ میں داخل ہوچکی ہے جب کہ چاہنے کے باوجود وہ اس کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہونچا سکیں گے۔ اب غلبہ ابدی طور پر دعوتِ حق کے لیے مقدر ہوچکا ہے۔ اب اہل توحید کو اگر کوئی نقصان پیش آئے گا تو خود اپنی کوتاہی سے پیش آئے گا، دشمنانِ حق کے منصوبے اور ان کی مخالفانہ کارروائیاں انھیں ہرگز کوئی نقصان پہونچانے والی نہیں۔

فتنہ کا خاتمہ

قرآن میں کہا گیا ہے کہ — ہلاک ہوگیے خندق والے جس میں بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے اس کو وہ دیکھ رہے تھے۔ اور ان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی اور وجہ سے نہ تھی کہ وہ لوگ ایمان لائے تھے اللہ پر جو زبردست ہے، تعریف والا ہے۔ اس کی بادشاہی آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے (البروج ۴-۹)

اسی طرح حدیث میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے زمانوں میں توحید کے داعی کے ساتھ یہ صورت پیش آتی تھی کہ جب وہ لوگوں کو ایک اللہ کی پرستش کی طرف بلاتا تو اس کو سخت عذاب دیا جاتا۔ حتی کہ گڑھا کھود کر اس کا آدھا جسم زمین میں گاڑا جاتا اور اس کے بعد اس کے سر کے اوپر سے آرا چلا دیا جاتا۔ یہاں تک کہ اس کا جسم دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جاتا۔

یہ ایک یا دو شخص کی بات نہیں، یہ پورے ایک دور کی بات ہے۔ اس میں اس قدیم انسانی دور کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام ؐ سے پہلے ساری دنیا میں رائج تھا۔ اس زمانہ میں مذہبی جبر کا قانون تمام حکومتوں کے نزدیک مسلم تھا۔ ہر صاحب اقتدار کو یہ حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ لوگوں کو بزور اپنا ہم مذہب بنائے۔ اور جو لوگ سرکاری مذہب سے الگ کوئی مذہب اختیار کریں ان پر ہر قسم کا ظلم

کرے یہاں تک کہ انہیں مٹا دے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کے ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اور ان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی اور وجہ سے نہ تھی کہ وہ ایک اللہ پر ایمان لائے (البروج ۸)

قدیم زمانہ میں وہ چیز ساری دنیا میں رائج تھی جس کو عام طور پر مذہبی عذاب رسانی (Religious persecution) کہا جاتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں تعذیب (Persecution) کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ ہے جو اس کے تقریباً ۳۰ صفحات میں پھیلا ہوا ہے اس مقالہ میں قدیم تاریخ کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ قدیم انسانی سماج بنیادی طور پر مذہب کے معاملہ میں بے برداشت تھا :

Ancient society was essentially intolerant (p.743).

مذہبی جبر یا مذہبی تعذیب کے اس رواج نے قدیم زمانہ میں مذہبی آزادی کو مکمل طور پر ختم کر رکھا تھا۔ مذہبی تبلیغ کے لیے حالات اس قدر حوصلہ شکن تھے کہ سرکاری مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی دعوت لے کر اٹھنا اپنے آپ کو آگ کے گڑھے میں ڈالنے یا آرا کے نیچے کھڑا ہونے کے ہم معنی تھا۔ اس قدیم رواج کے بنا پر قدیم زمانہ میں ایسا ہوا کہ توحید کی دعوت ابتدائی مرحلہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ توحید کے داعیوں کا اس طرح استیصال کیا گیا کہ نہ ان کی کتابیں محفوظ رہیں اور نہ ان کی شخصیتیں مدون تاریخ میں درج ہو سکیں۔

مذہبی تعذیب کا یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب کہ خاتم النبیین کی بعثت عرب میں ہوئی۔ مخصوص مصالح کی بنا پر اللہ تعالےٰ نے آپ کے ذمہ یہ کام کیا کہ آپ اللہ کی مدد سے تعذیب مذہب کے اس دور کو ختم کر دیں، خواہ اس کے لیے ظلم کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنی پڑے۔ یہی وہ حکم ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں دیا گیا ہے : اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے (الانفال ۳۹)

فتنہ کے معنی وہی ہیں جس کو انگریزی میں Persecution کہتے ہیں۔ اس آیت میں فتنہ کو ختم کرنے سے مراد مذہبی تعذیب کو ختم کرنا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے اس کے مطابق دعوت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ آپ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہ بھی تھا کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ (لا اکراہ فی الدین) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر دین صحیح ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دین والے کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ جس دین کو چاہے اختیار کرے۔ نیز یہ کہ اگر وہ اپنے آبائی دین پر مطمئن

نہ ہو تو وہ اس کے لیے بھی آزاد ہے کہ اپنے قدیم دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لے۔

پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے اصحاب نے ایک طرف لوگوں کو اس دین توحید کی دعوت دی جس کو وہ حق سمجھتے تھے اور دوسری طرف اس نظام کو عملی طور پر ختم کرنے کی جدوجہد کی جو مذہبی جبر کے اصول پر قائم تھا۔ اس کے نتیجہ میں اس وقت کے حاکموں اور فرمانرواؤں سے آپ کا ٹکراؤ ہوا۔ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے دفاع میں لڑائیاں لڑیں۔ چوں کہ اس معاملہ میں آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل تھی، آپ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایشیا اور افریقہ کی وہ بڑی بڑی شہنشاہیتیں مٹ گئیں۔ جنھوں نے مذہبی جبر کے اوپر اپنا اقتدار قائم رکھا تھا۔

تاریخ انسانی میں اس انقلاب کو مورخین نے مختلف انداز سے تسلیم کیا ہے۔ فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے اس کو قدیم وجدید کے درمیان بنیادی انفصال (Essential break) اور مطلق العنان بادشاہت (Emperical absolutism) کے خاتمہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے اس انقلابی واقعہ کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اسلام نے زمین کی صورت کو بدل دیا۔ تاریخ کا روایتی نظام اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔

> Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اس انقلابی تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنایا کہ دین حق کی دعوت کا وہ کام آزادانہ ماحول میں ہونے لگے جو پہلے صرف تشدد اور جارحیت کے ماحول میں انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ یہ تکمیل دین کا نہایت اہم پہلو ہے جس کو قرآن میں فتنہ کو ختم کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے انسانی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا وہ اتنا عظیم اور ہمہ گیر تھا کہ وہ خود تاریخ میں شامل ہو گیا۔ وہ انسانی فکر اور انسانی تحریکات کا ایک موثر عنصر بن گیا۔ چنانچہ اس کے بعد انسانی تاریخ اسی رُخ پر سفر کرنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ دور آگیا جب کہ مذہبی آزادی کو عالمی طور پر ایک مسلّمہ حق کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ وہ تہذیب جدید کی نظریاتی بنیاد قرار پائی اور اقوام متحدہ کے منشور کے تحت تمام دنیا کی قوموں نے اس پر اپنا دستخط ثبت کر دیا۔ اب مذہبی آزادی ایک ایسا مانا ہوا حق ہے جس کا انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

تشدد غیر موثر

بیسویں صدی کے ربع آخر کے واقعات مزید یہ بتاتے ہیں کہ انسانی تاریخ سفر کرتے کرتے اب ایک ایسے دور میں داخل ہوگئی ہے جب کہ تشدد عملی طور پر غیر موثر حیثیت کے درجہ پر پہونچ گیا ہے۔ اب سیاسی اور فوجی طاقت کی وہ سابقہ نوعیت ہی ختم ہوگئی ہے جو پہلے اسے حاصل تھی۔

اب فوجی طاقت، ایک فیصلہ کن طاقت کی حیثیت سے، کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس اعتبار سے دوسری عالمی جنگ تاریخ انسانی کی آخری جنگ تھی۔ اب انسانی دنیا کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ جنگ سے کوئی فیصلہ ہونے والا نہیں۔

ویت نام کی جنگ تقریباً گیارہ سال (۱۹۶۵-۱۹۷۵) تک جاری رہی۔ مگر امریکہ اپنی زبردست فوجی طاقت کے استعمال کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا اور یک طرفہ طور پر وہاں سے واپس چلا آیا۔ سوویت روس نے دسمبر ۱۹۷۹ میں افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اس کی فوجیں ہر قسم کے جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر ۹ سال تک سارے ملک میں تباہی و بربادی مچاتی رہیں۔ مگر انھیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ سوویت روس نے ۱۹۸۸ میں یک طرفہ طور پر اپنی فوجوں کو افغانستان سے واپس بلا لیا۔ عراق اور ایران کے درمیان ۱۹۸۰ میں جنگ شروع ہوئی۔ ۸ سال تک وہ پوری خوفناکی کے ساتھ جاری رہی جس میں دونوں طرف کے تقریباً دس لاکھ آدمی ہلاک ہوگیے۔ بے شمار بلین ڈالر خرچ ہوئے۔ مگر دونوں میں سے کوئی ملک ایک فیصد کے بقدر بھی کوئی فائدہ حاصل نہ کرسکا یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں دونوں کو راضی ہونا پڑا کہ وہ اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس چلے جائیں اور جنگ کو ختم کر دیں۔

زمانہ جدید کو سمجھنے کے لیے ایک بڑی سبق آموز مثال جاپان کی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اور جاپان کے درمیان جنگ ہوئی جس میں فوجی اعتبار سے امریکہ فتح یاب ہوا اور جاپان کو جنگ کے میدان میں مکمل شکست ہوئی۔ اب جاپان کے لیے سیاسی اور فوجی میدان میں کچھ کرنے کا موقع باقی نہ رہا تھا۔ اس نے سائنسی اور اقتصادی میدان میں اپنی ساری توجہ لگا دی۔ اس کی یہ کوشش اتنی کامیاب رہی کہ ۴۰ سال کے اندر خود تاریخ بدل گئی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ امریکی میگزین ٹائم (۴ جولائی ۱۹۸۸) نے ایک مفصل آرٹیکل شائع کیا جس کا عنوان تھا سپر جاپان (Super Japan) اس میں اس نے دکھایا کہ جاپان کی

اقتصادی ترقی نے امریکہ کو اب اقتصادی اعتبار سے نمبر ۲ کی طاقت بنا دیا ہے۔ تمام اقتصادی میدانوں میں جاپان کے مقابلہ میں امریکہ اب دفاعی پوزیشن میں چلا گیا ہے۔ اس آرٹیکل کو پڑھنے کے بعد ایک امریکی برائن مرسکی (Brian Mirsky) نے ٹائم کو ایک خط لکھا جو اس کے شمارہ ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ میں چھپا ہے۔ یہ خط مختصر ہونے کے باوجود انتہائی عبرت ناک ہے۔ اس نے لکھا کہ امریکہ نے اگرچہ جنگ جیتی تھی مگر جاپان امن جیت گیا:

> Your article on Japan's economic success makes it obvious that although the U.S. won the war, Japan won the peace (p.2).

تیسیر کا معاملہ

فتنہ (Persecution) کے خاتمہ سے دعوت کے حق میں جو نئے موافق حالات پیدا ہوئے ہیں، اس کو قرآن میں تیسیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کی ایک مکی سورہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہم تم کو آسان راستہ کی طرف لے چلیں گے، پس لوگوں کو نصیحت کرو، اگر انھیں نصیحت فائدہ پہنچائے (الاعلیٰ ۸-۹) اسی طرح قرآن میں صحابہ کرام کو یہ دعا سکھائی گئی کہ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا تھا (البقرہ ۲۸۶) قدیم طرز کے مذہبی جبر کا خاتمہ اسی وعدہ الٰہی کی تکمیل اور اسی دعا صحابہ کا پورا ہونا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دعوتی ذمہ داری کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف تفویض کا معاملہ نہیں فرمایا، بلکہ تیسیر کا معاملہ بھی فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کہ بس ایک ذمہ داری ہمارے حوالے کر کے خود الگ ہو کر مشاہد بن جائے۔ بلکہ اس کام میں وہ خود ہمارے مددگار کے طور پر شریک ہے۔ اس نے ہر قسم کے موافق اسباب ہمارے حق میں جمع کر دیئے ہیں تاکہ یہ کام کرنا ہمارے لیے آخری حد تک آسان ہو جائے۔ حتیٰ کہ اس کام میں ہمارے لیے آسانی پیدا کرنے کی خاطر اس نے خود تاریخ انسانی کو بدل دیا۔

اتمام حجت

دعوت الی اللہ کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں، اس کا براہ راست تعلق خدا کے تخلیقی منصوبے (Creation plan) سے ہے۔ اس طرح اس کی اہمیت صرف بندہ کے اعتبار سے نہیں رہتی بلکہ خود خدا کے اعتبار سے اس کی اہمیت ہو جاتی ہے۔

موجودہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے موت اور زندگی

کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرنے والا ہے (۷۶ : ۲) تخلیقی منصوبہ کی یہ نوعیت لازمی طور پر چاہتی ہے کہ انسان کو اس سے پوری طرح باخبر کر دیا جائے تاکہ قیامت میں جب تمام لوگ حساب کے لیے جمع کیے جائیں تو کسی کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ ہم سے ایک ایسی بات پر باز پرس کی جا رہی ہے جس کے بارہ میں ہمیں پہلے سے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

اگر لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حجت لوگوں پر نہ رہی بلکہ حجت اللہ کی طرف چلی گئی۔ یہی خاص مقصد ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی و رسالت کا نظام قائم کیا۔ کچھ لوگوں کو منتخب کرکے انھیں اپنا مستند نمائندہ مقرر کیا اور انھیں خصوصی ذرائع سے حقیقت کا علم دیا اور ان کی یہ لازمی ذمہ داری قرار پائی کہ وہ تمام لوگوں کو حقیقت واقعہ سے باخبر کر دیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے : اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے (۴ : ۱۶۵)

پیغمبر کے بعد عین یہی ذمہ داری اب پیغمبر کے پیروؤں پر ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان کا اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ پیغام رسانی کے اس کام کو ہر دور میں لے کر اٹھیں اور اس کے تمام آداب و شرائط کے ساتھ دعوت کا کام کرکے اقوام عالم پر خدا کی حجت تمام کریں۔ اسی کو قرآن میں دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ـــــــ اور تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنے اور تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو (۲۲ : ۸۷)

یہ کام وہ ہے جو خود خدا کو مطلوب ہے، اس لیے جو لوگ اس کام کے لیے اٹھیں ان کے لیے اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ خدا کی طاقتیں ان کا ساتھ دیں گی۔ یہی بات ہے جو مذکورہ آیت کے ان لفظوں میں کہی گئی ہے : وكان الله عزيزاً حكيمًا (النساء ۱۶۵)

دعوت سے حفاظت

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم داعی الی اللہ (۳۳ : ۴۶) بنا کر بھیجے گیے تھے، یہی آپ کی اصل حیثیت تھی۔ آپ کا مشن یہ تھا کہ قرآن کے پیغام توحید کو تمام انسانوں تک پہنچا دیں۔ بقیہ تمام چیزوں کا انحصار اسی ایک چیز کے اوپر تھا۔ اگر آپ یہ کام مکمل طور پر کر دیں تو بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ خدا کی طرف سے دیدی جائیں گی۔ اور اگر یہ کام انجام نہ پائے تو بقیہ چیزیں بھی ملنے والی نہیں۔

کسی شخص یا گروہ کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت حفاظت اور بچاؤ کی ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر مخالفوں کی جارحیت اور دشمنوں کے مخالفانہ منصوبے کو اپنا مسئلہ نمبر ایک سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف جدوجہد کو اپنے لیے سب سے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ مگر قرآن میں پیغمبر کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے کہ اس قسم کے مسائل پر الگ سے طاقت خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم دعوت کا کام کرو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ تمہارے حفاظتی مسائل اپنے آپ حل ہوتے چلے جائیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کی حسب ذیل آیت بہت زیادہ قابل غور ہے :

> اے رسول، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے، اس کو پہنچا دو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہونچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ بے شک اللہ منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا (۵ : ۶۷)

اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عصمت من الناس جیسے مسئلہ کا راز بھی تبلیغ ما انزل اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ نہ صرف عام حالات میں ہمارے لیے پیغمبر کا اسوہ یہ ہے کہ ہم یکسوئی کے ساتھ اللہ کے پیغام کی پیغام رسانی میں لگے رہیں بلکہ ہنگامی حالات میں، جب کہ دشمنوں کی طرف سے ہمارا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہو جب کہ تحفظ اور دفاع کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس وقت بھی اسی سنت نبوی (دعوت الی اللہ) کے محاذ پر اپنی کوشش صرف کرتے رہیں۔ کیوں کہ دوسری جو چیزیں ہم چاہتے ہیں، اس کے دروازے بھی اسی جدوجہد سے کھلیں گے۔

فطری مذہب

مسٹر عبد الاحد عمر ایک نومسلم ہیں جو ٹورانٹو (کناڈا) میں رہتے ہیں۔ پہلے ان کا نام گاری ملر (Garry Miller) تھا اور وہ بائبل ٹیچر تھے۔ ۱۹۷۸ میں انھوں نے اتفاقی طور پر قرآن کو پڑھا وہ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا :

> He likes to call himself a "revert" to Islam. "I haven't converted to Islam but merely reverted to my birthright *deen* (religion). The Prophet said, every child is born a Muslim.
> (*Muslim Journal*, Chicago. June 21, 1985)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے، اور اسی فطرت پر تمام انسانوں کو پیدا کیا گیا

ہے (۳۰ : ۳۰) اب ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر خدائی مذہب کے طالب ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ دوسرے پیغمبروں کے ذریعہ جو خدائی ہدایت نامہ بھیجا گیا وہ سب کا سب محرّف ہو چکا ہے اور اب آسمان کے نیچے صرف اسلام ہی وہ واحد خدائی ہدایت نامہ ہے جو اپنی اصلی اور ابتدائی شکل میں کامل طور پر محفوظ ہے۔ اس طرح تمام طالبان مذہب کے لیے، اور ہر شخص پیدائشی طور پر طالب مذہب ہے، اس کے سوا کوئی Choice باقی نہیں رہا ہے کہ وہ اپنی فطری طلب کی تکمیل کے لیے اسلام کو اختیار کرے۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کی سب سے یقینی بنیاد Monopoly ہے۔ اور مذہب اور آسمانی کتاب کے معاملہ میں اسلام کو یہی Monopoly حاصل ہے۔ یہ اسلامی دعوت کا ایک ایسا ایڈوانٹج ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔

تاریخی مسلّمہ

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا حیدرآباد (ہندستان) کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۴ میں اسلام قبول کر لیا اور اپنا نیا نام محمد عزیز الدین رکھا۔ انھوں نے ۲۶ اگست ۱۹۰۴ کو حیدرآباد میں ایک لکچر دیا تھا جس کا عنوان تھا:

Why Have I Accepted Islam

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا کئی ملکی اور انٹرنیشنل زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے اپنے لکچر میں بتایا کہ وہ ہندو ازم کے ماحول میں پیدا ہوئے، مگر انھیں بچپن ہی سے اس مشرکانہ مذہب پر اطمینان نہ تھا۔ تعلیم کے حصول کے بعد انھوں نے سچے مذہب (True faith) کی تلاش شروع کی۔ انھوں نے تمام معروف مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دنیا کے مختلف ملکوں کے طویل دورے بھی کیے۔

مگر ان کا علمی ذہن ہر مذہب اور فلسفہ کو رد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام تک پہونچے۔ اسلام انھیں علمی معیار کے مطابق نظر آیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیا کو اسلام کے جن پہلوؤں نے خاص طور پر متاثر کیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ یہ مکمل طور پر ایک تاریخی مذہب ہے۔ اس کی ہر بات تاریخی طور پر معلوم اور مسلّم ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> In the Prophet of Islam there is nothing vague and shadowy, mythical or mysterious, as, for instance, in Zoroaster and Sreekrishna, or even in Buddha and Christ. The very existence of those Prophets has been seriously doubted and even totally denied; but nobody, as far as I am aware, has ever ventured to reduce the Prophet of Islam either into a "Solar myth" or into a "fairy tale" as some eminent Savants of Europe have done with Buddha and Christ. Oh! what a relief to find, after all, a truly historical Prophet to believe in!

تمام موجودہ مذاہب ماضی میں پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے ان کی صحت و واقعیت کو جج کرنے کا پہلا معیار صرف تاریخی معیار ہے۔ آج کا انسان کسی مذہب کو اختیار کرنے کے لیے سب سے پہلے اس کا تاریخی جائزہ لینا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ ان مذاہب کو تاریخ کے معیار پر جج کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو تاریخ کے مسلمہ معیار پر پورا اترتا ہے۔ اس کے سوا جو مذاہب ہیں وہ سب کے سب غیر تاریخی ہیں۔ اور اس بنا پر وہ قابل تسلیم نہیں ہو سکتے۔ ایک صحیح علمی ذوق رکھنے والے آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اسلام کو اختیار کر لے۔ کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور مذہب تاریخی طور پر معتبر نہیں۔

علمی تائید

اسلام کو استحکام عطا کرنے والی باتوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے حقائق معلوم ہوئے، وہ مکمل طور پر اسلام کی تصدیق بن گئے۔ اسلام ایک ایسے دور میں آیا جب کہ نئے حقائق ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں نئے حقائق کا اسلام کی تعلیمات سے نہ ٹکرانا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عالم الغیب کا بھیجا ہوا کلام ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان کے بیانات بعد کی دریافتوں سے ٹکرا گیے، اس طرح ثابت ہوا کہ وہ یا تو عالم الغیب خدا کا کلام نہیں، یا اس میں خدائی کلام کے ساتھ انسانی کلام کی آمیزش ہو گئی ہے۔ اور دونوں حالتوں میں وہ غیر معتبر ہے۔ یہاں اس کی ایک تقابلی مثال درج کی جاتی ہے۔

بائبل میں زمین کی پیدائش کا اور اس کے اوپر آدم کی آبادکاری کا ذکر دنوں اور سالوں کے تعین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آدم کے بعد سے لے کر موسیٰ تک کی تمام نسلوں کا ذکر ان کی عمر کی قید کے ساتھ نام بنام موجود ہے۔ ان تفصیلات اور اعداد کو لے کر علماء بائبل نے زمین اور انسانی نسلوں کی پوری عمر متعین کرنے

کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ میں جو عبرانی کیلنڈر (Hebraic calender) شائع کیا گیا۔ اس کے مطابق ۱۹۷۵ تک زمین کی عمر ۵۷۳۶ سال تھی۔

جب تک جدید سائنس کا ظہور نہیں ہوا تھا اور سارا معاملہ مفروضہ عقائد پر چل رہا تھا، اس وقت تک زمین یا آدم کی عمر کے بارہ میں اس بیان پر کوئی سوال نہیں اٹھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب ارضیاتی تحقیقات ظہور میں آئیں اور قدیم انسان کے متحجر ڈھانچے برآمد ہوئے تو معلوم ہوا کہ زمین کی عمر یا انسان اول کا زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے جو بائبل کے علماء نے بائبل کے بیانات کا حساب کرکے سمجھا تھا۔

جیمز ہٹن (James Hutton) اور چارلس لائل (Charles Lyell) اور ایڈورڈ بلائتھ (Edward Blyth) وغیرہ نے اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول میں اس موضوع پر بے شمار تحقیقات کیں اور بالآخر یہ ثابت ہو گیا کہ زمین کی مدت اور انسان اول کی عمر کے بارہ میں بائبل کا بیان سراسر خلاف واقعہ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Fred Hoyle, *The Intelligent Universe*,
London 1983, pp. 28-30.

اس معاملہ میں قرآن کی مثال بالکل مختلف ہے۔ قرآن میں کثرت سے ایسے بیانات موجود ہیں جو تاریخ، طبیعیات، ارضیات، فلکیات وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر سارے قرآن میں ابھی تک کسی ایک بھی ایسے بیان کی نشان دہی نہ کی جا سکی جو دور جدید کی تحقیقات سے ٹکرانے والا ہو۔ جو نئی دریافتوں کے بعد خلاف واقعہ ثابت ہو جائے ـــــ بطور مثال ایک واقعہ لیجئے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے فرعون کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے کہ آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو (یونس ۹۲) جس وقت قرآن میں ابتداءً یہ الفاظ اترے، اس وقت ساری دنیا کے لیے یہ ایک لامعلوم بات تھی۔ اس وقت کوئی بھی شخص نہیں جانتا تھا کہ فرعونِ موسیٰ کی لاش کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ مگر نزول قرآن کے چودہ سو سال بعد جب مصر کی تاریخی یادگاروں کی تحقیقات کی گئی تو حیرت انگیز طور پر معلوم ہوا کہ فرعونِ موسیٰ کا مومیائی کیا ہوا جسم مصر کے صحرا میں واقع اہرام کے اندر آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عظمت قرآن، صفحہ ۳۰-۳۲)

اس نوعیت کے بہت سے شواہد قرآن میں موجود ہیں۔ وہ اسلام کی حقانیت کی تصدیق خالص علمی اعتبار سے کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اسلام کو نیا استحکام عطا کرتے ہیں۔

اسلام کے فکری اور عملی استحکام کے یہ چند پہلو جو اوپر بیان کیے گیے، وہ بطور احاطہ نہیں بلکہ بطور مثال ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا وہ محض ایک وقتی یا سیاسی انقلاب نہ تھا، وہ ایک دوررس تاریخی انقلاب تھا۔ اس نے انسانی فکر اور انسانی زندگی پر ایسے دیرپا اثرات ڈالے جو ابدی طور پر تاریخ انسانی کا حصہ بن گیے۔ ان کے بعد دنیا میں ایسی تبدیلیاں ظہور میں آئیں جنھوں نے مستقل طور پر اسلام اور اسلامی دعوت کے لیے ہر قسم کے مواقع پوری طرح کھول دئے ــــ یہی مطلب ہے اسلام کے دین کامل ہونے کا۔

باب دوم

سنّتِ رسولؐ

ہماری اس گفتگو کا موضوع سنت رسول ہے۔ رسول کی سنت دین میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ کا قول اور آپ کا عمل تمام مسلمانوں کے لیے معیار اور نمونہ ہے۔ ہم کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں آپ کے طریقہ کی پیروی کرنی ہے۔ ہم کو ہر معاملہ میں آپ کا مقلد بننا ہے۔ سنت رسول کی پیروی ہی میں دنیا کی کامیابی کا راز بھی ہے اور سنت رسول کی پیروی ہی میں آخرت کی کامیابی کا راز بھی۔

اس بات سے تمام مسلمانوں کو اتفاق ہے۔ اس میں مسلمانوں کے درمیان دو رائے نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت دین میں حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر یہ سوال کہ خود سنت کیا ہے۔ اس بارے میں شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمانوں کے درمیان زبردست غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سنت ہر اس طریقہ کا نام ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ جو آپ نے کیا یا کہا ہو۔ مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں نے سنت کی ایک خود ساختہ فہرست بنالی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی بعض نسبتاً ضمنی اور فروعی چیزوں کو انھوں نے اپنی فہرستِ سنّت میں لکھ لیا ہے۔ جو لوگ ان کا اہتمام کرتے ہیں وہ متبع سنت کہے جاتے ہیں۔ حالاں کہ سنت کی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ سنت کے اتباع سے بہت دور ہوتے ہیں۔

یہاں میں ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث کتابوں میں ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ام سلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی بیتها فدعیٰ وصیفة لہ اولها فابطأت فاستبان الغضب فی وجهہ فقامت

حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے گھر میں تھے۔ پھر آپ نے ایک خادمہ کو بلایا جو آپ کی تھی یا حضرت امّ سلمہ کی تھی۔ خادمہ

ام سلمة الی الحجاب فوجدت الوصیفة تلعب ومعه سواك فقال لولاخشیة القود یوم القیامة لاوجعتك بهذا السواك

(الادب المفرد، باب قصاص العبد، صفحہ ۲۹)

نے آنے میں دیر کی تو آپ کے چہرے پر غصہ ظاہر ہوگیا اس کے بعد حضرت ام سلمہ اٹھیں اور پردے کے پاس جاکر دیکھا تو انھوں نے پایا کہ خادمہ کھیل رہی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ نے خادمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر قیامت کے دن مجھے بدلے کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس وقت گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اس وقت آپ کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ نکالا کہ مسواک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا زیادہ محبوب تھی کہ آپ ہر وقت اس کو اپنے پاس رکھتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اتباع سنّت کے جذبے کے تحت یہ اہتمام کیا کہ مسواک کو اپنی جیب میں رکھنے لگے تاکہ جب بھی وضو کرنا ہو فوراً مسواک لے کر سنت کی تعمیل کر سکیں۔ ایک بار بھی ان سے مسواک کی سنت چھوٹنے نہ پائے۔

مسواک کا یہ اہتمام بذات خود کوئی قابل اعتراض چیز نہیں۔ یقیناً مسواک سنت ہے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: لولا ان اشق علیٰ امتی لامرتھم بالسواك (اگر مجھے اپنی امت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان کو مسواک کرنے کا حکم دے دیتا) اس بنا پر کوئی شخص مسواک کا اہتمام کرے تو وہ یقیناً سنت کا اتباع کرے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ روایت میں صرف اسی ایک بات کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت میں اسی کے ساتھ ایک اور سنت کا ذکر بھی موجود ہے۔ مگر لوگوں نے ایک سنت کو لیا اور دوسری سنت کو چھوڑ دیا۔ اور بدقسمتی سے انھوں نے جس چیز کو اہمیت نہ دی وہی آپ کی اہم ترین سنت تھی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا حال اس شخص کا سا ہوا ہے جس کے پاس ایک پھل ہو اور وہ اس پھل کے چھلکے کو لے لے اور اس کے مغز کو الگ کر کے پھینک دے۔

اس روایت پر غور کیجئے۔ اس میں دو باتوں کا ذکر ہے۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ روایت کا دوسرا جزء یہ ہے کہ آپ کو اپنی خادمہ سے شکایت ہوئی۔ آپ کا جی چاہا کہ آپ اس کو مسواک سے ماریں مگر آپ کو

آخرت کی پکڑ کا اندیشہ ہوا اور اس بنا پر آپ نے اس کو نہیں مارا۔ گویا ایک سنت ہے، دانت صاف کرنے کے لیے مسواک کو استعمال کرنا۔ دوسری سنت ہے، اللہ کے ڈر کا ذہن پر اتنا غلبہ ہونا کہ آدمی شکایت کے باوجود اور قابو رکھنے کے باوجود دوسرے کو تکلیف پہونچانے سے رک جائے۔ وہ مسواک جیسی معمولی چیز سے بھی کسی کو نہ مارے۔ مسلمانوں نے پہلی سنت کو دوسری سنت سے الگ کر دیا۔ انھوں نے پہلی سنت کو لیا اور دوسری سنت کو چھوڑ دیا۔

آج مسلمانوں کے اندر کروروں افراد ہیں جو مسواک کی سنت پر عمل کرتے ہیں مگر شکایتوں اور ناخوش گواریوں کو برداشت کرنا اور قدرت رکھتے ہوئے دوسرے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا، یہ دوسری سنت اتنی کمیاب ہے کہ مشکل ہی سے چند ایسے افراد مل سکتے ہیں جو واقعۃً اس سنت کا اہتمام کرتے ہوں۔

قرآن میں مختلف الفاظ میں بتکرار یہ حکم دیا گیا ہے کہ رسول کی سنت کو اختیار کرو۔ مگر اتباعِ سنت کے نام پر ہمارے یہاں جن چیزوں کا زبردست اہتمام ہوتا ہے ان کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔ البتہ دوسری قسم کی سنت کا ذکر قرآن میں کثرت سے ہے اور یہ دوسری سنتیں وہی ہیں جن کو مسلمانوں نے اپنے اتباعِ سنت کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ یہاں ایک مثال لیجیے۔

سورۂ احزاب قرآن کی ۳۳ ویں سورۃ ہے۔ اس سورۃ کے ایک حصہ میں غزوۂ احزاب پر تبصرہ ہے جو ۵ھ میں پیش آیا۔ اس موقع پر عرب کے مشرکین نے تقریباً ۱۲ ہزار کی تعداد میں اکٹھا ہو کر مدینہ پر چڑھائی کی تھی۔ اس موقع پر اگرچہ باقاعدہ لڑائی نہیں ہوئی تاہم وہ لوگ تقریباً ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ کیے رہے۔ اس محاصرہ کے دوران بڑے سخت حالات پیش آئے۔ چنانچہ خود قرآن میں اس کی بابت یہ الفاظ آئے ہیں کہ ——— جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے۔ جب دہشت سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آگیے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اس وقت ایمان والے سخت آزمائش میں ڈالے گیے اور بری طرح ہلا مارے گیے (۱۰ — ۱۱)

اس نازک موقع پر کمزور مسلمانوں سے بہت سی کمزوریاں ظاہر ہوئیں۔ وہ پوری طرح صبر و استقامت کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس سورہ میں ایسے لوگوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے :

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر وذكر الله

كثيرا (بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ محاصرۂ احزاب کے سخت حالات جس طرح عام مسلمانوں پر پیش آئے اسی طرح وہ رسول پر بھی پیش آئے بلکہ رسول پر زیادہ سخت انداز میں پیش آئے۔ کیوں کہ دشمنوں کا اصل نشانہ تو آپ ہی تھے۔ مگر رسول کا حال یہ رہا کہ وہ پورے صبر اور استقامت کے ساتھ حالات کے مقابلہ میں جمے رہے۔ انھوں نے ہر تلخی اور شدّت کو اللہ کی خاطر برداشت کیا۔ یہ کردار جس کا اعلیٰ نمونہ رسول نے پیش کیا، وہی تمام مسلمانوں کو بھی اپنی زندگی میں اپنانا چاہیے تھا، رسول کی اسی سنت پر تمام مسلمانوں کو چلنا چاہیے تھا۔

گویا اس آیت میں جس سنتِ رسول کا ذکر ہے وہ صبر کی سنت ہے۔ یعنی دین کی راہ میں تلخیوں کو برداشت کرنا۔ ناخوشگواریوں کے باوجود دین کے طریقے پر جمے رہنا۔ مگر آج کیا حال ہے۔ آج آپ سنت کے تذکرہ میں سنتِ صبر یا سنتِ برداشت کا لفظ بولیں، تو سننے والوں کو بڑا عجیب معلوم ہوگا۔ ان کو یقین ہی نہ آئے گا کہ یہ بھی کوئی سنت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلط رواج کے نتیجہ میں بس کچھ خاص چیزوں کو سنت سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً داڑھی، مسواک، دائیں ہاتھ سے پانی پینا، مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دایاں پاؤں رکھنا اور نکلتے ہوئے بایاں پاؤں پہلے نکالنا، وغیرہ

سنت کے نام سے موجودہ زمانہ میں لوگ بس اسی قسم کی کچھ چیزوں کو جانتے ہیں۔ اور ان چیزوں کا پورا اہتمام کرتے ہیں۔ مگر دوسری چیزیں سنتِ رسول کی حیثیت سے ان کے ذہن کا جزء نہیں بنیں۔ اس لیے اتباعِ سنت کے تحت وہ ان کو اختیار کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

آج امت میں بے شمار لوگ ہیں جو اتباعِ سنت کا باقاعدہ اہتمام کرتے ہیں۔ مگر اتباعِ سنت کے نام سے عام طور پر جن چیزوں کا اہتمام کیا جاتا ہے وہ دین کے کچھ ضمنی اور جزئی آداب ہیں۔ ان کے علاوہ دین میں جو اصل اہمیت کی چیزیں ہیں، جو دین میں رئیسی اور مرکزی حیثیت رکھتی ہیں ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر سنّت سے خارج سمجھ لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتباعِ سنت کے باوجود اتباعِ سنت کے فوائد حاصل نہیں ہوتے۔

یہاں میں ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا جس سے سنتوں میں اس تفریق کی بخوبی وضاحت

ہوتی ہے ۔

ماہنامہ الرسالہ کے لیے ہم کو ایک مزید کاتب کی ضرورت تھی ۔ اس سلسلے میں ایک صاحب بلائے گئے ۔ انھوں نے کہا کہ میں کام لے کر جاؤں گا اور گھر پر لکھ کر دیتا رہوں گا ۔ چنانچہ انھیں چند مضامین دیے گئے ۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ پندرہ دن میں یہ مضامین لکھ کر دے جائیں گے ۔

کاتب صاحب جس وقت دفتر میں تشریف لائے وہ کھانے کا وقت تھا ۔ چنانچہ ان کے لیے کھانا منگایا گیا ۔ کھانا میز پر رکھ دیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ کھانا تناول فرمائیں ۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ کچھ تردد اور پریشانی میں پڑ گیے ہیں ۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میز پر کھانا خلاف سنت ہے اس لیے وہ کھانے سے ہچکچا رہے ہیں ۔ اس کے بعد ایک چٹائی منگائی گئی ۔ چٹائی بچھا کر کھانا فرش پر رکھا گیا ۔ اس کے بعد انھوں نے کھانا تناول فرمایا ۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ الرسالہ کے مضامین لے کر واپس گیے ۔

ہم کو امید تھی کہ حسب وعدہ وہ دو ہفتہ میں مضامین لکھ کر پہونچا دیں گے مگر دو ہفتہ گزر گیا اور وہ واپس نہیں آئے ۔ ہم انتظار میں رہے یہاں تک کہ دو مہینہ ہو گیا ۔ اس کے بعد ان کی تلاش کے لیے ایک آدمی بھیجا گیا ۔ بڑی مشکل سے اس گلی تک رسائی ہوئی جہاں وہ ایک مشترک کمرے میں رہتے تھے ۔ ان کے کمرہ کے ساتھی نے بتایا کہ وہ یہاں موجود نہیں ہیں ۔ ساتھی نے مزید بتایا کہ وہ اپنے وطن گیے ہوئے تھے جو ایک دیہات میں واقع ہے ۔ وہاں ایک خاندانی جھگڑے میں ان کی آپس میں لڑائی ہو گئی اس میں وہ کافی زخمی ہوئے اور اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں ۔

اس کے بعد ان کے وطن کے پتے پر خط لکھا گیا ۔ جواب کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مذکورہ رپورٹ صحیح تھی ۔ بالآخر کئی مہینہ کے بعد ہمارا آدمی ان کے گھر پر ان سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوا ۔ اور وہ مضامین کو اس حال میں واپس لایا کہ کاتب صاحب نے ابھی ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی ۔

اب اس واقعہ پر غور کیجیے ۔ میرے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے کہ میز پر کھانا کھانا سنت کے خلاف ہے ۔ تاہم بالفرض اگر میز پر کھانا کھانا سنت کے خلاف ہو تب بھی مذکورہ کاتب صاحب نے ایک سنت پر عمل کیا اور دو اہم تر سنت کو چھوڑ دیا ۔ اپنے خیال کے مطابق انھوں نے فرش پر کھانا کھا کر ایک سنت ادا کی ۔ مگر اس کے ساتھ دو اہم تر سنتیں ـــــــ سنتِ وعدہ اور سنتِ صبر کی تعمیل وہ نہ

کرسکے۔ اپنے وعدہ کے مطابق انھیں دو ہفتہ میں مضامین کی کتابت کرکے ہمیں پہونچانا چاہیے تھا۔ اور بالفرض اگر کوئی عذر لاحق ہوجائے تو ان کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں اطلاع دیں۔ مگر انھوں نے نہ اپنا وعدہ پورا کیا نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع دی۔ دوسری بات یہ کہ اپنے رشتہ داروں سے اگر ان کا کوئی جھگڑا تھا تو وہ صبر اور اعراض کے طریقہ کو اختیار کرکے اس مسئلہ کو حل کرسکتے تھے۔ مگر وہ صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار نہ کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں زخمی ہوکر کئی مہینہ اسپتال میں رہنا پڑا۔

مذکورہ کاتب صاحب ایک عربی درسگاہ سے فارغ ہیں۔ انھوں نے سنت اور حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ مگر سنت کے نام سے ان کا ذہن جن چیزوں سے مانوس تھا وہ چند ضمنی اور فروعی چیزیں تھیں مثلاً ایک مشت داڑھی رکھنا۔ چٹائی پر کھانا کھانا۔ دائیں ہاتھ سے پانی پینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات ان کی شعوری دریافت سے باہر تھی کہ وعدہ پورا کرنا بھی سنت ہے۔ صبر کرنا بھی سنت ہے اور جھگڑوں میں اعراض کا طریقہ اختیار کرنا بھی سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے چٹائی پر کھانا کھانے کی سنت پر شدت سے عمل کیا۔ مگر وعدہ اور صبر و اعراض کی سنت پر عمل کرنے کی ضرورت انھیں محسوس نہیں ہوئی۔

یہی پوری ملت کا حال ہے۔ آج بے شمار لوگ ہیں جو سنت کی اہمیت کا اقرار کرتے ہیں۔ جو سنت کے اتباع کا زبردست اہتمام کرتے ہیں مگر سنت کے لفظ سے وہ جن چیزوں کو جانتے ہیں وہ بس چند آداب ہیں۔ ان جزئی آداب کے معاملہ میں وہ اتباعِ سنت کا زبردست اہتمام کرتے ہیں مگر ان کے علاوہ جو بڑی بڑی سنتیں ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے ان کی اتباع کا متبعینِ سنت کے یہاں کوئی اہتمام نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو وہ سنت کے نام سے جانتے ہی نہیں۔

آپ کسی مجلس میں معروف سنتوں کا ذکر کریں تو کسی شخص کو کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوگی۔ لیکن اگر آپ اس قسم کے الفاظ بولیں مثلاً —— سنت تفکر، سنت اعتبار، سنتِ صبر، سنتِ اعراض، سنتِ نُصح، سنتِ دعوت وغیرہ، تو لوگ آپ کو عجیب نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ان کو ایسا معلوم ہوگا جیسے آپ کوئی نیا دین پیش کر رہے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بدأ الاسلام غریباً و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ پھر دوبارہ وہ اجنبی

ہو جائے گا پس اجنبیوں کو مبارکی ہو)

اس حدیث میں دین کے اجنبی ہونے کا جو ذکر ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام لوگ نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے یا کوئی حج کرنے والا باقی نہیں رہے گا۔ دوسری احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نماز روزہ کرنے والے لوگ آخر وقت تک دنیا میں باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ اس میں دین کے اجنبی ہونے سے مراد وہی چیز ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعات میں نظر آتی ہے۔ یعنی چٹائی پر کھانا کھانے کی سنت لوگوں کے لیے معروف ہو مگر ایفائے وعدہ اور صبر و اعراض کی سنت لوگوں کے کے لیے اجنبی بن جائے۔

بعض چیزیں وہ ہیں جو باعتبار حقیقت سنت ہیں نہ کہ باعتبار ظاہر۔ ایسے معاملات میں مسلمانوں نے بس ظاہری صورت کو پکڑ لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ سنت پر عمل کر رہے ہیں۔ حالاں کہ ان معاملات میں سنت ایک حقیقت کا نام تھا نہ کہ ایک ظاہری صورت کا۔

مثال کے طور پر ذکر کو لیجیے۔ موجودہ زمانہ میں بے شمار مسلمان ہیں جو کچھ الفاظ کو یاد کر کے صبح و شام ان کی تکرار کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ "مسنون اذکار" پر عمل کر رہے ہیں۔ حالانکہ مسنون اذکار مسنون کیفیات کا نام ہیں نہ کہ محض کچھ الفاظ اور کچھ جملوں کا نام مسنون اذکار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حقیقۃً خدا کی یاد ہوتا تھا۔ آپ پر ہر قت اللہ کی یاد کا غلبہ رہتا تھا۔ اس کیفیت کے ایک ظاہری نیتجہ کے طور پر کچھ الفاظ آپ کی زبان سے نکل پڑتے تھے۔ یہ الفاظ بلاشبہ ذکر تھے۔ مگر وہ اپنی اندرونی حقیقت کی بنا پر ذکر تھے۔ نہ کہ محض اپنے ظاہری تلفظ کی بنا پر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی نہایت گہری معرفت حاصل تھی۔ حدیث میں آپ کو دائم الفکرہ کہا گیا ہے۔ یعنی آپ ہر وقت خدا کے فکر میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے۔ آپ کو اللہ کی بے پایاں نعمتیں یاد آتیں اور آپ شکر کے جذبے سے سرشار ہو جاتے۔ آپ اللہ کی عظمتوں کا تصور کرتے اور آپ کا سینہ اللہ کی بڑائی کے احساس سے بھر جاتا۔ اس وقت بے اختیار آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے : سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم یہ تھا آپ کا ذکر۔ آپ کا ہر ذکر ایک قلبی حالت کا ترجمان ہوتا تھا، اور یہی حقیقت ہے ان تمام اذکار کی جن کو مسنون اذکار کہا جاتا ہے۔

عقیدت مندی یا اطاعت

اردو زبان کے ایک بڑے شاعر تھے۔ وہ نعت گوئی میں مشہور تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں بڑے بڑے قصیدے لکھتے تھے اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ ان کو مشاعروں میں سناتے تھے۔ مگر ان کا حال یہ تھا کہ وہ نہ نماز پڑھتے تھے اور نہ روزہ رکھتے تھے۔ صاحب مال ہونے کے باوجود وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے اور نہ انھوں نے کبھی حج کیا۔ وہ اپنے آپ کو عاشقِ رسول کہتے تھے۔ اگرچہ اطاعتِ رسول سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

موجودہ زمانہ میں کثرت سے اس قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں۔ وہ رسول اللہ کی شان میں شاندار الفاظ بولیں گے، آپ کے نام پر میلاد النبی کے جشن منائیں گے مگر انھیں رسول اللہ کے طریقہ کو اختیار کرنے میں کوئی دل چسپی نہ ہوگی۔ اس قسم کی محبت رسول کی دین میں کوئی قیمت نہیں۔ دین میں وہی محبتِ رسول معتبر ہے جس کے ساتھ اطاعت رسول پائی جاتی ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران ۳۱)

اے نبی، کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا

اس آیت کی تشریح میں مفسرین نے لکھا ہے کہ خدا و رسول کے سلسلے میں صرف اظہار محبت کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ لازم ہے کہ آدمی کا عمل بھی اس کے مطابق ہو۔ جو شخص محبت کا دعویٰ کرے اور اسی کے ساتھ وہ رسول خدا کی سنت کے خلاف عمل کر رہا ہو تو وہ جھوٹا ہے (فمن ادعیٰ المحبۃ مع مخالفۃ سنۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فھو کذاب، التفسیر المظہری، المجلد الثانی، صفحہ ۳۷)

میں نے ایک بار سیرت النبی کے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ میں نے اپنی تقریر میں تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا زندگی کا طریقہ کیا تھا۔ تقریر کے بعد حاضرین جلسہ میں سے ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہا کہ آپ نے سیرت پر تو کچھ بیان ہی نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ کی زندگی کا طریقہ بتایا، یہی تو سیرت ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں سیرت تو یہ ہے کہ آپ کے کرامات اور عجائب بیان کئے جائیں۔ عشق رسول کی باتیں کی جائیں۔ اور یہ آپ نے کیا ہی نہیں۔

یہ زبردست بھول ہے جس میں موجودہ زمانہ کے مسلمان مبتلا ہیں انھوں نے غیر سیرت کو سیرت اور غیر سنت کو سنت سمجھ رکھا ہے۔ رسول اللہ کو رسول اللہ ماننے کا واحد مطلب یہ ہے کہ آپ کو قابل اتباع اور آپ کی زندگی کو نمونہ سمجھا جائے۔ الفاظ کے میدان میں جوش وخروش دکھانے سے رسول اللہ پر ایمان کا حق ادا نہیں ہوتا۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں الفاظ کے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

استبّ رجلٌ من المسلمین ورجل من الیھود۔ فقال المسلم۔ والذی اصطفیٰ محمدًا علی العٰلمین فقال الیھودیُّ والذی اصطفی موسیٰ علی العٰلمین۔ فرفع المسلم عند ذالک یدہ فلطم الیھودیَّ۔ فذھب الیھودیُّ الیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاخبرہ الذی کان من امرہ وامر المسلم۔ فغضِب النبیُّ صلی اللّٰہ عیہ وسلم حتیٰ رُئِیَ فی وجھہ ثُمّ قال؛ لا تفضِّلوا بین انبیاء اللّٰہ۔

(جامع الاصول، جلد ۸، صفحہ ۱۲-۵۱۳)

مسلمانوں میں سے ایک شخص اور یہودیوں میں سے ایک شخص (مدینہ میں) آپس میں جھگڑ گیے۔ مسلمان نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد کو تمام دنیا والوں پر برگزیدہ کیا۔ یہودی نے کہا اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام دنیا والوں پر برگزیدہ کیا۔ اس وقت مسلمان نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے چہرہ پر مارا۔ وہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور اس معاملہ کو آپ سے بتایا جو اس کے اور مسلمان کے درمیان پیش آیا تھا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہوگیے یہاں تک کہ غصہ آپ کے چہرے پر ظاہر ہوگیا پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے افضل نہ ٹھہراؤ۔

کسی رسول کا جو مرتبہ ومقام ہے اس کا تعلق اللہ سے ہے۔ اس کا تعلق ہم سے نہیں۔ ہمارے ذمہ جو کام ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم ایک رسول کی افضلیت دوسرے رسولوں پر ثابت کریں اور پھر اس پر دوسروں کے درمیان فخر کریں۔ ہماری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ ہم وہ کریں جو رسول نے کیا۔ ہم رسول کو اپنی زندگی کے تمام معاملات کے لیے نمونہ بنالیں۔ اللہ کے یہاں ہم کو جو انعام ملے گا وہ رسول کی پیروی کی بنیاد پر ملے گا نہ کہ اس بنیاد پر کہ ہم نے رسول کی عظمت پر شاندار تقریریں کی تھیں اور اس کو اپنے قومی فخر کا عنوان بنایا تھا۔

حصّہ دوم

اس وقت ہم چند حدیثیں پیش کریں گے۔ ان حدیثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کیا تھا۔ اور زندگی کے مختلف معاملات میں آپ نے ہمارے لیے کیا نمونہ چھوڑا ہے۔

عن انس قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا بنی ان قدرت ان تصبح وتمسی ولیس فی قلبك غش لاحد فافعل ثم قال یا بنی وذلك من سنتی ومن احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے لڑکے، اگر تو اس پر قادر ہو کہ تو صبح اور شام اس طرح کرے کہ تیرے دل میں کسی کے خلاف کینہ نہ ہو تو ایسا کر۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے، یہ میری سنت ہے اور جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

رسول کی سنت کا تعلق صرف کپڑا، بال اور مسواک جیسی چیزوں سے نہیں ہے بلکہ ایک آدمی کی زندگی کے پورے رویہ سے ہے۔

لوگوں کے درمیان آپ کیسے رہیں، اس کے بارے میں سنت رسول یہ ہے کہ آپ کا دل لوگوں کے بارے میں برے جذبات سے پاک ہو۔ جب بھی ایک آدمی دوسرے آدمیوں کے درمیان رہتا ہے تو طرح طرح کے باہمی معاملات پیش آتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کے خلاف رنجش اور شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا ہونا فطری ہے۔ مگر خدا کے رسول کی سنت یہ ہے کہ ایسے جذبات کو اپنے دل میں ٹھہرنے نہ دیا جائے بلکہ انھیں باہر نکال دیا جائے۔

شکایتوں کو نظرانداز کرنا۔ رنجشوں کو بھول جانا، غلطیوں کو معاف کر دینا، تکلیف کو اپنے اوپر سہہ لینا بجائے اس کے کہ اس کو دوسرے کے اوپر ڈالا جائے، یہ پیغمبر کا طریقہ ہے اور جنت انھیں لوگوں کے لئے ہے جو پیغمبر کے طریقہ کو اختیار کریں۔

جو لوگ پیغمبر کے طریقہ کو چھوڑ کر اپنے نفس کی ترغیبات پر چلیں، جو لوگ اپنے سینے کو منفی جذبات سے پاک کرنے کے بجائے اس کو منفی جذبات کا آشیانہ بنائیں۔ وہ آخرت میں پیغمبروں اور خدا کے نیک بندوں کی آبادی سے دور ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے پیغمبروں اور نیک بندوں کی روش کو اپنے لئے پسند نہیں کیا۔

لا زلتم منصورین علی اعدائکم ما دمتم متمسکین
بسنتی فان خرجتم عن سنتی سلط اللہ علیکم
من لا یخافکم ولا یرحمکم حتی تعودوا الی سنتی
(رواہ مسلم)

تم اپنے دشمنوں پر اس وقت تک غالب رہوگے جب تک میری سنت کو پکڑے رہوگے۔ اور جب تم میری سنت سے نکل جاؤ گے تو اللہ تمہارے اوپر ایسے کو مسلط کر دے گا جو نہ تم سے ڈرے گا اور نہ تم پر رحم کرے گا، یہاں تک کہ تم میری سنت کی طرف لوٹ آؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین چھوڑا ہے اس میں کوئی کمی نہیں جس کو کوئی پورا کرے۔ اس میں کوئی زیادتی نہیں جس کو کوئی اس سے دور کرے۔ یہ پوری طرح ایک کامل دین ہے۔ ہماری کامیابی کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اس کی اسی طرح پیروی کریں جیسا کہ وہ ہے، اگر ہم نے اس میں کمی بیشی کی کوشش کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ باہمی اختلاف اور تصادم شروع ہو جائے گا۔ اور باہمی اختلاف ہی کا دوسرا نام کمزوری اور مغلوبیت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کچھ عقائد سکھائے ہیں —— خدا ایک ہے۔ مرنے کے بعد جنت اور دوزخ ہے۔ نبیوں پر خدا اپنے فرشتے کے ذریعہ اپنا کلام بھیجتا ہے، وغیرہ۔ ان عقائد کو ہمیں اسی طرح ماننا ہے جس طرح وہ قرآن اور حدیث میں آئے ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے موشگافیاں کریں اور نئی نئی کلامی بحثیں چھیڑیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ مختلف لوگ مختلف باتیں نکالیں گے۔ رایوں کا اختلاف امت کے افراد کو ایک دوسرے سے ٹکرا دے گا۔ اسی طرح عبادت کے سلسلے میں آپ نے کچھ احکام بتائے اور ان کو کر کے دکھا دیا۔ اب ہمیں چاہئے کہ ان کو جیسا ہے ویسا ہی پکڑ لیں۔ اگر ہم نے عبادت میں نئے مسائل اور نئے طریقے نکالے تو اس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندی ہوگا جو بالآخر امت کی کمزوری کا باعث بنے گا۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے تکلیف پہنچے تو آپ نے بتایا کہ صبر کرو اور اپنے بھائی کو معاف کر دو۔ اب اگر ایسے موقع پر ایک آدمی دوسرے آدمی سے بدلہ لینے اور اس کو اس کے کئے کا مزہ چکھانے کے لئے کھڑا ہو جائے تو اس سے آپس کا ٹکراؤ وجود میں آئے گا اور بالآخر ساری امت کو کمزور کر دے گا۔ حکومت کے معاملات میں آپ نے یہ تعلیم دی کہ منصب کی خواہش نہ کرو۔ اب اگر لوگ عہدہ اور منصب کی خواہش کرنے لگیں تو باہمی رقابت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ ملت کے اندر مختلف جتھے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں گے۔ ملت خود اپنے افراد کے ہاتھوں برباد کی جانے لگے گی۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ دنیا کو غیر اہم سمجھو اور ساری توجہ آخرت کی طرف لگاؤ۔ اب اگر امت کے لوگ دنیا کی چیزوں کو اپنا مقصود سمجھ لیں تو ایک چیز کے کئی کئی امیدوار بنیں گے اور اس کے حصول کے لئے باہم لڑنا شروع کر دیں گے۔ اس کے نتیجہ میں پورا مسلم معاشرہ حسد، بغض، نفرت اور انتقام کی آگ میں جل اٹھے گا۔

رسول اللہ کا اندازِ کلام

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بولنے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ہمیشہ واضح انداز میں بولتے تھے اور الفاظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا فرماتے تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بعد کے زمانہ کے لوگوں سے فرمایا:

ماکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یَسرُدُ کسردکم ھٰذا۔ ولکن یتکلّم بکلام بین فصل یحفظہ مَن جلس الیہ (زاد المعاد)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی طرح تیز تیز نہیں بولتے تھے۔ بلکہ آپ کے کلام میں فصل ہوتا تھا، آپ کے پاس بیٹھا ہوا آدمی اس کو یاد کر لیتا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یسرد الحدیث کسردکم۔ کان یحدث حدیثاً لو عدّہ العادُّ لاَحصاہ (متفق علیہ)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تیز تیز باتیں نہیں کرتے تھے جیسے تم کرتے ہو۔ آپ اس طرح بات کرتے تھے کہ اگر گننے والا گنے تو اس کو گن لے۔

مومن کا کلام ایک ایسے شخص کا کلام ہوتا ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مومن کو یقین ہوتا ہے کہ اس کا ہر لفظ فرشتے لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے ہر قول کے لیے خدا کے یہاں جواب دہ ہونے والا ہے۔ مومن کا یہ یقین اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا اور فرشتوں کے سامنے بول رہا ہے۔ یہ تصور اس کی زبان پر لگام لگا دیتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے سوچتا ہے۔ وہ جب بولتا ہے تو الفاظ تول کر اپنے منہ سے نکالتا ہے۔ خدا کا خوف اس سے تیز کلامی کا انداز چھین لیتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس اس کی جوشِ تقریر کے لیے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

جو شخص اس قسم کے شدید احساسات سے دبا ہوا ہو وہ آخری حد تک سنجیدہ انسان بن جاتا ہے اور سنجیدہ انسان کی گفتگو کا انداز وہی ہوتا ہے جس کا نقشہ حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت میں نظر آتا ہے۔

ہر ایک کو اچھی دعا دینا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے اپنے حق میں دعا کے لئے کہتا تو آپ فوراً انھیں الفاظ میں اس کے لئے دعائیہ کلمات کہتے جن الفاظ میں اس نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی تھی۔ حضرت ابوہریرہ رض نے اپنی مشرک ماں کے لئے دعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا: اے خدا کے رسول، اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (ادع اللہ ان یھدی ام ابی ھریرہ) آپ نے فوراً دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ ابوہریرہ کی ماں کو ہدایت دے (اللھم اھد ام ابی ھریرہ) نیز حسب موقع اس میں کچھ بہتر الفاظ کے ساتھ اضافہ فرما دیتے۔ ایک بار حضرت ابوہریرہ نے آپ سے کہا کہ اے خدا کے رسول میرے لئے خدا سے دعا کر دیجئے کہ وہ مجھ کو اور میری ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے (ادع اللہ ان یحببنی وامی الی عبادہ المومنین) آپ نے فرمایا: اے اللہ ابوہریرہ اور ان کی ماں کو اپنے مومن بندوں میں محبوب بنا دے اور اپنے مومن بندوں کو ان دونوں کے لئے محبوب کر دے (اللھم حبّب عبیدک ھذا وامہ الی عبادک المومنین وحببھم الیھما)

یہ طریقہ آپ کا اچھی دعا کے لئے تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص بد دعا کے لئے کہتا تو اس صورت میں آپ کا طریقہ دوسرا ہوتا۔ اب آپ آدمی کی درخواست کے برعکس اس کے لئے بہتری کی دعا کرنے لگتے۔ طفیل بن عمرو الدوسی مکہ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اس کے بعد اپنے وطن واپس جا کر قبیلہ دوس میں تبلیغ کرنے لگے۔ مگر ان کی بیوی کے والد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، قبیلہ دوس کے لئے بد دعا فرمائیے۔ آپ نے حضرت طفیل سے کوئی بحث نہ کی بلکہ ان الفاظ میں دعا کرنا شروع کر دیا: اے اللہ قبیلہ دوس کے لوگوں کو ہدایت دے (اللھم اھد دوسا) اس کے بعد حضرت طفیل نے دوبارہ اپنے قبیلہ میں واپس آکر تبلیغ کی تو سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ انھیں میں سے ایک حضرت ابوہریرہ بھی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ واقعات میں جو طریقہ ملتا ہے یہی مومن کا اصل مزاج ہے۔ مومن کے دل میں دوسروں کے لئے خیر خواہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بھی ایک مومن کے لئے وہی بہتر چیز چاہنے لگتا ہے جس کا وہ مومن خود خواہاں ہو۔ مومن دوسرے کی ہدایت کا حریص ہوتا ہے، اس لئے جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص صحیح راستہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو وہ اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے حق میں خدا سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کا سینہ ہدایت کے لئے کھول دے۔

مسلمان کون ہے

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

آدمی جب حقیقی طور پر خدا کو پاتا ہے تو اس کی قدرت اور جلال کے آگے اس کی ہستی بالکل دب جاتی ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے وجود کو خدا کے آگے ڈال دے۔ وہ اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دراصل ایسے ہی انسان کے طرز عمل کو بیان کرتا ہے۔ جو شخص اس طرح مسلم بنتا ہے وہ ایسا انسان ہوتا ہے جو خدا کو ہر آن اپنے آپ پر طاری کئے ہوتے ہو۔ اس کا پورا رویہ اس احساس کے تحت متعین ہوتا ہے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اگر وہ خدا کی مرضی کے خلاف چلے تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔

یہ احساس مسلمان کی زبان سے یہ صلاحیت ختم کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے خلاف استعمال ہو۔ یہ احساس مسلمان کے ہاتھ سے یہ طاقت چھین لیتا ہے کہ وہ کسی کے خلاف دست درازی کرے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو صحیح بات کہنے کے لئے کھلتی ہے۔ اس کا ہاتھ اٹھتا ہے تو انصاف کو قائم کرنے کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حق کی جانب کھڑا کرتا ہے نہ کہ ناحق کی جانب۔

موجودہ دنیا دارالامتحان ہے۔ یہاں آدمی کو آزمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ آزمائش ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ آدمی دو چیزوں کے درمیان ہو۔ سورج چاند حالتِ امتحان میں نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ہی متعین انداز میں سفر کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ کیونکہ وہ اختیار رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک رخ پر حرکت کرے اور چاہے تو دوسرے رخ پر۔

اس حقیقت کی روشنی میں دیکھئے تو مذکورہ حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان وہ ہے جس کو موقع ہو کہ وہ اپنے بھائی کے خلاف اپنی زبان کھولے مگر اس کے باوجود وہ خدا کی خاطر اپنی زبان کو بند کر لے مسلمان وہ ہے جس کو یہ موقع ہو کہ وہ اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھائے مگر خدا کا خوف اس کے اوپر اتنا غالب ہو کہ اس کا ہاتھ اس کے بھائی پر اٹھنے سے رک جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہر آن انصاف اور بے انصافی کے درمیان ہے۔ مسلمان وہ ہے جس نے بے انصافی کو چھوڑ کر انصاف کا راستہ اختیار کیا، اگرچہ بے انصافی کا راستہ بھی اس کے لئے پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

نصیحت کے لیے ایک بات کافی ہے

صعصعہ بن معاویہ مشہور شاعر فرزدق کے چچا تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ نے ان کو سورہ زلزال سنائی۔ یہاں تک کہ آپ اس آیت پر پہنچے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (جس نے ایک ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا۔ جس نے ایک ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا) حضرت صعصعہ نے اس کو سن کر کہا: حسبی ان لا اسمع غیرھا (اس کے بعد میں کچھ اور نہ سنوں تب بھی یہ میرے لئے کافی ہے) رواہ الامام احمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ نئے اسلام لانے والوں کو کسی صحابی کے سپرد کر دیتے تاکہ وہ ان کو دین کی باتیں سکھا دیں۔ اسی طرح مذکورہ صحابی کو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد فرما دیا۔ وہ چند دن آئے اور اس کے بعد ان کا آنا بند ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کئی دن تک ان کو مسجد میں نماز میں نہ دیکھا تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے بارے میں دریافت کیا جن کے سپرد ان کی تعلیم ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ کئی دن سے وہ میرے پاس بھی نہیں آئے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ ان کا پتہ کر کے بتائیں۔ آخر ایک روز ایک شخص کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ لکڑی کا گٹھا سر پر رکھ کر اس کو بیچنے کے لئے بازار جا رہے تھے۔ انھوں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھارے بارے میں پوچھ رہے تھے، چل کر ملاقات کر لو۔ وہ تیزی سے بازار گئے اور لکڑی کا گٹھا کسی کے ہاتھ بیچ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے کہا کہ تم کئی روز سے ادھر نہیں آئے۔ انھوں نے کہا: میں اس لئے نہیں آیا کہ میں نے سمجھا کہ میری تعلیم پوری ہو گئی۔ آپ نے فرمایا: ابھی تو چند ہی دن گزرے تھے، پھر تمھاری تعلیم پوری کیسے ہو گئی۔ انھوں نے کہا: میرے سامنے قرآن کی یہ آیت آئی: فمن يعمل مثقال ذرّة خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (جو ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔ جو ذرہ برابر برائی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) اس آیت کو جاننے کے بعد اب میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ جب بھی کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو یہ خیال آ جاتا ہے کہ قیامت میں اس کا انجام کس صورت سے سامنے آئے گا۔ اگر دل کہتا ہے کہ وہ اچھا کام ہے اور اس کا انجام اچھی صورت میں سامنے آئے گا تو اس کو کرتا ہوں اور اگر اس اعتبار سے کھٹک پیدا ہوتی ہے تو رک جاتا ہوں پھر وہ کام مجھ سے نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: پھر تو تمھارے لئے یہی کافی ہے۔

تابعی اس کو کہتے ہیں جس نے صحابہ کو دیکھا ہو۔ ایک تابعی نے ایک بار اپنے شاگردوں کے سامنے صحابہ کی خصوصیات بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ صحابہ اتنا زیادہ نماز روزہ نہیں کرتے تھے جتنا تم لوگ کرتے ہو۔ ان کی فضیلت یہ تھی کہ ایک چیز ان کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی (ولكنه شيء وقر في قلوبهم) یہ چیز جو صحابہ کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی وہ اللہ کا خوف تھا۔ اللہ کا خوف اگر آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو گویا ہر چیز اس کے اندر پیدا ہو گئی اور اگر وہ پیدا نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ سے ڈرنے والا آدمی ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتا ہے اس لئے وہ ہر معاملہ میں تواضع اور انصاف کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اور جب آدمی معاملات کو انسان کا معاملہ سمجھ لے تو کوئی چیز اس کو ظلم اور گھمنڈ سے روکنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔

اسلامی زندگی پابند زندگی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے رسی میں بندھا ہوا گھوڑا، وہ گھومتا ہے پھر اپنے کھونٹے کی طرف واپس آجاتا ہے۔ (مثل المومن و مثل الایمان کمثل الفرس فی آخیتہ یجول ثم یرجع الی آخیتہ) جانور ایک ظاہری رسی میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ایمان اس طرح کی کوئی ظاہری رسی نہیں ہے۔ یہ ایک نظر نہ آنے والی رسی ہے۔ جانور مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی رسی سے آگے نہ جائے۔ مومن یہی کام اپنے ارادہ سے کرتا ہے۔ اللہ کی پکڑ کا اندیشہ اس کے لئے ایک نہ دکھائی دینے والی رسی بن جاتا ہے۔ جو ہر وقت اس کو اندر سے تھامے رہتا ہے۔ وہ وہاں تک جاتا ہے جہاں تک جانے کی اللہ نے اجازت دی ہے اور وہاں جانے سے رک جاتا ہے جہاں جانے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ وہ اللہ کا ایک بندھا ہوا بندہ ہوتا ہے نہ کہ آزاد چھوڑا ہوا جانور۔

دنیا میں آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہوجائے۔ وہ آزادی کا موقع پاتے ہوئے اپنے کو پابند بنالے۔ وہ ایک آدمی پر غصہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو مگر وہ اس کو معاف کردے۔ ایک حق بات اس کے سامنے آئے اور وہ اس کو جھٹلانے کے لئے آزاد ہو پھر بھی وہ اس کے آگے جھک جائے۔ وہ ایک شخص کے ساتھ ظلم کرنے پر قادر ہو اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے۔ وہ ایک شخص کا مال ہڑپ کرلینے کی طاقت رکھتا ہو مگر وہ اس کا مال اسے لوٹا دے۔ وہ ایک شخص کو نظر انداز کردینے کی حیثیت میں ہو مگر اللہ کے خیال سے اس کو نظر انداز نہ کرے۔

اللہ نے ہر معاملہ میں آدمی کے لئے ایک حد مقرر کردی ہے۔ آدمی کو اسی حد کے اندر رہنا ہے، اس کے باہر نہیں جانا ہے۔ دوسرے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی حد یہ ہے کہ وہ خارجی واقعات کی بنیاد پر رائے قائم کرے۔ اس لئے آدمی کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ وہ قیاس اور گمان کی بنیاد پر دوسرے کے بارے میں رائے زنی کرنے لگے۔ تلاش معاش کی حد یہ ہے کہ آدمی محنت اور دیانت داری کے ساتھ کما کر جو چیز پائے اس کو اپنی چیز سمجھے، اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ دھوکا اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ حاصل کئے ہوئے مال کو وہ اپنا مال سمجھ لے۔ تنقید کی حد یہ ہے کہ واضح دلائل کی بنیاد پر کسی کا رد کیا جائے اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ دلیل کے بغیر کسی کو برا بھلا کہنے لگے۔ گفتگو کی حد یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ انداز میں اپنی بات دوسرے کے سامنے رکھے اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ گالی گلوج کی زبان میں بولنے لگے۔ کسی کو برا سمجھنے کی حد یہ ہے کہ معلوم واقعات سے ثابت ہوجانے کے بعد اس کو برا سمجھا جائے، اس لئے آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ نامعلوم اور غیر ثابت شدہ چیزوں کی روشنی میں کسی کے بارے میں برا خیال قائم کرے۔

رسی سے بندھا ہوا گھوڑا رسی کی لمبائی تک آزاد ہوتا ہے اور اس کے بعد پابند۔ مومن خدا کی اجازت کے دائرے میں آزاد ہے اور خدا کی ممنوعات کے دائرے میں پابند۔ جو شخص اس حد بندی کو قبول کرکے زندگی گزارے وہی مومن ہے اور اسی کے لئے آخرت کی جنتیں ہیں۔ جو شخص اس حد بندی کو قبول نہ کرے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے اور آخرت میں اس کے لئے جہنم کی آگ کے سوا اور کچھ نہیں۔

تکلیفوں پر صبر

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا آپ پر ایسا کوئی دن گزرا ہے جو جنگ احد کے دن سے زیادہ سخت ہو۔ آپ نے فرمایا: تمھاری قوم سے مجھ کو بہت دکھ پہنچا ہے۔ اور اس کی طرف سے جو سب سے زیادہ شدید چیز مجھے پہنچی وہ عقبہ (طائف) کے دن تھی۔ جب کہ میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کیا۔ پھر اس نے وہ بات قبول نہ کی جو میں نے چاہا تھا (مجھ کو اپنی پناہ میں لینا منظور نہ کیا) پھر میں (طائف سے) واپس روانہ ہوا۔ اور میں سخت غم زدہ تھا۔ میں چلتا رہا یہاں تک کہ میں قرن ثعالب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اچانک میں نے پایا کہ ایک بادل میرے اوپر سایہ کئے ہوئے ہے۔ میں نے دیکھا تو اس میں جبریل تھے۔ انھوں نے مجھے پکارا اور کہا: اللہ نے اس قول کو سنا جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا ہے اور جس طرح انھوں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ اللہ نے پہاڑوں کے فرشتے کو آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ قوم کے بارہ میں آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا اسے حکم دیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کے فرشتے نے مجھ کو پکارا اور مجھ کو سلام کیا اور کہا: اے محمدؐ! اللہ نے آپ کے بارے میں آپ کی قوم کے کلام کو سنا۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ میرے رب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اس کا مجھے حکم دیں۔ پھر آپ کیا چاہتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں چکی کے دو پاٹ کی طرح ان دونوں پہاڑوں کو ان کے اوپر کر دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ مجھے امید ہے کہ ان کی صلب سے اللہ ایسا شخص پیدا کرے جو ایک اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے (بل ارجو ان یخرج اللہ من اصلابہم من یعبد اللہ وحدہ لا یشرک بہ شیئا، متفق علیہ)

اس واقعہ سے پیغمبر کا انداز اور طریق کار معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے پیغمبر کو خواہ کتنی ہی تکلیف پہنچے وہ منفی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوتا، اس کے اندر نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں بھڑکتا۔ وہ حال کے بجائے مستقبل کو دیکھتا ہے۔ اس کی نظریں سامنے کے واقعات کے بجائے ان واقعات پر ہوتی ہیں جو آئندہ ظہور میں آسکتے ہیں۔ وہ آنے والے بہتر امکان کی امید میں آج کی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ فرد سے تعلق کا معاملہ ہو یا قوموں سے تعلقات کا معاملہ، ہر معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور شکایتوں اور تکلیفوں سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔

ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت سے ہے اور جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ یہی بات یہاں بھی صادق آتی ہے۔ انتقام نہ لینا اور مستقبل کی امید میں حال کی تلخیوں کو نظر انداز کر دینا پیغمبر کی سنت ہے، اور جو پیغمبر کی سنت سے اعراض کرے وہ پیغمبر سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم پیغمبر کی اس سنت پر عمل نہ کریں تو ہم کو نہ پیغمبر کے امتی ہونے کا حق ہے اور نہ پیغمبر کی شفاعت میں حصہ دار بننے کا۔ وہ شخص جس کو آج کی زندگی میں پیغمبر کا طریقہ پسند نہ ہو وہ کل کی زندگی میں پیغمبر کا رفیق کس طرح بن سکتا ہے۔

صحابی کی نصیحت

اُطْلُبْ قَلْبَكَ فِي ثَلَاثَةِ مَوَاطِنَ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ
وَفِي مَجَالِسِ الذِّكْرِ وَفِي أَوْقَاتِ الْخَلْوَةِ فَإِنْ لَمْ
تَجِدْهُ فِي هٰذِهِ الْمَوَاطِنِ فَسَلِ اللّٰهَ أَنْ يَمُنَّ عَلَيْكَ
بِقَلْبٍ فَإِنَّهُ لَا قَلْبَ لَكَ (عبداللہ بن مسعود)

تین مواقع پر تم اپنے دل کو تلاش کرو۔ قرآن سننے کے وقت،
ذکر کی مجلسوں میں اور تنہائی کے اوقات میں۔ اگر ان مواقع
پر تم اس کو نہ پاؤ تو اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو ایک دل دیدے۔
کیوں کہ تمھارے پاس دل نہیں ہے۔

انسان کے سینہ میں دل اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ خدا کی تجلیات کا مسکن بنے۔ دل گویا خدا کا گھر ہے۔ اس لیے جب خدا کا کلام پڑھا جائے تو چاہیے کہ انسان کا دل اس سے دہل اٹھے۔ جب خدا کا چرچا کیا جائے تو دل اس کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ جب آدمی اپنی تنہائیوں میں ہو تو اس کا دل خدا کو اپنا ہم نشین پائے اور اس پر وہ تجربات گزریں جو خدا کی یاد سے قلبِ انسانی پر گزرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کا دل زندہ ہے۔ وہ فی الواقع صاحبِ دل ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دل مر چکا ہے۔ اس کو وہ دل حاصل نہیں جو خدا کی تجلیات کا مہبط بن سکے۔ وہ لمحات جب کہ دل کے تار خصوصی طور پر جاگ اٹھتے ہیں، اس وقت بھی اس کے دل کے تار نہیں جاگتے۔ وہ یاد دلانے والے مواقع جب کہ انسان خدا کے بہت قریب پہونچ جاتا ہے، وہ مواقع بھی اس کو خدا کی یاد دلانے والے ثابت نہیں ہوسکتے۔ ایسے آدمی کو جاننا چاہیے کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع (دل) سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ جس چیز کی دعا کرنی چاہیے وہ یہ کہ اس کا رب اس کو دوبارہ ایک دل عطا کر دے۔

یکم مئی ۱۹۸۶

حکمتِ اسلام

حافظ ابو خیثمہ زہیر بن حرب النسائی (۲۳۴ - ۱۶۰ھ) نے اپنی "کتاب العلم" میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

عن ابی عبد الرحمٰن ان علیاً علیہ السلام مرّ بقاصٍّ فقال: اَتعرف الناسخ من المنسوخ۔ قال لا۔ قال هلكتَ و اهلكتَ (صفحہ ۳۱)	حضرت ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن حبیب السلمی تابعی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کو جمع کر کے تقریر کر رہا تھا۔ انھوں نے اس سے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ منسوخ کیا ہے اور ناسخ کیا۔ مقرر نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ناسخ اور منسوخ کا لفظ یہاں اس محدود مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے جو موجودہ زمانہ میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس سے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے جو کہ اس لفظ کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے داعی اور مصلح کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو جانے۔ جو شخص ناسخ اور منسوخ کے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ نہ جانے وہ مصلح نہیں مفسد ہے۔ وہ اگر دعوت و اصلاح کے لیے اٹھتا ہے تو یقینی طور پر وہ خود بھی ہلاک ہوگا اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے کا ذریعہ بنے گا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ناسخ اور منسوخ کا تعلق چند مخصوص احکام سے ہے اور وہ ابدی ہے۔ مثلاً ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد سورہ بقرہ (رکوع ۱۷) کی آیات اتریں اور پچھلا حکم منسوخ ہوگیا اور کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ نسخ کے جو احکام ہیں وہ ابدی ہیں جو چیز منسوخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے منسوخ ہے۔ اور جو چیز ناسخ ہے وہ ہمیشہ کے لیے ناسخ ہے۔

مگر یہ خیال درست نہیں۔ ناسخ اور منسوخ کا معاملہ نہ تو چند خاص احکام سے متعلق ہے اور نہ وہ

غیر مبدل ہے۔ ناسخ اور منسوخ ایک مستقل شرعی اصول ہے۔ اس کا تعلق اس اہم چیز سے ہے جس کو عملی حکمت (Practical wisdom) کہا جاتا ہے۔ اور وہ پورے دین سے متعلق ہے نہ کہ محض چند احکام سے متعلق۔ اس اصول کے تحت کبھی ایک حکم میں تدریج کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شراب کے معاملہ میں کیا گیا۔ چنانچہ شراب کو تین مرحلہ میں حرام قرار دیا گیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حالات کی رعایت سے ایک طرح کا حکم مطلوب ہوتا ہے اور کبھی بدلے ہوئے حالات کے اعتبار سے دوسرا حکم مطلوب ہو جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ داعی کو یہ فریضہ انجام دینا ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے تقاضوں کو وقت کے عملی حالات پر منطبق کرے۔ وہ لوگوں کو عین تقاضائے وقت کے مطابق صحیح دینی مشورہ دے۔ اب جو شخص ناسخ اور منسوخ ، بالفاظ دیگر دین کی عملی حکمتوں اور مصلحتوں کو جانے گا وہی شخص لوگوں کو صحیح رہنمائی دے سکتا ہے۔ جو شخص دین کے حکیمانہ پہلو کو نہ جانے وہ دین کے نام پر بے دینی کی بات کرے گا۔ وہ لوگوں کو غلط راہوں میں دوڑانا شروع کر دے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی حکمتِ اسلام کا نہایت عظیم اور کامل نمونہ ہے۔ آپ نے مکہ میں صبر کے اصول پر عمل کیا اور مدینہ میں دفاع اور قتال کے اصول پر۔ یہ بھی نسخ ہی کا ایک معاملہ تھا۔ یعنی مکہ کے حالات کے تحت وہاں آپ کے لیے صبر کا حکم تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ کے حالات کے تحت صبر کا حکم منسوخ ہو گیا اور دفاع اور قتال کا حکم دے دیا گیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ صبر کا اصول ہمیشہ کے لیے متروک اور منسوخ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک اصولی حکم کے طور پر بدستور باقی ہے اور جب بھی اور جہاں بھی مکہ جیسے حالات پائے جائیں گے صبر کا حکم وہاں دوبارہ اسی طرح مطلوب ہو جائے گا جس طرح وہ ابتداءً مکی دور میں مطلوب تھا۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے غزوہ اُحد میں مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا اور غزوۂ خندق میں مدینہ میں رہ کر مقابلہ فرمایا۔ بدر کے موقع پر آپ نے اپنے دشمنوں سے جنگ کی اور حدیبیہ کے موقع پر انھیں دشمنوں سے یک طرفہ شرائط پر صلح کر لی۔ غزوۂ حمراء الاسد میں آپ نے اعلان و اظہار کے ساتھ سفر کیا اور فتح مکہ کے موقع پر کامل خاموشی کے ساتھ سفر کیا گیا۔ حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ایک انسانی گروہ کو دوسرے انسانی گروہ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر اپنے بعد خلافت

کے لیے آپ نے ہدایت فرمائی کہ امیر المومنین صرف قبیلہ قریش میں سے بنایا جائے۔ ایک قسم کے باغیوں کے لیے قرآن میں آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اطاعت قبول کرلیں (تقاتلونهم او یسلمون) دوسری طرف آپ کی ہدایت کے مطابق خلیفہ سوم حضرت عثمان نے اپنے باغیوں کے خلاف ہاتھ نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ بلا مقابلہ شہید ہوگیے۔ ایک طرف آپ نے فرمایا کہ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر۔ دوسری طرف آپ نے اپنے صحابہ کو شدت سے یہ تلقین کی کہ میرے بعد تمہارے اوپر ظالم حکمراں ہوں گے مگر تم ان کے خلاف جنگ نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ

جو شخص دعوت و اصلاح کے کام کے لیے اٹھے اس کو ناسخ اور منسوخ کے اس شرعی حکم سے باخبر ہونا چاہیے۔ اس کو اس حکمت بالغہ کو اچھی طرح جاننا چاہیے جس کے تحت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرح کے حالات میں ایک طریقہ اختیار فرمایا، اور دوسری طرح کے حالات میں اس کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر عمل کیا۔

جو شخص اس راز سے واقف نہ ہو اور اس کے باوجود وہ خطیب اور قائد بن کر کھڑا ہو جائے وہ اصلاح کے نام پر صرف بگاڑ پیدا کرے گا۔ مثلاً وہ لوگوں کو ایک مسلم حکمراں سے ٹکراؤ پر ابھارے گا۔ جب کہ اسلام کا حقیقی تقاضا اس وقت یہ ہوگا کہ سیاسی ٹکراؤ سے الگ رہ کر کام کیا جائے۔ وہ ایک مسلم گروہ کو یہ مشورہ دے گا کہ وہ اپنی حریف قوم کو نقصان پہونچا کر اس سے اپنے لیے زندگی کا حق وصول کریں جب کہ اسلامی حکمت اس وقت یہ چاہتی ہوگی کہ حریف قوم کے لیے نفع بخش بن کر اس کے درمیان اپنے لیے عزت کی جگہ حاصل کی جائے۔

ایسا شخص مسلم نوجوانوں کو پرجوش طور پر تلقین کرے گا کہ تم خالد سیف اللہ بنو جب کہ حالات پکار رہے ہوں گے کہ مسلم نوجوانوں کو داعی الی اللہ بننے پر ابھارا جائے۔ وہ مسلمانوں کو اسلام پر فخر کرنا سکھائے گا جب کہ باعتبار واقعہ اصل ضرورت یہ ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر تواضع والا اسلام پیدا کیا جائے۔ وہ اقدام و اظہار کی بات کرے گا جب کہ حالات کا تقاضا ہوگا کہ مسلمانوں سے وہ بات کہی جائے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مطالبۂ اظہار پر حضرت عمر فاروق سے فرمائی تھی: یا عمر انا قلیل (اے عمر، ہم تھوڑے ہیں)

ایسے لوگ صبر کے حالات میں ٹکراؤ کی سیاست چلائیں گے۔ جہاں چپ رہنا چاہیے وہاں

وہ بولنے کا کمال دکھائیں گے۔ جس موقع کے لیے خدا کا حکم ہوگا کہ خود اپنا احتساب کرو وہاں وہ احتسابِ اقوام اور احتساب کائنات کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ میں: خود بھی ہلاک ہوئے اور انھوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلم قائدین تقریباً سب کے سب حضرت علیؓ کے اس قول کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ وہ " ناسخ اور منسوخ " کی حقیقت سے بے خبر تھے۔ چنانچہ جہاں ناسخ پر عمل کرنا تھا وہاں انھوں نے منسوخ پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے جو غیر حکیمانہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے صرف بربادی کا سبب بنے۔

۱۸۵۷ میں علماء ہند کا انگریزوں سے جنگ کرنا بھی اسی کی ایک مثال ہے۔ علماء کے اس فیصلہ کے مطابق ہزاروں مجاہدین تھانہ بھون (سہارن پور) میں جمع ہو گیے، اور انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد کی باتیں ہونے لگیں۔ اس وقت صرف ایک عالم (مولانا شیخ محمد صاحب) اس مہم کے مخالف تھے۔ اس سلسلہ میں مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

" قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے۔ بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف کی بنا پر مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا۔ جب ہر دو حضرات پہونچ گیے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں ہم بالکل بے سر و سامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے سکوت فرمایا۔" (نقش حیات، جلد دوم ۱۹۵۴ صفحہ ۴۱)

مولانا شیخ محمد صاحب کی رائے اس معاملہ میں نہایت درست تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ کے مقابلہ کو بدر کے مقابلہ پر قیاس کرنا صحیح نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں اور ان

کے مخالفوں کے درمیان اسباب کا جو فرق تھا وہ صرف مقدار کے اعتبار سے تھا نہ کہ نوعیت کے اعتبار سے۔ جب کہ ۱۸۵۷ کی جنگ کے موقع پر مسلمانوں اور ان کے مخالفوں کے درمیان اسباب کا فرق خود نوعیت کے اعتبار سے پایا جا رہا تھا۔ یعنی بدر کے موقع پر تلوار کا مقابلہ تلوار (دستی ہتھیار کا مقابلہ دستی ہتھیار) سے تھا جب کہ ۱۸۵۷ کے موقع پر تلوار کا مقابلہ بندوق (دستی ہتھیار کا مقابلہ دور مار ہتھیار) سے تھا۔ آپ اسباب کی مقدار میں فرق کو جرأت کے اضافہ سے پورا کر سکتے ہیں۔ مگر اسباب کی نوعیت کے فرق کو جرأت کے اضافہ سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بدر کے مقابلہ میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور ۱۸۵۷ کے مقابلہ میں مخلص اور متقی مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود کامیابی حاصل نہ کی جا سکی۔

اس معاملہ کو مزید سمجھنے کے لیے غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کا مطالعہ کیجیے۔ فتح مکہ کے فوراً بعد یہ دونوں غزوات پیش آئے۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ دونوں غزوات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو الگ الگ طریقے اختیار فرمائے۔ حنین کے موقع پر آپ نے مخالفین سے باقاعدہ جنگ کی۔ اس کے برعکس طائف کے موقع پر صورت حال کا اندازہ کرنے کے بعد آپ لڑائی کیے بغیر واپس چلے آئے۔

قریش کے بعد عرب میں دو بڑے قبیلے، ہوازن اور ثقیف تھے۔ وہ ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ فتح مکہ کے بعد ان قبائل نے اطاعت قبول نہیں کی بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا منصوبہ بنایا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ مکہ سے چل کر حنین پہونچے۔ یہاں قبیلہ ہوازن کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ کھلے میدان میں تھا۔ اس مقابلہ میں آخر کار مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

اس کے فوراً بعد آپ نے قبیلہ ثقیف پر چڑھائی کی مگر یہاں صورت یہ تھی کہ قبیلہ ثقیف طائف میں رہتا تھا۔ جو مکمل طور پر حصار میں تھا۔ شہر طائف کے چاروں طرف پتھر کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے لیے براہ راست مقابلہ میں یہ دیواریں حائل ہو گئیں۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ دیواروں کے اوپر مورچہ سنبھالے ہوئے تھے اور مسلمان دیوار کے نیچے میدان میں تھے۔ ثقیف والوں نے مسلمانوں پر تیر برسائے مسلمان اس کے باوجود دیوار تک پہونچ گئے۔ تو انھوں نے اوپر سے گرم کیا ہوا لوہا گرانا شروع کیا اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسلم فوجوں کو واپسی کا حکم دے دیا۔

قبیلہ ہوازن سے مسلمانوں کا مقابلہ برابری کا مقابلہ تھا۔ اس لیے وہاں پورا مقابلہ کیا گیا۔ اس

کے برعکس قبیلہ ثقیف سے مقابلہ کے وقت دونوں فریق برابر کی حیثیت میں نہیں تھے۔ ایک فریق زمین پر تھا اور دوسرا فریق قلعہ کی دیواروں پر۔ ایک فریق کے لیے کارروائی کرنے کے راستے بند تھے اور دوسرا فریق اپنی کارروائی کرنے کے لیے پوری طرح آزاد تھا۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر قبیلہ ہوازن سے مقابلہ کیا گیا اور قبیلہ ثقیف سے مقابلہ نہیں کیا گیا۔ ایک قبیلہ کے مقابلہ میں جو چیز "ناسخ" کی حیثیت رکھتی تھی وہ دوسرے قبیلہ کے معاملہ میں "منسوخ" قرار پائی۔

قرآن میں فکر و عمل کا جو معیار بتایا گیا ہے وہ بلاشبہ مستقل ہے۔ مگر عملی تقاضے ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے شخصی مزاج اور اجتماعی احوال میں فرق کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اسی کے لحاظ سے شریعت کے انطباق میں بھی فرق کیا جائے۔ یہ فرق ابدی نہیں ہوتا بلکہ حالات کی بنا پر صرف وقتی ہوتا ہے۔ دین میں اگر یہ حکمت موجود نہ ہو تو وہ ابدی دین نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی دعوتی مہم کو نتیجہ خیز طور پر موجودہ اسباب کی دنیا میں چلایا جا سکتا ہے۔

مثلاً قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف دونوں کے معاملہ میں یکساں طور پر یہ مطلوب تھا کہ انھیں اسلام کے ماتحت لایا جائے۔ مگر انھیں اسلام کے تحت لانے کے لیے آپ نے دو الگ الگ طریقے اختیار فرمائے۔ ہوازن کے معاملہ میں اگر جنگ مطلوب تھی تو ثقیف کے معاملہ میں جنگ منسوخ قرار پائی۔ اسی طرح ثقیف کے معاملہ میں اگر غیر جنگی طریقہ کار مطلوب تھا تو ہوازن کے معاملہ میں وہ متروک قرار دیدیا گیا۔

ڈاکٹر رین ہولڈ (Dr. Reinhold Niebuhr) نے اپنی ایک پسندیدہ دعا لکھی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: خدا مجھے وہ متانت دے کہ میں ان چیزوں کو قبول کرسکوں جن کو میں بدل نہیں سکتا۔ وہ مجھے حوصلہ دے کہ میں ان چیزوں کو بدلوں جن کو میں بدل سکتا ہوں۔ اور خدا مجھے وہ عقل دے کہ میں فرق کو جان سکوں:

God grant me the serenity
To accept the things I cannot change;
The courage to change the things I can;
And the wisdom to know the difference.

ڈاکٹر رین ہولڈ نے اسی بات کو فطرت کی زبان میں کہا ہے جس کو حضرت علیؓ نے شریعت کی زبان میں فرمایا۔ اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی دانش مندی یہ ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔ اسی "فرق" کو جاننے میں تمام اجتماعی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

تدریج کی ضرورت

اگر یہ سوال کیا جائے کہ گھر کیا ہوتا ہے تو گھر کی پوری تصویر اس کے تمام اجزار سمیت بیک وقت آدمی کے سامنے رکھ دی جائے گی۔ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ گھر کیسے بنتا ہے تو جواب کی شکل دوسری ہوگی۔ اب کہا جائے گا کہ پہلے زمین کی فراہمی، پھر بنیاد، اس کے بعد دیواریں، اس کے بعد چھت وغیرہ۔ اسی طرح اگر سوال کیا جائے کہ درخت کیا ہے تو جواب دینے والا بیک وقت پورے درخت کا تعارف کرائے گا۔ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ درخت کیسے وجود میں آتا ہے تو جواب دینے والا دوبارہ ایک ترتیب کے ساتھ اجزار درخت کا ذکر کرے گا —— پہلے زمین، اس کے بعد بیج، پھر پانی اور حفاظت، یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا درخت۔

یہی معاملہ اسلام کا بھی ہے۔ اگر سوال یہ ہو کہ "اسلام کے احکام کیا کیا ہیں" تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث میں جن احکام کا ذکر ہے، ان سب کی فہرست تیار کرکے رکھ دی جائے لیکن اگر سوال کرنے والا یہ سوال کرے کہ "اسلام کی اشاعت کیسے کی جائے" تو جواب کی شکل بدل جائے گی۔ اب "الاقدم فالاقدم" کے اصول پر جواب دیا جائے گا۔ اب بتایا جائے گا کہ اسلام میں بہت سے احکام ہیں مگر اس کے کچھ اجزار پہلے مرحلہ میں مطلوب ہیں اور کچھ اجزار بعد کے مرحلہ میں۔

بیانِ احکام میں فہرست مطلوب ہوتی ہے اور اشاعتِ احکام میں ترتیب۔ ایک صورت میں تمام احکام بیک وقت بتانے ہوتے ہیں، جب کہ دوسری صورت کا تقاضا ہوتا ہے کہ احکام کو تدریج کے ساتھ ایک کے بعد ایک سامنے لایا جائے۔

تمام کتب فقہ "بیان احکام" کے اسلوب پر لکھی گئی ہیں، اس لیے ان میں ایک ہی کتاب میں تمام احکام کی تفصیل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر دعوت واشاعت کے مصالح اس سے الگ ہیں۔ فقہ میں اگر فہرست بندی کی اہمیت ہے تو دعوت واشاعت میں ترتیب و تدریج کی۔ دعوت واشاعت کے کام کی یہی حکمت ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی ہے جو صحاح ستہ کی تمام کتابوں میں مختلف طریقوں سے منقول ہوئی ہے:

قال البخاری؛ حدثنا حبّان، اخبرنا عبد الله، عن زکریا بن ابی اسحاق، عن یحییٰ بن

عبد اللہ بن صیفی، عن ابی معبد مولی ابن عباس، عن ابن عباس، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ بن جبل حین بعثہ الی الیمن: "انک ستاتی قوما اهل کتاب، فاذا جئتهم فادعهم الی ان یشهدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ، فان هم اطاعوا لک بذالک فاخبرهم ان اللہ فرض علیهم خمس صلوات فی کل یوم ولیلة، فان هم اطاعوا لک بذالک فاخبرهم ان اللہ فرض علیهم صدقة تؤخذ من اغنیائهم فترد علی فقرائهم، فان هم اطاعوا لک بذالک فایاک وکرائم اموالهم، واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها وبین اللہ حجاب"

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے کہا۔ تم ایک ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جو اہل کتاب ہیں۔ جب تم ان کے پاس پہونچو تو ان کو دعوت دو کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اوپر ہر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان کے اوپر زکواۃ فرض کی ہے جو کہ ان کے دولت مندوں سے لی جاتی ہے اور ان کے غریبوں کو لوٹا دی جاتی ہے۔ پس اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو اس سے بچو کہ تم ان کا صرف اچھا مال لو۔ اور مظلوم کی پکار سے ڈرو، کیوں کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ آپ نے بیانِ احکام اور عملی مطالبہ میں فرق فرمایا ہے۔ حکم بیان کرتے وقت تو آپ نے تمام ضروری احکام بیان فرمائے۔ مگر عمل کے مطالبہ کے معاملہ میں آپ نے نرمی اور رخصت کا اور ترتیب و تدریج کا لحاظ فرمایا۔

مثلاً قبیلہ ثقیف (طائف) کا وفد رمضان ۹ھ میں مدینہ آیا۔ یہ لوگ چھ آدمی تھے۔ اور ان کے سردار عبد یالیل تھے۔ یہ لوگ مسجد نبوی میں ٹھہرائے گیے۔ وہ کئی دن تک قرآن کو سنتے رہے اور اسلام کے احکام و مسائل کی بابت دریافت کرتے رہے۔

اس سلسلہ میں جو تفصیلات سیرت و حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ان سے معلوم

ہوتا ہے کہ احکام اسلام کو بیان کرنے کے معاملہ میں ان سے کوئی کمی نہیں کی گئی۔ تمام احکام پوری طرح سنائے جاتے رہے اور بیان کیے جاتے رہے۔ مگر احکام کے عملی مطالبہ کے معاملہ میں ان سے حسب گنجائش رخصت کا اور تدریج کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

قال الامام احمد : حدثنا عفان، حدثنا محمد بن مَسلمة، عن حُمید، عن الحسن، عن عثمان بن ابی العاص، ان وفد ثقیف قدموا علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فانزلهم المسجد لیکون ارقّ لقلوبهم، فاشترطوا علیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (الّا یصلّوا) والّا یُحشروا ولا یعشّروا ولا یجبوا ولا یستعمل علیهم غیرهم، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: "لکم الّا تحشروا ولا تعشروا ولا یستعمل علیکم غیرکم، ولا خیر فی دین لا رکوع فیه"

ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ آیا۔ آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا تاکہ وہاں کے ماحول سے ان کے دل نرم ہوں۔ انھوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ انھیں جہاد کے لیے جمع نہیں کیا جائے گا۔ اور اُن سے عُشر نہیں لیا جائے گا اور ان پر ٹیکس نہیں لگایا جائے گا اور ان کے اوپر کسی غیر کو حاکم نہیں بنایا جائے گا اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ تم سے جہاد میں شرکت کے لیے نہیں کہا جائے گا اور تم پر عُشر نہیں لگایا جائے گا اور تمہارے اوپر کسی غیر کو حاکم نہیں بنایا جائے گا۔ اور اس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں اللہ کے آگے جھکنا نہ ہو۔

ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے :

قال ابوداوٗد : حدثنا الحسن بن الصباح، حدثنا اسماعیل بن عبد الکریم، حدثنی ابراهیم بن عقیل بن معقل بن منبه، عن وهب، سالت جابراً عن شان ثقیف اذ بایعت قال: اشترطت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان لا صدقة علیها ولا جهاد، وانه سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول بعد ذالك: "سیتصدقون ویجاهدون اذا اسلموا"

وہب کہتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے ثقیف کی بابت پوچھا جب کہ انھوں نے بیعت کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ثقیف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط لگائی کہ ان پر زکواۃ نہ ہوگی اور ان

پر جہاد نہ ہوگا۔ اور یہ کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شرط مان لی) اور اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو آئندہ وہ زکواۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔

اس رخصت یا حکمت تدریج کے لیے کوئی ایک ہی لگا بندھا اصول مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر حالات سے ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ رخصت برتی جارہی ہے، یا جن کے ساتھ تدریج کا معاملہ کیا جارہا ہے، ان کی استعداد اور حالات کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے گا نہ کہ کسی مطلق اصول یا کسی متعین فہرست کی بنیاد پر۔

اس نظریہ کے حق میں ایک ثبوت یہ ہے کہ ثقیف کے ساتھ صدقہ اور جہاد کے معاملہ میں رخصت کا معاملہ اختیار کیا گیا۔ مگر اسی صدقہ اور جہاد کی رخصت ایک اور شخص نے طلب کی تو اس کو اس کی رخصت نہیں دی گئی۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

عن بُشَير بن الخصاصية رضى الله عنه قال: اتيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم لابايعه فقلت علام تبايعنى يارسول الله. فمدّ رسول الله صلى الله عليه وسلم يده فقال: تشهد ان لا اله الّا الله وحده لاشريك له وتصلى الصلوات الخمس لوقتها وتؤدى الزكوٰة المفروضة وتصوم رمضان وتحج البيت، وتجاهد فى سبيل الله" قلت يارسول الله، كلاًّ نطيق الّا اثنتين فلا اطيقهما الزكوٰة، والله مالى الّا عشر ذَود هُنّ رسل اهلى وحمولتهن. واما الجهاد فانى رجل جبان، ويزعمون انّه من ولّى فقد باء بغضب من الله، واخاف ان حضر القتال ان اخشع بنفسى فافرّ فابوء بغضب من الله. فقبض رسول الله صلى الله عليه وسلم يده ثم حرّكها، ثم قال: "يابشير. لاصدقة ولاجهاد: فبِمَ اذن تدخل الجنة؟" قلت: يارسول الله، ابسط يدك ابايعك، فبسط يده فبايعته عليهن كلّهن. كذا فى كنز العمال (۱۲/۷) واخرجه احمد، ورجاله موثقون كما قال الهيثمى (۴۲/۱)

بُشیر بن خصاصیہ رض کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تاکہ بیعت کروں (اور اسلام میں داخل ہوجاؤں) میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ مجھ سے کس چیز پر بیعت لیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اور تم پانچ نمازیں ان کے وقت پر پڑھو، اور تم فرض زکواۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔ اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں یہ سب کرسکتا ہوں سوا دو کے، کیوں کہ میں ان دو کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک، زکواۃ۔ خدا کی قسم، میرے پاس صرف دس اونٹ اور اونٹنیاں ہیں۔ وہ میرے گھر والوں کے لیے دودھ کا ذریعہ بھی ہیں اور بار برداری کا بھی۔ اور جہاں تک جہاد کا معاملہ ہے تو میں ایک بزدل آدمی ہوں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص جہاد کے میدان سے پیٹھ پھیرے تو وہ خدا کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ جب جنگ کا موقع ہو تو میں ڈر جاؤں اور میدان سے بھاگ جاؤں، پھر میں اللہ کے غضب کا مستحق بنوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کو حرکت دیتے ہوئے کہا کہ اے بشیر، نہ صدقہ اور نہ جہاد، پھر تم کیسے جنت میں جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ سے بیعت کرتا ہوں۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان سب چیزوں پر آپ سے بیعت کی۔

قرآن کے متعلق معلوم ہے کہ وہ بیک وقت ایک کامل کتاب کی صورت میں نہیں اترا، بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ترتیب وار اترا۔ اس طرح اس کے نزول میں ۲۳ سال لگ گیے۔ قرآن کے اس طرح نازل ہونے کا سبب کیا تھا، اس کا جواب حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ملتا ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

انما نزل اول ما نزل سورۃ من المفصل، فیھا ذکر الجنۃ والنار۔ حتی اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً۔ ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً (بخاری، باب تالیف القرآن)

قرآن میں پہلے وہ مکی سورتیں اتریں جن میں جنّت اور جہنّم کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گیے تب حلال اور حرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے۔

بیانِ احکام میں ہمیشہ فہرست بندی مطلوب ہوتی ہے اور نفاذِ احکام میں ہمیشہ ترتیب و تدریج۔

نسخ کی حقیقت

ہندستان ٹائمس (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵) میں صفحہ ۹ پر مسٹر اندرسین شرما کا ایک خط چھپا ہے۔ وہ مسلم نقطۂ نظر کے بارہ میں ایک مطبوعہ خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

> Syed Shahabuddin's letter is misleading. He says that an injunction in the Quran is unchangeable and could not be changed by the Holy Prophet. This is far from truth as many revelations (Ayat) were cancelled and replaced in the changed circumstances.

سید شہاب الدین کا خط غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کا ایک حکم ناقابل تغیر ہے اور خود پیغمبر اسلام بھی اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ بات حقیقت سے بہت دور ہے۔ کیوں کہ قرآن کی بہت سی آیتیں بعد کو منسوخ کر دی گئیں اور بدلے ہوئے حالات میں دوسری آیتیں ان کی جگہ پر خدا کی طرف سے بھیجی گئیں۔

قرآن کی آیتوں میں نسخ کی یہ تشریح صحیح نہیں۔ نسخ کا مطلب کینسل کرنا نہیں ہے۔ یہ تدریج (Gradation) کی ایک صورت ہے۔ یہ دراصل حکمتِ اصلاح ہے نہ کہ کسی حکم کو مستقل طور پر کینسل کر دینا۔

قرآن کا طریقہ تدریجی اصلاح کا طریقہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ قرآن جب کسی برائی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے اس کے بارہ میں ایک ابتدائی حکم دیتا ہے۔ اس ابتدائی حکم کا مقصد ذہن تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد جزئی عمل کا حکم آتا ہے جو گویا قرآن کا درمیانی حکم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس معاملہ کی آخری آیت اترتی ہے اور پورے عمل کا حکم دے دیا جاتا ہے۔

اس تدریجی قانون سازی کی ایک مثال شراب ہے۔ قرآن میں ابتداءً جب شراب کے بارہ میں حکم آیا تو صرف اتنا کہا گیا کہ شراب کا گناہ اس کے فائدہ سے زیادہ ہے (البقرہ ۲۱۹) اس کے ایک عرصہ بعد دوسرا حکم ان الفاظ میں آیا کہ جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے لیے مسجد میں نہ آؤ (النساء ۴۳) اس کے ایک عرصہ بعد قرآن کا آخری حکم آیا اور یہ کہا گیا کہ شراب ایک شیطانی فعل ہے، اس لیے تم اس سے مکمل پرہیز کرو (المائدہ ۹۰)

قرآن میں نسخ کی یہ ایک بہت واضح مثال ہے۔ مگر یہ پورا معاملہ حکمتِ تدریج سے تعلق رکھتا

ہے۔ نہ یہ کہ آخری حکم کے سوا بقیہ تمام آیتیں ہمیشہ کے لیے منسوخ ہو گئیں۔ شراب کے بارہ میں قرآن کا معیاری حکم یہی ہے کہ وہ مکمل طور پر حرام ہے۔ مگر جب کسی سماج میں اس حکم کو نافذ کرنا ہو تو دوبارہ سماج کی حالت دیکھی جائے گی اور حکم کے نفاذ میں دوبارہ اس تدریج کو ملحوظ رکھا جائے گا جو ابتداءً شارع نے اختیار فرمایا تھا۔

نفاذ شریعت

قرآن کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب دعوت بھی۔ ہدایت ہونے کے اعتبار سے قرآن میں وہ سب باتیں اپنی کامل صورت میں درج ہیں جو انسان کی حقیقی صلاح و فلاح کے لیے ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن نے کسی چیز کو ادھورا نہیں چھوڑا ہے۔ بلکہ ہر چیز کو کامل طور پر بیان کر دیا ہے۔

مگر دعوت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں کہ دعوت میں مدعو کے حالات کی رعایت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔ یہی دوسرا پہلو ہے جس نے قرآن میں "نسخ" کا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ بیانِ ہدایت کے پہلو سے قرآن معیار اعلیٰ کو سامنے رکھتا ہے۔ مگر دعوت و اصلاح کے پہلو سے اس میں یہ ابدی رہنمائی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے کہ لوگوں کے مزاج کی رعایت سے کس طرح تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا جائے اور حالات کے فرق سے کس طرح احکام کے نفاذ میں فرق کیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں یہ مہم چل رہی ہے کہ شریعت کے قوانین کو حکومت کی طاقت سے جاری و نافذ کیا جائے۔ مگر اس قسم کی تمام کوششیں اب تک سراسر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہ تمام تحریکیں "نسخ" کی حکمت کو ملحوظ رکھے بغیر چلائی جا رہی ہیں۔

اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے حق میں ذہنی فضا تیار کی جائے۔ جب معاشرہ کی قابل لحاظ تعداد ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو جائے تو قانون کو جزئی طور پر نافذ کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے استعداد میں اضافہ ہو قانون کے مزید اجزاء نافذ کیے جائیں۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے پورا قانون اپنی آخری شکل میں نافذ کر دیا جائے۔

شریعت کی یہی خاص حکمت ہے جس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لفظوں میں بیان فرمایا:

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصّل   قرآن میں پہلے وہ مفصل سورتیں اتاری گئیں جن میں

فیھا ذکر الجنۃ والنار۔ حتیٰ اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً۔

(بخاری باب تالیف القرآن)

جنت اور جہنم کا بیان ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے لیے ہموار ہو گیے تو حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ اترتا کہ زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

شریعت کی یہ حکمت قرآن سے اور سیرت رسول سے انتہائی واضح ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے پرجوش اسلامی قائدین اس شرعی حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور اسی لیے وہ ناکام رہے۔

ستمبر ۱۹۸۳ میں سوڈان میں سابق صدر نمیری اور الاخوان المسلمون نے ملک میں کامل شراب بندی کا اعلان کیا۔ انھوں نے بعض دکانوں پر چھاپہ مار کر شراب کی کچھ بوتلیں حاصل کیں۔ اور ان کو توڑ کر ان کی شراب دریائے نیل میں بہادی۔ مگر اس کے بعد یہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا کہ دورِ نبوت کے مدینہ کی طرح سوڈان کی سڑکوں اور گلیوں میں بھی شراب بہائی جانے لگے۔ اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام نے تدریج کے اصول پر شراب کو بند کیا تھا۔ جب کہ سوڈان کے اسلامی لیڈروں نے اچانک شراب کو بند کرنا چاہا۔ چنانچہ وقتی تالیوں کی گونج اور چند دن کی اخباری سرخیوں کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہو سکا۔ صرف ایک سال بعد سوڈان کی "اسلامی حکومت" ختم ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے اسلامی احکام بھی۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں ان تمام مسلم ملکوں کا ہوا ہے جہاں انقلابی مسلم لیڈروں نے اسلامی قوانین کو نافذ کرنا چاہا۔ اسلام کی حکمتِ نسخ کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ان کی تمام کوششیں صد فی صد ناکام ہو کر رہ گئیں۔ لفظی ہنگاموں کے سوا ان کے حصہ میں اور کچھ نہ آیا۔

سید احمد شہید کی مثال

مسلمان پچھلے تقریباً ڈیڑھ سو سال سے اسی ناکام کہانی کو دہرا رہے ہیں۔ وہ "نسخ" کے قرآنی اصول پر عمل کیے بغیر اقدام کرتے ہیں اور پھر سراسر ناکام رہتے ہیں۔

اس سلسلہ کا پہلا نمایاں واقعہ سید احمد شہید بریلوی (۱۷۸۵ - ۱۸۳۱) کی وہ تحریک تھی جس کو

عام طور پر تحریک مجاہدین کہا جاتا ہے۔ وہ یوپی، بہار اور بنگال سے اپنے معتقدین کو لے کر پنجاب پہونچے۔ وہاں انھوں نے پشاور کو "فتح" کیا اور اس میں اسلامی قانون کی حکومت قائم کر دی۔

مگر یہ اسلامی حکومت بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کے اوپر اسلامی قانون کی حکومت قائم کی گئی وہ اگرچہ نسلی طور پر مسلمان تھے مگر اسلامی قانون کو قبول کرنے کا مزاج ان کے اندر بالکل پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ مقامی مسلم آبادی سید صاحب کے عمال کی باغی ہو گئی۔ وہاں کے قبائلی سرداروں نے سید صاحب کے آدمیوں کو قتل کر ڈالا، اور خود سید صاحب کا یہ حال ہوا کہ انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انتہائی غیر حکیمانہ جنگ چھیڑ دی اور اس میں لڑتے ہوئے ۶ مئی ۱۸۳۱ کو قتل کر دیئے گیے۔ اسلامی حکومت بننے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ایک مورخ نے سید احمد شہید بریلوی کے حالات لکھتے ہوئے آخر میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

"مجاہدین کی اکثریت صرف نعرۂ جہاد پر جمع ہو گئی تھی۔ ان کی تربیت نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے اسلامی حکومت کو چلانے کی ذمہ داری سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ انھوں نے جس علاقہ میں اسلامی حکومت قائم کی وہاں کے عوام کے ذہن کو پہلے اس کے لیے تیار نہ کیا۔ سید صاحب کی حکومت نے اسلامی قانون کو نافذ کرتے ہوئے تدریج کا خیال نہ رکھا اور سارا اسلامی قانون فوراً نافذ کر دیا۔ اس سے عوام کے اندر اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔"

تاریخ پاکستان و ہند از شیخ محمد رفیق ایم اے، لاہور ۱۹۷۲، صفحہ ۳۳۵

مسلمانوں کے پرجوش لیڈروں کو نہ قرآن و سنت سے ہدایت ملی اور نہ ماضی اور حال کے واقعات ان کی آنکھ کھولنے والے ثابت ہوئے۔ وہ ایک ہی ناکام کہانی کو ڈیڑھ سو سال سے مسلسل دہرائے چلے جا رہے ہیں۔

نبوّت اور ختمِ نبوّت

کچھ لوگوں سے ختم نبوت کے اسلامی عقیدہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی نقلی اور عقلی دلیل بار بار تفصیل کے ساتھ بتائی جا چکی ہے۔ آپ اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ کرکے اس کو جان سکتے ہیں۔ اس وقت میں مختصر طور پر صرف ایک بات بیان کرتا ہوں جو اس معاملہ میں فیصلہ کن دلیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبوت کیا ہے۔ نبوت ابدی اصولوں کے اظہار کا نام ہے۔ جس طرح سائنس اصول فطرت کو بتاتی ہے، اسی طرح نبوت اصولِ انسانیت کو بتاتی ہے۔ یہ دونوں ہی ابدی ہیں۔ اصولِ فطرت کسی تبدیلی کے بغیر ابدی طور پر کائنات میں قائم ہیں۔ اسی طرح اصول انسانیت بھی جب ایک بار مستند طور پر دریافت ہو جائیں تو پھر وہ مستقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں دوبارہ کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

نبی کا کام بنیادی طور پر یہ ہے کہ وہ خدا کے تخلیقی منصوبہ سے انسان کو باخبر کرے۔ ہر پیغمبر نے اصلاً یہی کام انجام دیا ہے۔ پیغمبروں نے بتایا کہ انسان کا عرصۂ حیات دو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک، موت سے پہلے والی مختصر زندگی۔ دوسری، موت کے بعد آنے والی طویل اور ابدی زندگی۔ موجودہ زندگی انسان کی آخری منزل نہیں، وہ آخری منزل کی تیاری کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ پیغمبر نے ان اخلاقی اصولوں اور ان انسانی قدروں کو بتایا جن کو اختیار کرکے آدمی ابدی کامیابی حاصل کرتا ہے اور جن کو چھوڑ دینے سے وہ ابدی محرومی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔

اس تخلیقی منصوبہ کے مطابق، موجودہ دنیا دار العمل ہے، اور موت کے بعد آنے والی دنیا دار الجزاء۔ موجودہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے اور بعد والی دنیا آزمائش کے مطابق انعام پانے کی جگہ۔ پیغمبر کی آمد کا اصل مقصد یہی ہے کہ وہ انسان کو اس حقیقتِ واقعہ سے باخبر کرے۔ یہ پیغام خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہے۔ اس میں دسویں صدی یا بیسویں صدی یا چالیسویں صدی کے اعتبار سے فرق کا کوئی سوال نہیں۔

قدیم زمانہ میں بار بار نبی کے آنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ ایک پیغمبر کی لائی ہوئی ہدایت اس

کے بعد کے زمانہ میں محفوظ نہیں رہی۔ لوگوں کی سرکشی نے اسے بدل دیا، یا ضائع کر دیا۔ اسی لیے بار بار ضرورت پیش آئی کہ دوبارہ نبی آئے اور ازسرنو لوگوں کو صحیح حقیقت سے باخبر کرے۔ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ امکان ختم ہو گیا۔ آپ کے ذریعہ عالمی سطح پر جو انقلاب آیا وہ اس بات کی ضمانت بن گیا کہ خدا کی ہدایت دائمی طور پر کسی تحریف وتغیر کے بغیر باقی رہے۔ اب پریس کی ایجاد مزید ایک تائیدی اہتمام ہے جس کے بعد قرآن میں تبدیلی خود ظاہری اسباب کے اعتبار سے ناممکن ہو چکی ہے۔

واقعاتی ثبوت

نظری دلائل کے علاوہ، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد دنیا میں کوئی اور پیغمبر ظاہر نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ بذات خود ختم نبوت کا ثبوت ہے۔ یہ ایک واقعاتی شہادت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا سلسلہ عملی طور پر منقطع ہے۔

پھر میں نے کہا کہ پیغمبر ہونا اس قسم کی کوئی سادہ سی بات نہیں جیسے ایک شخص خطیب یا شاعر بن جاتا ہے۔ کسی انسان کا پیغمبر ہونا انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ جس طرح ساری تاریخ میں کبھی کوئی شخص یہ نہ کہہ سکا کہ میں کائنات کا خالق ہوں۔ اسی طرح کوئی غیر پیغمبر یہ کہنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ پیغمبری کا دعویٰ یا تو کوئی پاگل شخص کرے گا، یا وہ شخص کرے گا جو واقعۃً پیغمبر ہو۔

اس سلسلہ میں میں نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بتایا۔ میں نے کہا کہ ایک باباجی تھے جن کے پیروؤں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ۱۹۸۰ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے کچھ پیروؤں سے ایک بار میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے باباجی (Prophet of the time) (وقت کے پیغمبر) ہیں۔ میں نے بلا بحث ان سے کہا کہ آپ مجھے اپنے باباجی کے پاس لے چلئے اور ان سے کہئے کہ میرے سامنے وہ اپنی زبان سے یہ جملہ دہرائیں کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں۔"

اپائنٹمنٹ کے ذریعہ وقت طے ہوا۔ وہ لوگ مجھے باباجی کے ہیڈ کوارٹر پر لے گئے۔ وہاں کئی لوگوں کی موجودگی میں باباجی سے ملاقات ہوئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کی مجلس میں شریک رہا۔ مگر باباجی اپنی زبان سے یہ الفاظ دہرانے کی ہمت نہ کر سکے کہ "میں وقت کا پیغمبر ہوں۔" وہ صرف دوسری دوسری باتیں کرتے رہے۔ میں نے باباجی سے کہا کہ آپ کے پیروؤں نے مجھے

بتایا ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ میں وقت کا پیغمبر ہوں، مگر باباجی نے اس کا کوئی براہ راست جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ میں وہاں سے واپس چلا آیا۔

جن لوگوں سے یہ گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے دوبارہ کہا کہ مگر مرزا غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸- ۱۸۳۹) نے تو اپنے بارہ میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ خلل ذہنی کا شکار تھے، وہ کوئی صحیح الدماغ آدمی نہ تھے۔ ایسا شخص کوئی بھی لغو بات کہہ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کا غیر فصیح کلام خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کسی پیغمبر کا کلام نہیں۔

تاہم اس سے قطع نظر، ان کے اصل دعویٰ پر غور کیجئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ظلّی یا بروزی پیغمبر ہیں۔ یعنی وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز (Reappearance) ہیں۔ ان کا یہ قول اپنی تردید آپ ہے۔ جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز ہیں تو قدرتی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں جانچ کر ان کے دعویٰ کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کیا جانا چاہئے۔ یہ کہہ کر مرزا غلام احمد قادیانی نے خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اوپر جج مان لیا۔ بالفاظ دیگر ان کی نبوت کو جانچنے کا معیار خود وہ ذات قرار پائی جو اپنے بعد کسی اور نبی کا پیشگی انکار کر چکی ہے۔ یہ کیسی عجیب تردید ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی نے خود ہی اپنے خلاف فراہم کر دی ہے۔

اب مرزا غلام احمد قادیانی کو پیغمبر ماننے کی شرط اول یہ ہوگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تعلیمات سے یہ ثابت کیا جائے کہ آپ کے بعد ظلّی یا بروزی پیغمبر آئیں گے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے پورے ذخیرہ (نیز قرآن) میں اس کے حق میں کوئی دلیل موجود نہیں۔ قرآن میں آپ کو خاتم النبیین بتایا گیا ہے (الاحزاب ۴۰) اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتًہ یہ فرما دیا ہے کہ میرے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ میرے بعد نبوت کے ایسے دعویدار تو اٹھ سکتے ہیں جن کا جھوٹا ہونا عیاناً ثابت ہو، مگر میرے بعد کسی سچے نبی کی آمد ممکن نہیں:

عن ثوبان ، قال رسول اللہ صلی اللہ	حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی
علیہ وسلم .... وانہ سیکون فی	اللہ علیہ وسلم نے فرمایا .... اور یہ کہ میری امت
امتی کذابون ثلاثون، کلھم	میں تیس جھوٹے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک

یزعم انه نبی، وانا خاتم النبیین لا نبیَّ بعدی (ابوداؤد، کتاب الفتن)

گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے۔ حالاں کہ میں آخری نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی اور نبی نہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا اپنے آپ کو محمد عربی کا بروزی پیغمبر کہنا ایک خود تردیدی دعویٰ ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ جب پیغمبر اسلام نے خود یہ نہ کہا ہو کہ میرے بعد میرا بروز ہوگا۔ یا آئندہ میرا بروزی پیغمبر آئے گا تو کیسے یہ مانا جاسکتا ہے کہ آپ کا بروز ہوا۔ ایسی حالت میں تو یہ دعویٰ اپنے آپ کٹ جاتا ہے۔

اسی داخلی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی موت کے بعد ان کی جماعت میں توجیہہ وتعبیر کا اختلاف پیدا ہوا اور ان کا فرقہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک فرقہ (احمدی فرقہ) نے ان کو مذکورہ معنوں میں نبی کہا۔ اور دوسرے فرقہ (لاہوری فرقہ) نے کہا کہ وہ صرف مجدد تھے۔

تاریخ کی تصدیق

پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور پر جلد ہی ڈیڑھ ہزار سال پورے ہونے والے ہیں۔ مگر اب تک ساری دنیا میں کوئی ایک بھی قابلِ ذکر شخص پیدا نہیں ہوا جو مستقل نبوت کا دعوی کرے، اور اس کا دعویٰ تاریخ میں برقرار رہے۔

آپ کے زمانہ میں عرب کے مسیلمہ الحنفی (م ۶۳۳ء) نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں محمدؐ کے ساتھ کارِ نبوت میں شریک کیا گیا ہوں (انِّی قد اُشرکتُ فی الامر معه) آپ نے اس کے شریکِ نبوت ہونے کا انکار کیا، اس لیے اس کا دعویٰ بے بنیاد ہو کر رہ گیا۔ عراق کے المتنبی (۹۶۵- ۹۱۵ء) نے جزئی نبوت کا دعویٰ کیا۔ مگر اپنی زندگی ہی میں وہ اپنے دعویٰ سے دست بردار ہو گیا۔ پنجاب کے گرونانک (۱۵۳۹- ۱۴۶۹ء) کو ان کے کچھ معتقدین اپنے طور پر پیغمبر کہہ دیتے ہیں۔ مگر خود انھوں نے کبھی اپنے آپ کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔ ان کے اپنے کلام کے مطابق، انھیں صرف ایک مذہبی یا روحانی پیشوا کہا جاسکتا ہے۔ ایران کے بہاء اللہ (۱۸۹۲- ۱۸۱۷) کا معاملہ بھی یہی ہے۔ انھوں نے پیغمبر خدا ہونے کا دعوی نہیں کیا، بلکہ مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ یعنی شیعہ عقیدہ کے مطابق، بارہواں امام جو رسول کی جگہ آئے گا۔ گویا ان کا دعویٰ جانشین رسول ہونے کا تھا نہ کہ رسول ہونے کا۔ اسی طرح ہندستان کے غلام احمد قادیانی (۱۹۰۸- ۱۸۳۹) نے اپنے آپ کو ذیلی پیغمبر کی حیثیت سے پیش کیا۔

مستقل پیغمبر کی حیثیت سے وہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اب ایک مورخ مزید آگے بڑھ کر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ آپ کے زمانہ میں جو چیز پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی تھی، آج وہ ایک تاریخی واقعہ بن چکی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ گنجائش ہے کہ آپ کے خاتم الرسل ہونے پر شبہہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ عقیدہ کے اعتبار سے خاتم الرسل ہیں، اور دوسرے لوگوں کے لیے تاریخی واقعہ کے اعتبار سے خاتم الرسل۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں خاتم النبیین (Seal of the prophets) کہا گیا ہے۔ یعنی نبیوں کی مہر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نبوت کے سلسلہ پر آخری مہر لگادی۔ اب اس فہرست میں کسی نئے نام کا اضافہ ہونے والا نہیں۔ اسی بات کو آپ نے ان لفظوں میں بیان فرمایا کہ اِنّی آخر الانبیاء (میں آخری نبی ہوں)

نزول قرآن سے لے کر اب تک کے زمانہ کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے یہ الفاظ تاریخ کا فیصلہ بن گیے۔ اس طویل مدت میں کوئی ایک شخص بھی نہیں جو بحیثیت نبی کے اٹھا ہو یا واقعی معنوں میں اس نے اپنی نبوت کا دعوی کیا ہو۔ آپ کے بعد کی تاریخ کا پورا ذخیرہ ایسے کسی شخص کے تذکرے سے خالی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب میں بعض مصلح قسم کے افراد کے اٹھنے کی خبر دی گئی ہے۔ اسی امکان کو کچھ افراد نے اپنی شخصی حوصلہ مندی کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً حدیث میں ایک "مہدی" کا ذکر ہے جس کو سنی مسلمان سادہ معنوں میں اور شیعہ حضرات مبالغہ آمیز معنی میں لیتے ہیں۔ اس کے حوالے سے کچھ لوگ مہدی ہونے کے دعویدار بن گیے۔ مسیحیت میں نیز اسلام میں حضرت مسیح کی آمد ثانی کا ذکر ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ کہنے لگے کہ میں مسیح موعود ہوں۔ اسی طرح ہندو دھرم میں بھگوان کے اوتار لینے کا تصور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو اوتار کے روپ میں پیش کرنا شروع کردیا۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد اٹھنے والے تمام مدعیوں کا معاملہ، ایک یا دوسری صورت میں یہی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد جن مدعیانِ نبوت کا نام لیا جاتا ہے، وہ غلط طور پر لیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ نبوت کی زمین پر نہیں اٹھے بلکہ دوسری زمینوں پر اٹھے۔ نبوت کی زمین آپ کے بعد

ایک ممنوعہ زمین بن گئی ، اور عملاً وہ آج تک ممنوعہ زمین بنی ہوئی ہے۔

نبوت ، کارِ نبوت

اس معاملہ میں صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کا تسلسل ختم ہوگیا ، مگر کارِ نبوت کا تسلسل جاری ہے۔ ایک انسان کا نبی کی حیثیت سے منتخب کیا جانا اور فرشتہ کے ذریعہ اس کا باقاعدہ ربط خدا سے قائم ہونا، یہ ایک انتہائی غیر معمولی اور استثنائی واقعہ ہے۔ اس قسم کا واقعہ صرف اس وقت ظہور میں لایا جاتا ہے جب کہ خدا کی ہدایت محفوظ صورت میں موجود نہ ہو۔ یہی واحد فیصلہ کن سبب ہے جو نبی کی پیدائش کو ضروری قرار دیتا ہے۔ مگر اب قرآن کی صورت میں خدا کی کتاب مکمل طور پر محفوظ ہو چکی ہے ، اس لیے اب کسی نئے نبی کی آمد کا سبب بھی باقی نہیں رہا۔ اب طالبانِ حق کو کسی نئے پیغمبر کا انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ پیغمبرِ آخر الزماں کے اسوہ کی روشنی میں خدا پرستی کے تقاضے پورے کرنا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ زندگی کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں ، وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس بنا پر بار بار ضرورت ہوتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں از سرِ نو خدا کا حکم معلوم کیا جائے۔ مگر حالات کی تبدیلی کے مسئلہ کا حل اجتہاد ہے نہ کہ نئی نبوت۔ قرآن اور حدیث میں تمام ضروری اور بنیادی احکام بتا دیئے گئے ہیں۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ حالات کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں جانچیں۔ اور اصل کے ذریعہ فرع کا اور کُل کے ذریعہ جزء کا حکم معلوم کریں۔ اب ہمیں نئی نبوت کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں صرف اس عالمانہ بصیرت کی ضرورت ہے جو "قدیم" احکام کو سمجھے اور "نئے" حالات پر ان کا انطباق (Application) دریافت کرسکے۔

ایک وضاحت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے زمانوں میں لگاتار پیغمبر بھیجے گئے (المومنون ۴۴) پیغمبروں کی یہ کثرت دین کے نزول میں کسی ارتقائی ترتیب کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کا مقصد حقیقت توحید کا اعلان تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام نبیوں کا دین ایک تھا اور اسی ایک دین کے اعلان و تبلیغ کے لئے وہ مختلف زمانوں میں دنیا میں آتے رہے۔

قدیم زمانہ میں بار بار ایسا ہوتا تھا کہ قوموں کی غفلت یا سرکشی کی بنا پر خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت اپنی اصلی اور ابتدائی صورت میں باقی نہیں رہتی تھی۔ طرح طرح کی غلط تعبیرات

اور انسانی الحاقات کی وجہ سے اصل دین ہی مشتبہ ہو جاتا۔ اور کسی بندہ خدا کے لئے یہ سمجھنا ناممکن ہو جاتا کہ خدا کا واقعی منشا کیا ہے۔ اس وقت دوبارہ پیغمبر بھیجا جاتا تاکہ وہ حق کو ناحق سے جدا کر دے۔ اور خدا کے حکم کو از سر نو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

قرآن میں بتایا گیا کہ لوگ ایک امت تھے۔ پھر انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ وہ ان باتوں کا فیصلہ کر دے جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلافات انھیں لوگوں نے کیے جن کو حق دیا جا چکا تھا۔ (البقرہ ۲۱۳)۔ یہی بات سورۃ الزخرف (آیت ۶۳) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں بتائی گئی ہے۔ اس طرح کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلا پیغمبر اپنے پچھلے پیغمبر کا بیان ثانی ہوتا ہے، نہ کہ بیان ارتقائی۔

خود پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن میں آپ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر بتا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں (النحل ۶۴)۔ یہی بات دوسرے مقام پر ان لفظوں میں کہی گئی ہے: بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر بہت سی ان چیزوں کو واضح کر رہا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں (النمل ۷۶)

قرآن کے مطابق، تمام پیغمبروں کا دین ایک تھا اور تمام پیغمبر اسی ایک دین کو لے کر دنیا میں آتے رہے (الشوریٰ) مگر بعد کے دور کے کچھ فخر پسند مسلمانوں نے اس واقعہ کی توجیہہ ایک اور انداز سے کرنی شروع کر دی۔ انھوں نے کہا کہ پچھلے دور میں پیغمبروں کی بار بار بعثت کا سبب پیغمبری کا غیر کامل سے کامل کی طرف سفر کرنا تھا۔ ان کے نزدیک پیغمبر کی نئی بعثت کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ "پہلے گزرے ہوئے پیغمبر کے ذریعہ مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو، لہٰذا تکمیل دین کے لئے مزید پیغمبر کی آمد ضروری ہو جائے"۔ مگر سارے قرآن میں کہیں بھی یہ نظریہ موجود نہیں۔

اس ارتقائی نظریہ کے ایک حامی "ختم نبوت، اتمام نعمت شریعت دین حق" پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بعثت محمدی کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں نسل انسانی گویا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ تک پہنچی تھی ... اب عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی۔ اور انسان

بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ اس لئے ساتویں صدی ہی موزوں و مناسب صدی تھی جب کہ نوع انسانی کے لئے آخری اور مکمل رہنمائی بھیج دی جائے۔"

اس ارتقائی نظریہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ اول، ساتویں صدی عیسوی میں عقل انسانی کا بلوغ کے مرحلہ تک پہنچنا۔ دوم، اس بلوغ کی بنیاد پر مکمل آسمانی ہدایت کا نزول۔ مگر یہ دونوں باتیں سراسر مفروضہ ہیں، وہ ثابت شدہ واقعہ نہیں۔

متعلقہ انسانی علوم "بلوغ" کے مذکورہ نظریہ کی بالکل تائید نہیں کرتے۔ مثلاً فلسفیانہ علم کو لیجئے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ساتویں صدی عیسوی تک فلسفیانہ علم اپنے بلوغ کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ کیوں کہ فلسفیانہ تعقل کی تاریخ بتاتی ہے کہ فلسفہ اس وقت قیاسی منطق کے دور میں تھا جب کہ بیسویں صدی میں، مورخین فلسفہ کے نزدیک، وہ سائنسی منطق کے دور میں پہونچ گیا ہے۔

"بلوغ" کا دوسرا پہلو خود انسان کی عقلی صلاحیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس پہلو سے بھی صورت حال مذکورہ نظریۂ بلوغ کے مطابق نہیں۔ کیوں کہ علم الحیات اور علم الانسان واضح طور پر بتاتے ہیں کہ دس ہزار سال پہلے کا انسان بھی عین وہی ذہنی صلاحیت رکھتا تھا جو آج کے انسان کو مسلمہ طور پر حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بلوغ اور ارتقاء کا مذکورہ نظریہ نہ صرف غیر قرآنی اور غیر علمی ہے بلکہ وہ نہایت مخدوش بھی ہے۔ یہ نئی نبوت کا دروازہ کھولنے والا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں بہائی مذہب اور قادیانی مذہب دونوں اسی مفروضہ تصور کی زمین پر ابھرے ہیں۔ دونوں کا کہنا ہے کہ چونکہ زمانہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ایک نئے تمدنی دور میں پہنچ گیا ہے اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ نئے حالات کے اعتبار سے رسالت خداوندی کا نیا ظہور عمل میں آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ پیغمبر کے ظہور کو بلوغ انسانی کے مذکورہ ارتقائی نظریہ کے ساتھ جوڑیں تو اس کے بعد نئی نبوت کے دعوی کو منطقی طور پر غلط قرار دینا مشکل ہو جائے گا۔ کیوں کہ خالص علمی اعتبار سے تمام پیغمبر "روایتی دور" میں آئے۔ اب جب کہ دنیا "سائنسی دور" سے گزر رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نظریہ کے مطابق، نیا پیغمبر نہ بھیجا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کا تعلق تمام تر حفاظت نبوت سے ہے، اس کا عقلی بلوغ یا دینی ارتقاء کے مفروضہ نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ پیغمبرانہ ہدایت جب محفوظ ہو جائے تو اس کے بعد

پیغمبر کی آمد کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا ہے۔ آج قرآن اور پیغمبر کی لائی ہوئی ہدایت کامل طور پر محفوظ ہیں۔ یہی کافی وجہ ہے کہ اب مزید کوئی نبی نہ آئے۔ حفاظت کا یہ اہتمام گویا سلسلۂ نبوت کے اوپر آخری مہر ہے۔ اس کے بعد خدائی نقشہ کے مطابق، کسی نئے پیغمبر کو بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

پیغمبر آخر الزماں کا ظہور

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ میرے کئی نام ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ میں مٹانے والا ہوں، اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے کفر کو مٹائے گا۔

(ان لی اسماء ــــ وانا الماحی الذی یمحو اللّٰہ بی الکفر، متفق علیہ)

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے سب ایک ہی دین کے حامل تھے۔ مگر آپ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی حیثیت "داعی" کی تھی۔ یعنی خدا کے دین سے بخوبی طور پر لوگوں کو باخبر کر دینے کے بعد ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ مگر پیغمبر اسلامؐ داعی کے ساتھ ماحی بھی تھے۔ دعوتِ توحید کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر بھی مامور کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سے آپ توحید کی دعوت کو عمومی فکری انقلاب تک پہونچا دیں۔ دین خداوندی کو دعوت کے ساتھ ایک تاریخ بھی بنا دیا جائے۔

یہ دوسرا واقعہ کامل طور پر انجام پایا، حتیٰ کہ وہ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ بن گیا۔ تمام مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو انقلاب آیا وہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا اور سب سے انوکھا انقلاب تھا۔

اِصر و اغلال

اصحاب رسول پورے عالم انسانی کے لیے بمنزلہ مقدمۃ الجیش تھے۔ انھوں نے اپنے لیے اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے، قرآن کی زبان میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ اے ہمارے رب، ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ (البقرہ ۲۸۶) اس کے جواب میں صحیح مسلم کی روایت کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قد فعلتُ قد فعلتُ (میں نے ایسا کر دیا، میں نے ایسا کر دیا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوتِ محمدی کا ظہور انسانی تاریخ میں نئے دور کا آغاز ہے جب کہ انسان کے اوپر سے اس بوجھ کو آخری طور پر اتار دیا گیا جو اس نے اپنے اوپر لاد رکھا تھا۔

پیغمبر اسلامؐ کا دین بھی عین وہی تھا جو پچھلے تمام پیغمبروں کا دین تھا۔ اصل دین کے

اعتبار سے آپ میں اور دوسرے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ یہ فرق ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں خدا کے دینِ رحمت کی دعوت صرف دعوت کے مرحلہ تک رہی۔ وہ عمومی فکری انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہونچی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سے آپ کی دعوتِ توحید کو عملی تبدیلی اور فکری انقلاب کے مرحلہ تک پہنچا دیا گیا۔ قرآن میں پیغمبر اسلامؐ کے معاملہ کو بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

ویضع عنهم اصرهم والاغلال　　اور وہ ان پر سے وہ بوجھ اور وہ بیڑیاں اتارتا ہے
التی کانت علیهم (الاعراف ۱۵۷)　　جو ان پر تھیں۔

اس آیت کے مطابق پیغمبر اسلام نے انسانیت کو دو چیزوں سے نجات دی ہے۔ ایک اِصر، اور دوسرے اَغلال۔ یہ اِصر اور اَغلال مختلف قسم کی تھیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ انسانیت کو نجات دلائی۔ یہاں ہم اس کے جس پہلو کا ذکر کر رہے ہیں، اس کے لحاظ سے، اِصر سے مراد وہ توہّمات (Superstitions) ہیں جو قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر چھائی ہوئی تھیں اور جن کی وجہ سے وہ اس چیز سے محروم ہو گیا تھا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنٹفک نقطہ نظر کہا جاتا ہے۔ اور اغلال سے مراد قدیم طرز کا وہ بادشاہی نظام ہے جس کو ہنری پرین نے مطلق شہنشاہیت (Emperical absolutism) سے تعبیر کیا ہے۔ سیاسی جبر کے اس نظام نے انسانیت کو حاکم اور محکوم کے دو انتہائی طبقوں میں بانٹ دیا تھا اور انسانیت کے اوپر ہر قسم کی ترقیوں کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ ان دونوں قسم کی برائیوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔

سائنسی دور کا آغاز

شرک دراصل مظاہر فطرت کی پرستش کا دوسرا نام ہے۔ فطرت کی پرستش کا یہ ذہن ترقیات کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ ترقی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ مظاہر فطرت کو تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔ اور آدمی جس چیز کو پرستش اور تعظیم کا موضوع بنائے ہوئے ہو، اسی چیز کو بیک وقت وہ تحقیق و تفتیش کا موضوع نہیں بنا سکتا۔

سائنسی طرز فکر یا صنعتی انقلاب کی طرف انسان کا سفر اس وقت شروع ہوا جب کہ دنیا سے

شرک کے غلبہ کو ختم کیا گیا اور توحید کے دور کا آغاز ہوا۔ یعنی انسان نے یہ جانا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب کا سب مخلوق ہے نہ کہ معبود۔ وہ قابل تعظیم نہیں ہے بلکہ قابل تسخیر ہے۔ یہ چیزیں انسان کے لیے ہیں نہ کہ انسان ان چیزوں کے لیے۔ دور شرک کے خاتمہ اور دور توحید کے آغاز نے عالم انسانیت کو یہی تحفہ دیا۔ اور یہ کارنامہ وہ ہے جو سب سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انجام پایا۔

ماضی میں خدا کے جتنے رسول آئے سب اسی لیے آئے کہ انسان کو شرک کی گمراہی سے نکالیں۔ اس کو مخلوق کی پرستش کے بجائے خدا کی پرستش کرنے والا بنائیں۔ مگر ان پیغمبروں کا کام صرف اعلانِ توحید پر ختم ہوتا رہا، وہ انقلاب توحید تک نہیں پہونچا۔ تمام پیغمبروں کا مشترکہ طور پر ایک ہی مشن تھا —— شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات۔ مگر ان کی کوششیں اس معاملہ میں فکری اعلان تک رہیں، وہ عملی انقلاب تک نہیں پہونچیں۔ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم کرنا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ آپ کی زندگی میں اس مشن کی تکمیل ہو۔ ابطالِ شرک اور اثباتِ توحید کا یہ مشن آپ کے ذریعہ عملی انقلاب تک پہونچایا جائے، وہ صرف نظریاتی اعلان پر ختم ہو کر نہ رہ جائے۔

مثال کے طور پر انسان اپنے گرد و پیش جو مظاہر دیکھتا ہے ان میں سے ایک مظہر وہ ہے جس کو سورج گرہن اور چاند گرہن کہا جاتا ہے۔ یہ مظاہر ہر زمانہ کے انسان کو متحیر کرتے رہے ہیں۔ قدیم زمانہ کے انسان نے ان کے بارہ میں بڑے عجیب عجیب نظریات قائم کر لیے تھے۔ مثلاً ایک خیال یہ تھا کہ زمین پر جب کسی بڑے آدمی (مثلاً بادشاہ) کی موت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے آسمان میں سورج گرہن اور چاند گرہن واقع ہوتے ہیں۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں عرب کے حکمراں ہو چکے تھے۔ آپ کے چھوٹے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا۔ اتفاق سے عین اسی روز سورج گرہن پڑا۔

اس وقت قدیم ذہن کے تحت کچھ لوگوں نے کہا کہ پیغمبر (بادشاہ عرب) کے لڑکے کا انتقال ہوا ہے اس لیے آج یہ گرہن پڑا ہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو فوراً لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کرتے ہوئے اعلان فرمایا:

ان الشمس والقمر آیتان من آیاتِ الله عز وجل لا ینکسفان لموت احدٍ	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کا گرہن کسی شخص کی موت یا زندگی

ولا لحياته   کی وجہ سے نہیں ہوتا ۔

محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ تقریر کی ۔ اس وقت وہ ملک کے بادشاہ تھے ۔ اس لیے آپ کی یہ تقریر محض ایک وعظ نہ تھی ۔ بلکہ وہ ایک حکومتی ہدایت نامہ تھی ۔ وہ صرف اظہار مسئلہ نہ تھا ، بلکہ وہ اعلانِ انقلاب تھا ۔ چنانچہ ادھر آپ نے یہ اعلان کیا ، اُدھر تاریخ بدلنا شروع ہو گئی ۔

سماجی انقلاب

پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف توحید کا اعلان کیا ۔ دوسری طرف اللہ کی خصوصی مدد سے خلاف توحید نظام کو عملاً توڑ دیا ۔ آپ کے مشن کی اس خصوصی نوعیت کو قرآن و حدیث میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔

قرآن میں آپ کو اور آپ کے اصحاب کو حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے (وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله)

پیغمبر آخر الزماں کی بعثت کی نوعیت کو بتاتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ : اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے (هو الذى ارسل رسوله بالهدىٰ ودين الحق ليظهره على الدين كلّه)

روایات میں آتا ہے کہ قادسیہ کے معرکہ کے دوران حضرت ربعی بن عامر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سپہ سالار رستم کے دربار میں گیے ۔ رستم نے گفتگو کے وقت پوچھا کہ تم لوگ یہاں کیوں آئے ۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے ۔ اور اللہ ہم کو یہاں لایا ہے تاکہ جو چاہے اس کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لائیں اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے انصاف کی طرف لائیں (قال : الله ابتعثنا والله جاء بنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله ومن ضيق الدنيا الى سَعَتها ومن جَور الاديان الى عدل الاسلام)

تاریخ کے تین دور

یورپی مورخین عام طور پر تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کرتے ہیں ۔ اول ، رومی شہنشاہیت

کے سقوط سے پہلے کا دور۔ رومی شہنشاہیت کے مغربی حصہ کو سب سے پہلے جرمن (Germanic) قبائل نے ۴۷۶ء میں کمزور کیا۔ اس کے بعد عربوں نے ساتویں صدی عیسوی میں آخری طور پر رومی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا جو بحر متوسط (Mediterranean Sea) کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی تاہم جرمن قبائل کا حملہ اور عرب فتوحات میں بہت بڑا فرق ہے۔ جرمن قبائل کے حملہ سے مغربی رومی شہنشاہیت کو صرف محدود نوعیت کا فوجی اور سیاسی نقصان ہوا تھا۔ جب کہ عرب فتوحات کے نتیجہ میں صرف ایک حکومتی نظم نہیں ٹوٹا بلکہ وقت کی غالب تہذیب (یونانی۔رومی تہذیب) کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

رومی سلطنت اور رومی تہذیب کے سقوط سے لے کر ۱۵ویں صدی کے آخر تک کے زمانہ کو قرونِ وسطیٰ (Middle ages) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ درمیانی زمانہ ہے جب کہ مغربی دنیا قدیم دور سے نکل کر جدید دور کی طرف آئی۔

تیسرا دور سولہویں صدی کے آغاز سے لے کر اب تک کا ہے۔ اس کو عام طور پر دورِ جدید کہا جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ مغربی دنیا میں سیاسی اور صنعتی انقلاب آیا اور دنیا روایتی دور سے نکل کر پوری طرح سائنسی دور میں پہونچی۔

تاریخ اور سماجیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم دور میں ساری دنیا کا سب سے بڑا مذہب توہم پرستی (Superstition) تھا۔ ساری دنیا میں توہماتی عقائد چھائے ہوئے تھے۔ اس دور کی تمام حکومتیں توہماتی عقائد پر قائم تھیں۔ ان میں سے دو حکومتیں سب سے بڑی حکومتیں شمار ہوتی تھیں۔ ایک ایرانی حکومت (Sassanid Empire) اور دوسری رومی حکومت (Byzantine Empire) یہ حکومتیں مکمل طور پر توہماتی نظام کی سرپرست بنی ہوئی تھیں۔ کیوں کہ ان توہمات کے بقا پر ہی ان کی بقا کا انحصار تھا۔ مثال کے طور پر، مفروضہ عقائد کے تحت یہ مان لیا گیا تھا کہ ہر قسم کی بڑائی اور حقوق مطلق طور پر صرف وقت کے شاہی خاندان کو حاصل ہیں۔ عوام کی حیثیت محض رعایا کی ہے۔ شاہی خاندان کی ابدی خدمت کے سوا ان کا اور کوئی حق نہیں۔

اب دنیا میں علم اور روشنی کا دور لانے کے لیے ان حکومتوں کا توڑنا ضروری تھا۔ ان حکومتوں کے رہتے ہوئے ناممکن تھا کہ دنیا علم اور آزادی اور مساوات کی قدروں سے آشنا ہو سکے۔

یہی وہ اہم کام ہے جو صحابہ اور تابعین کے ذریعہ انجام پایا۔ یہ ایک مقدس خدائی فوج تھی جس نے ان حکومتوں کو توڑ کر انسانیت کے لیے ہر قسم کی ترقیات کا دروازہ کھولا۔ اگر شکست و ریخت کا یہ عمل نہ کیا جاتا تو آج بھی دنیا انھیں تاریک ادوار (Dark Ages) میں پڑی رہتی جہاں وہ اس انقلاب سے پہلے پڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود غیر مسلم محققین نے مختلف انداز میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور مورخ ہنری پرین کی کتاب "تاریخ یوروپ" اس سلسلہ میں خصوصی طور پر قابل مطالعہ ہے۔

ہنری پرین نے اپنی اس کتاب میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس کا خلاصہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار کے الفاظ میں یہ ہے:

> (According to) the widely discussed theory of Henri Pirenne, the essential break between the ancient and medieval worlds came with the destruction of the unity of the Mediterranean world not by the Germanic but the Arab invasions (13/155).

ہنری پرین کا نظریہ جو کافی بحث کا موضوع رہا ہے، اس کے مطابق قدیم دنیا اور متوسط دنیا کے درمیان بنیادی انفصال اس وقت ظہور میں آیا جب کہ بحر متوسط کی دنیا کے اتحاد کو توڑ دیا گیا۔ یہ واقعہ جرمن قبائل کے ذریعہ نہیں بلکہ عرب حملوں کے ذریعہ پیش آیا۔

ہنری پرین (۱۸۶۲-۱۹۳۵) قرون وسطی کی تاریخ کا ممتاز ترین عالم تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ مشرق ہی قدیم زمانہ میں بار آور کرنے کا ذریعہ تھا۔ قسطنطنیہ کو (رومی سلطنت کے تحت) دنیا کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ ۶۰۰ء میں دنیا کے طبعی حالات، اپنی نوعیت کے اعتبار سے، اس سے مختلف نہ تھے جو ۴۰۰ء میں تھے۔ قدامت کی روایات سے انفصال کا سبب اسلام کی تیز اور غیر متوقع توسیع تھی۔ اس توسیع کا نتیجہ مشرق کی مغرب سے آخری علٰحدگی اور بحر روم کے اتحاد کا خاتمہ تھا:

> The Orient was the fertilizing: Constantinople, the centre of the world. In 600 the physiognomy of the world was not different in quality from that which it had revealed in 400. The cause of the break with the tradition of antiquity was the rapid and unexpected advance of Islam. The result of this advance was the final separation of East from West, and the end of the Mediterranean unity.
>
> Dr Henri Pirenne, *Muhammad and Charlemagne*, 1937, p.284

خدائی آپریشن

رومی اور ایرانی شہنشاہیت کے خلاف صحابہ اور تابعین کے ذریعہ جو کارروائی کی گئی۔ اس کی توجیہہ موجودہ زمانہ کے کچھ مسلم مفکرین اس طرح کرتے ہیں گویا کہ وہ کوئی ابدی اور مستقل نمونہ ہے۔ بالفاظ دیگر، یہی امت مسلمہ کا منصبی مشن ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو ہر ملک کے مسلمانوں کو ہر زمانہ میں دہراتے رہنا ہے۔ مگر یہ خدائی معجزہ کو انسانی نصب العین قرار دینا ہے جو بلاشبہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ ایک خدائی معجزہ تھا جو سیاسی قالب میں ظاہر کیا گیا۔ اس کا انسانی مشن سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

اقبال کا ایک شعر اس معاملہ میں مسلم مفکرین کے نقطۂ نظر کو بخوبی طور پر بیان کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رجز خوانی کے ذریعہ پہلے مجاہدین کی ایک ٹیم تیار کرو، اور جب یہ ٹیم تیار ہو جائے تو اس کے بعد اس کو باطل حکومتوں کے خلاف ٹکرا دو۔ اس فکر کے ایک حامی کے الفاظ میں، پہلا مرحلہ پُرامن کوشش (Passive resistance) کا ہے، اور دوسرا مرحلہ مسلح ٹکراؤ (Armed struggle) کا:

بانشۂ درویشی برساز دمادم زن   چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن

مگر ابتدائی اسلامی تاریخ کی یہ تشریح صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں روم اور ایران کی سلطنتوں کے خلاف جو کچھ پیش آیا وہ نمونہ نہیں بلکہ معجزہ تھا۔ یہ ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا۔ قدیم طرز کی سلطنتیں ہر قسم کی انسانی ترقی کے لیے ایک مستقل روک بن گئی تھیں۔ مذہبی آزادی، انسانی مساوات اور سائنسی ترقیوں کا خواب ہزاروں برس سے بے تعبیر بنا ہوا تھا۔ اور اس کا واحد سب سے بڑا سبب یہی قدیم طرز کی شہنشاہیتیں تھیں۔ جو گویا دروازۂ آب کی مانند انسانی ترقیوں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھیں۔

تمام ترقیوں کا واحد دروازہ آزادیٔ رائے ہے۔ مگر قدیم طرز کی مطلق العنان حکومتوں کے دور میں انسان کے لیے آزادیٔ رائے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ایرانی بادشاہ نوشیرواں کے دربار میں ایک شخص نے بادشاہ سے اختلاف رائے کیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو اپنے علم پر ناز ہو گیا ہے، اس کے سر کو قلمدان سے توڑ دیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم کے تحت کئی درباریوں

نے قلم دان ہاتھ میں لے کر اس کے سر پر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس کا سر ٹوٹ گیا اور وہ وہیں ہلاک ہوگیا۔

یہی حال رومی شہنشاہوں کا تھا۔ ان کے یہاں اختلاف رائے اتنا ہی سنگین جرم تھا جتنا کہ ملک یا اسٹیٹ سے غداری۔ اگر کوئی شخص شہنشاہ سے اختلاف رائے کی جرأت کرتا تو اس کی کم سے کم سزا یہ تھی کہ اس کو پختہ گڑھے میں ڈال کر اس کے اوپر چیتے اور بھیڑیے چھوڑ دیے جائیں جو اس کو بھنبھوڑتے رہیں، یہاں تک کہ اسے مار ڈالیں۔ یہی قدیم زمانہ کے تمام بادشاہوں کا طریقہ تھا اور اس طرح کی مطلق شہنشاہیت کی فضا میں یہ ناممکن تھا کہ انسانی علم اور انسانی تہذیب ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کرسکے۔

ہزاروں سال سے پیغمبر اور مصلحین اس صورت حال کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ مگر ان کوششوں کے نتیجہ کو دیکھ کر یہ ثابت ہوگیا کہ مروجہ سیاسی نظام کے باقی رہتے ہوئے انسانی اصلاح کا کام انجام پانا ممکن نہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے وہ فیصلہ فرمایا جس کو قرآن میں قتالِ فتنہ (البقرہ، الانفال) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی خدائی آپریشن کے ذریعہ اس شہنشاہی نظام کو ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جائے جو ہر اصلاحی عمل اور ہر ترقیاتی کام کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ خواہ اس اصلاح کا تعلق مذہبی امور سے ہو یا سیکولر امور سے۔

اسلام کے دور اول میں روم و ایران کی سلطنتوں سے جو لڑائیاں ہوئیں۔ وہ انتہائی طور پر غیر مساویانہ تھیں۔ یہ بلا مبالغہ بے سروسامان انسانوں کا باسروسامان طاقتوں سے لڑ جانا تھا۔ اس کے باوجود اس مقابلہ میں انتہائی کم مدت میں ایسی عظیم کامیابی حاصل ہوئی جو پوری انسانی تاریخ میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی۔

اس واقعہ کی یہی انوکھی صفت ہے جس کی بنا پر ولفرڈ بلنٹ (Wilfrid Blunt) نے لکھا ہے کہ انسانیت کی پوری طویل تاریخ میں اسلام کی تیز رفتار اشاعت سے زیادہ عجیب (Amazing) واقعہ کوئی دوسرا نہیں (ٹائمس، ۲ اپریل ۱۹۷۶)

ہنری پرین نے اس کی اسی نوعیت کی بنا پر اس کو محض ایک اتفاقی واقعہ قرار دیدیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

> In a certain sense, the expansion of Islam was due to chance, if we can give this name to the unpredictable consequence of a combination of causes.
>
> *Mohammed and Charlemagne*, p.148

فردوسی کے نزدیک یہ واقعہ اتنا مستبعد تھا کہ اس نے اپنے شاہنامہ میں لکھا:

ز شیر شتر خوردن و سوسمار   عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو   تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

مورخین عام طور پر ان فتوحات کا ذکر ناقابل فہم حیرانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں تعجب کا کوئی پہلو نہیں۔ اس لیے کہ باعتبار حقیقت، یہ انسانی واقعات نہ تھے بلکہ خدائی واقعات تھے۔ اپنی ظاہری صورت میں وہ "عرب" کی "عجم" کے ساتھ لڑائی تھی۔ مگر اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا جو عربوں کے ذریعہ شہنشاہی فتنہ کے خلاف انجام دیا گیا۔

بائبل میں پیغمبر اسلام کے بارے میں جو پیشین گوئیاں ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ "اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔ اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں اور اس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔ وبا اس کے آگے آگے چلتی تھی اور آتشیں تیر اس کی قدموں سے نکلتے تھے۔ وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں (حبقوق، باب ۳)

مورخین کے مذکورہ الفاظ اور بائبل کا مذکورہ بیان، اس قسم کی تمام چیزیں اپنے اپنے انداز میں اس بات کا اعتراف ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو واقعہ انجام پایا وہ خدائی واقعہ تھا۔ وہ صرف خدائی طاقتوں کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ انسان کے بس میں نہیں کہ وہ ایسے عظیم اور بے مثال واقعہ کو ظہور میں لا سکے۔

خدا کے سپاہی

پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ جو خدائی آپریشن کرایا گیا، اس کے لیے آپ کو وہ بہترین افراد دیئے

گیے جو اس خدمت خاص کے لیے موزوں ترین تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسے ربانی افراد تھے جیسے افراد انسانی تاریخ میں نہ اس سے پہلے پائے گیے اور نہ اس کے بعد۔ بائبل میں بجا طور پر ان کو ہزاروں قدسیوں (Saints) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے (استثنا، باب ۳۳)

پیغمبر اسلام کے ساتھ فتح مکہ کے وقت دس ہزار اصحاب تھے۔ حجۃ الوداع کے وقت ان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہو چکی تھی۔ بعد کو تابعین کی صورت میں اس مقدس تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ مردان کار گویا خدا کے سپاہی تھے۔ انھوں نے ناقابل یقین حد تک خدائی احکام کا پابند رہ کر اس خدائی آپریشن کو انجام دیا۔

ان کا حال یہ تھا کہ جنگ کے دوران اگر دشمن کے کسی فرد نے ان کے اوپر تھوک دیا تو فوراً وہ اس کو چھوڑ دیتے تھے کہ اب اگر ماریں گے تو وہ اس کو نفسانی محرک کے تحت ماریں گے، جب کہ خدائی حکم کے مطابق رضائے الٰہی کے سوا کسی اور محرک کے تحت کسی انسان کو مارنا جائز نہیں۔ ان کا یہ حال تھا کہ دشمن سے انتہائی بے جگری کے ساتھ لڑتے تھے مگر جس لمحہ اس نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا فی الفور وہ اپنی تلوار کو نیام میں کر لیتے تھے۔ وہ اس سے قطعاً ناآشنا تھے کہ انتقامی جذبہ کے تحت کسی کا خون بہائیں۔ وہ ایک قوم سے جنگ کرتے تھے مگر جب وہ قوم اطاعت پر اپنی رضامندی ظاہر کر دیتی تو اس کے ملک کا انتظام خود اسی کے حوالہ کر دیتے اور کہتے کہ ہم تو صرف تمہاری سرکشی کو توڑنے آئے تھے۔ ہمیں تمہارے مال اور اقتدار سے کوئی مطلب نہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جن کا حال یہ تھا کہ انھوں نے تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت بنائی۔ مگر ان حکومتوں تک رسائی نے صرف ان کی ذمہ داری کے احساس میں اضافہ کیا۔ ان کا معیار زندگی اونچا ہونے کے بجائے اور نیچا ہو گیا۔ ان کی رعایا بادشاہوں کی طرح رہتی مگر وہ خود فقیروں کی طرح زندگی گزارتے۔ دوسرے لوگ ریشم اور کمخواب کے کپڑے پہنتے مگر ان کے جسم پر پیوند لگے ہوئے کپڑے دکھائی دیتے۔ دوسرے لوگ شاندار گھوڑوں پر سفر کرتے مگر ان کا سفر اس طرح طے ہوتا کہ خادم اونٹ پر سوار ہے اور خود اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل راستہ طے کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بے نفس انسانوں کا ایسا گروہ تھا جس پر فرشتے بھی رشک کریں۔ جب ایران فتح ہوا اور ساسانی سلطنت کا سپہ سالار اعظم مارا گیا تو ایک مسلمان فوجی کو لاشوں کے ڈھیر میں اس کا تاج ہاتھ آیا۔ یہ تاج سونے اور جواہرات کا بنا ہوا تھا اور اس کی قیمت کروڑوں روپیہ سے بھی زیادہ تھی۔ مگر اس فوجی نے نہ صرف یہ کہ اس تاج پر ذاتی قبضہ نہیں کیا بلکہ اس نے یہ بھی پسند نہیں کیا کہ وہ اس حیثیت سے مشہور ہو کہ اس نے شاہی تاج کو واپس کر دیا ہے۔ رات کی تاریکی میں اس نے تاج کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور اس کو لے کر خاموشی سے سردار کے خیمہ میں پہنچا اور اس کو اسلامی فوج کے سردار کے حوالہ کر دیا۔ تاج سے جب کپڑا ہٹایا گیا تو ہیروں کی جگمگاہٹ سے خیمہ روشن ہو گیا۔ اسلامی لشکر کے سردار نے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے۔ اس آدمی نے خیمہ کے دروازے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا: "جس کی خاطر میں نے ایسا کیا ہے وہ میرا نام اچھی طرح جانتا ہے۔" یہ کہا اور خیمہ کے باہر رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔

انسانی تاریخ کا رجسٹر اس فوجی کا نام نہیں بتاتا۔ مگر خدا کے رجسٹر میں بلاشبہ اس کا نام شاندار طور پر درج ہے ——— یہ تھے وہ مقدس ترین لوگ جن کو خدا نے اپنے سپاہی کی حیثیت سے چنا اور جن کے ذریعہ ایک انتہائی مقدس خدائی آپریشن کرایا۔ ان لوگوں نے خدا کے خصوصی حکم کے تحت قدیم فتنہ شہنشاہیت کے خلاف قتال کیا اور ہمیشہ کے لیے اس کا خاتمہ کر کے انسانیت کے اوپر ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا ابدی دروازہ کھول دیا۔

یہ لوگ بلاشبہ خدا کے سپاہی تھے۔ خدا نے اپنے پسندیدہ سپاہیوں کے ذریعہ ایک بار کے لیے یہ ضروری فوجی آپریشن کرایا اور معجزاتی طور پر اس کو آخری کامیابی تک پہنچایا۔ اس مقدس گروہ کے سوا کوئی اور گروہ اتنا بے نفس نہیں، اس لیے دوبارہ کوئی گروہ اس قسم کی کارروائی کا مجاز بھی نہیں۔ اگر کوئی دوسرا گروہ "قتال فتنہ" کا نعرہ بلند کر کے لوگوں سے جنگ کرنے لگے تو یقینی طور پر وہ زمین میں فساد برپا کرے گا نہ کہ اصلاح۔

ایک بار

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے اسوہ تھے۔ تاہم آپ کی زندگی کے بعض افعال صرف آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان افعال میں امت آپ کی شریک نہیں۔ مثلاً

عام امت کے لیے نکاح کی آخری حد چار عورتیں ہیں ۔ مگر آپ کے لیے خصوصی مصالح کے تحت اس سے زیادہ تعداد کی اجازت دی گئی ۔ عام امت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ انکار ایمان کی بنا پر کسی کو قتل کرے ۔ مگر پیغمبر اسلام کو اپنے مخاطبین اول (بنو اسماعیل) کے حق میں یہ ہدایت دی گئی کہ اتمام حجت کے بعد آپ ان سے کہدیں کہ وہ یا تو ایمان لائیں ورنہ قتل کر دیے جائیں گے ۔ فتح مکہ کے موقع پر وقتی طور پر آپ کو حرم میں خون بہانے کی اجازت دی گئی جب کہ امت کے لیے ابدی طور پر حرم میں خون بہانا حرام ہے ۔ وغیرہ ۔

آپ کا روم و ایران کے خلاف جنگ چھیڑنا بھی اسی قسم کا ایک معاملہ تھا ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تبعیت میں آپ کے اصحاب نے وقت کی شہنشاہیتوں کے خلاف ختم فتنہ کے لیے جو جنگی کارروائی کی ، وہ آپ اور آپ کی تبعیت میں صحابہ کی ذات تک مختص تھی ۔ یہ ایک خصوصی حکم تھا نہ کہ عمومی حکم ۔ اس کے بعد اس معاملہ میں صرف دو نمونے ہیں جو امت کے لیے عمومی طور پر باقی ہیں ـــــــ دعوت ، اور حسب شرائط دفاعی جنگ ۔ ” قاتلوهم حتى لاتكون فتنة “ کا حکم امت کے عمومی مشن سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ۔

صحابہ کرام نے ہنری پرین کے الفاظ میں ، شاہی مطلق العنانی (Empirical absolutism) کے جابرانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے جو خدائی آپریشن کیا ، اس کے متعلق وہ بخوبی طور پر جانتے تھے کہ یہ ایک بار کا عمل ہے نہ کہ بار بار کا عمل ۔ یعنی وہ مستمر کار نبوت نہیں ہے جو ہر نسل اور ہر دور میں امت محمدی کو دہراتے رہنا ہے ۔ یہ ایک وقتی آپریشن تھا اور اس قسم کا آپریشن صرف ایک بار کیا جاتا ہے ۔ اس خدائی آپریشن کا پوری طرح کامیاب ہو جانا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ دوبارہ اسے دہرانے کی ضرورت پیش نہ آئے ۔

صحابی کی تشریح

قرآن میں پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ جنگ کر کے فتنہ کو ختم کریں ۔ یہ حکم قرآن میں دو جگہ آیا ہے ۔ یہاں ہم دونوں آیتوں کا لفظی ترجمہ نقل کرتے ہیں :

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے ۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد ظالموں کے سوا کسی اور پر سختی نہیں (البقرہ ۱۹۳) اور ان سے لڑو

یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ دیکھنے والا ہے ان کے عمل کا (الانفال ۹۳)

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس جنگ کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف ختم فتنہ سے ہے۔ فتنہ کے ختم ہوتے ہی یہ جنگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ فتنہ سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک، شرک ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہاں شرک سے مراد شرک جارح ہے۔ یعنی وہ شرک جو صرف ذاتی عقیدہ نہ رہے بلکہ جبر کی صورت اختیار کرلے۔ اس قسم کا جابرانہ شرک قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں رائج تھا اور یہی وہ فتنہ ہے جس کو لڑ کر ختم کرنے کے لیے قرآن میں حکم دیا گیا۔ اب چوں کہ اس نوعیت کا مشرکانہ فتنہ دنیا میں باقی نہیں ہے، اس لیے اب اس نوعیت کی جنگ کی بھی اہل اسلام کو ضرورت نہیں۔

حکم کی یہ نوعیت صحابہ کرام پر پوری طرح واضح تھی۔ یہ بات حضرت عبداللہ بن عمر کی اس روایت سے بخوبی طور پر سمجھ میں آتی ہے جو مختلف کتب حدیث میں موجود ہے اور جن کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں ہم تفسیر ابن کثیر کے متعلقہ حصہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، الحسن، قتادہ، الزہاک اور الربیع بن انس کا قول ہے کہ آیت الفتنۃ اشد من القتل (البقرہ ۱۹۱) کا مطلب ہے: الشرک اشد من القتل۔ یعنی شرک قتل سے زیادہ سنگین ہے۔

"یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے" یعنی شرک نہ رہے۔ یہی قول ابن عباس، ابو العالیہ، مجاہد، الحسن، قتادہ، الربیع، مقاتل بن حیان، السدی اور زید بن اسلم کا ہے۔

اور آیت "پھر اگر وہ باز آجائیں تو اس کے بعد سختی نہیں ہے مگر ظالموں پر" (البقرہ ۱۹۳) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے شرک سے باز آجائیں اور مسلمانوں سے جنگ نہ کریں تو ان سے رک جاؤ۔ اور اس کے بعد جو شخص لڑے تو وہی ظالم ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ جنگ نہ کی جائے سوا اس سے جو خود جنگ کرے (ان لا یقاتل الا من قاتل)

نافع کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن کیا سبب ہے کہ آپ ایک سال حج کرتے ہیں اور ایک سال ٹھہرتے ہیں۔ مگر آپ جہاد فی سبیل اللہ

کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ نے کتنی زیادہ اس کی رغبت دلائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اللہ پر ایمان اور رسول پر ایمان اور پانچ وقت کی نماز اور رمضان کے مہینہ کا روزہ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور حج کرنا۔ انھوں نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن، کیا آپ کو قرآن کی یہ آیت نہیں معلوم جس میں کہا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے تحت لوٹ آئے۔ (الحجرات ۹)

اور اسی طرح قرآن میں ہے کہ ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ کام کر چکے۔ اس وقت اسلام قلیل تھا۔ پس آدمی اپنے دین کے بارے میں آزمائش میں ڈالا جاتا تھا۔ لوگ اس کو یا قتل کر دیتے یا اس کو سخت تکلیف پہونچاتے یہاں تک کہ اسلام کثیر ہو گیا اور فتنہ باقی نہ رہا۔

تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۸ - ۲۲۷

امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر کے بارہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ (فتنۂ ابن الزبیر کے زمانہ میں) ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن، کیا آپ کو نہیں معلوم جو اللہ نے اپنی کتاب میں دو مومن گروہوں کے قتال (الحجرات ۹) کے بارے میں فرمایا ہے۔ پھر آپ کو کیا چیز روکتی ہے کہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق جنگ نہیں کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، میں جنگ نہ کروں اور مجھے اِس آیت کے ذریعہ عار دلائی جائے، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ مجھے اُس دوسری آیت سے عار دلائی جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (النساء ۹۳) آنے والے شخص نے دوبارہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا:

قد فعلنا علیٰ عہد رسول اللہ صلی اللہ	یہ کام ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
علیہ وسلم اذ کان الاسلام قلیلاً	میں کر دیا۔ جب کہ اسلام کم تھا اور آدمی اپنے دین

وكان الرجل يفتن فى دينه إمّا ان
يقتلوه وإما ان يوثقوه حتى كثر
الاسلام فلم تكن فتنة

کے بارے میں آزمائش میں ڈالا جاتا تھا۔ اس کو یا تو
لوگ قتل کر دیتے تھے یا اس کو باندھ دیتے تھے۔
یہاں تک کہ اسلام زیادہ ہوگیا، پس فتنہ
باقی نہ رہا۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر ہمارے پاس آئے۔ ان سے کہا گیا کہ قتالِ فتنہ کے قرآنی حکم کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم مشرکین سے لڑتے تھے اور ان پر داخل ہونا فتنہ تھا، نہ کہ تمہارا اقتدار کے لیے لڑنا (ليس بقتالكم على الملك)

ایک اور روایت کے مطابق نافع کہتے ہیں کہ فتنہ ابن الزبیر کے زمانہ میں دو آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آئے انھوں نے کہا کہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو آپ دیکھ رہے ہیں، اور آپ عمر بن خطاب کے صاحبزادے ہیں اور آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے صحابی ہیں۔ پھر آپ کو کیا چیز روکتی ہے کہ آپ نہیں نکلتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا کہ مجھے یہ بات روکتی ہے کہ اللہ نے میرے اوپر مسلم بھائی کا خون حرام کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا، کیا اللہ نے قرآن میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کے جواب میں فرمایا:

فقال قد قاتلنا حتى لم تكن فتنة و
كان الدين كله لله ، وانتم تريدون
ان تقاتلوا حتى تكون فتنة ويكون
الدين لغير الله

انھوں نے کہا کہ ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ
نہ رہا اور دین سب اللہ کے لیے ہو گیا۔ اور تم
چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک کہ دوبارہ فتنہ
پیدا ہو اور دین غیر خدا کے لیے ہو جائے۔

ایوب بن عبداللہ لخمی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس تھا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر آپ کیوں نہیں جنگ کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا کہ ہم نے جنگ کی یہاں تک کہ فتنہ نہ رہا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک

کہ پھر فتنہ ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔

عماد بن سلمہ کی ایک روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ (ان سے لڑنے کے لیے کہا گیا) تو انھوں نے فرمایا کہ میں اور میرے اصحاب لڑے۔ یہاں تک کہ دین اللہ کے لیے ہو گیا۔ اور شرک چلا گیا۔ اور فتنہ باقی نہ رہا۔ مگر تمہارے ساتھی جنگ کر رہے ہیں تاکہ دوبارہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے۔

ضحاک نے کہا کہ عبداللہ بن عباس نے آیت (لا تکون فتنۃ) کی تفسیر لا یکون شرک سے کی ہے۔ یہی قول ابو العالیہ، مجاہد، الحسن، قتادہ، الربیع، ابن انس، السدی، مقاتل بن حیان اور زید بن اسلم کا بھی ہے۔

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ کو الزهری اور دوسرے علما رسے یہ بات پہونچی ہے کہ: حتی لا تکون فتنۃ کا مطلب یہ ہے کہ: حتی لا یُفتن مسلم عن دینہ (یہاں تک کہ کوئی مسلمان اپنے دین کے بارے میں آزمائش میں نہ ڈالا جائے۔

تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۲۰۹-۳۰۸

معجزہ نہ کہ نمونہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ شق القمر کا واقعہ پیش آیا۔ کوئی مسلمان اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہتا کہ چاند کو دو ٹکڑے کرنا امت محمدی کا مشن ہے۔ اور ہم کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ ہم دوبارہ چاند کو دو ٹکڑے کر کے لوگوں کے اوپر اپنے دین کی حقانیت ثابت کریں۔ اس کے برعکس روم و ایران کے خلاف آپ نے اور آپ کے اصحاب نے جو لڑائیاں کیں، اس کو مسلمان اپنے لیے نمونہ سمجھتے ہیں۔ مسلم مفکرین یہ کہتے ہیں کہ اسی طرح ہمیں ہر دور کے "روم و ایران" سے ٹکرا کر ان کا خاتمہ کرنا چاہیے۔

دو واقعات کی تعبیر میں اس فرق کا سبب یہ ہے کہ شق القمر کا واقعہ فوق الطبیعی سطح پر ہوا، اور روم و ایران کی شکست طبیعی سطح پر انجام پائی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح پہلا واقعہ ایک معجزہ تھا، اسی طرح دوسرا واقعہ بھی ایک معجزہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم۔ یعنی ان سے جنگ کرو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا (التوبہ ۱۴) یہ آیت براہ راست طور پر بنو اسماعیل سے متعلق ہے اور بالواسطہ طور پر روم و

ایران سے متعلق۔ دونوں میں مزید یہ فرق ہے کہ بنو اسماعیل سے لازماً اسلام مطلوب تھا، جب کہ دوسروں سے صرف اطاعت۔

پچھلے پیغمبروں کو جو معجزے دیے گیے، وہ سب فوق الطبیعی انداز میں تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزہ دیا گیا، وہ سیاسی انداز میں تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کو معجزہ کے بجائے نمونہ سمجھ لیا۔ حالاں کہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی ایک معجزہ تھا نہ کہ عمومی پیروی کا نمونہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں پر عمل کا جو نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے، وہ وہی ہے جو دوسرے پیغمبروں نے اپنی امتوں کے لیے چھوڑا تھا۔ یعنی دعوتِ حق اور تبلیغِ رسالت۔ اب اہل اسلام کو اصلاً صرف یہی کام کرنا ہے اور ناگزیر حالات میں دفاع کے سوا کسی اور مقصد کے لیے غیر مسلموں سے جنگ نہیں کرنا ہے۔ غیر مسلم اقوام ابدی طور پر ہماری مدعو ہیں، وہ ہماری سیاسی رقیب نہیں۔

باب سوم

ایک مطالعہ

بلقان ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑ کے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ یورپ کے مشرق میں اس جزیرہ نما کے لئے بولا جاتا ہے جس میں حسب ذیل ملک واقع ہیں: یونان، البانیا، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ۔ پندرھویں صدی کے وسط میں یہ علاقہ تقریباً مکمل طور پر عثمانی ترکوں کے قبضہ میں آگیا اور بیسویں صدی کے آغاز تک کسی نہ کسی طرح ان کے قبضہ میں باقی رہا۔

آخری دور میں ان ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ مغربی ملکوں، خاص طور پر روس سے انھیں حوصلہ افزائی ملی۔ یہاں تک کہ ترک ان سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۲۹ میں انھیں یونان کو آزادی دینی پڑی۔ اسی طرح سربیا ۱۸۷۸ میں، رومانیہ ۱۸۷۸، بلغاریہ ۱۹۰۸، اور البانیا ۱۹۱۲ میں آزاد ہو گیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان سیاست کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ترک خلافت کی بلقان سے واپسی کی خبریں جب ہندستان میں پھیلیں تو یہاں کے لیڈروں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔ مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸-۱۹۳۱) نے اپنی ناتمام سوانح حیات میں لکھا ہے کہ میں اس واقعہ سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں خودکشی کر لوں:

> My feelings during the disastrous war in the Balkans were at one time so overpowering that I must confess I even contemplated suicide.
>
> Mohammad Ali, *My Life:: A Fragment*, Lahore 1946, p.37.

اخباروں نے پرجوش مضامین شائع کئے۔ شاعروں نے جذبات سے بھری ہوئی نظمیں لکھیں۔ مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) کی ایک نظم کو اس زمانہ میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے   اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملّت ہے   عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے   تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۸ - ۱۹۱۴) ختم ہوئی تو مولانا شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴) یہ منظر دیکھنے کے لئے دنیا میں موجود نہ تھے کہ دولت عثمانیہ کے جس زوال کو انھوں نے صرف جزئی طور پر دیکھا تھا، وہ اپنی آخری نوبت کو پہنچ گیا ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں خود ترکی کو چھوڑ کر بقیہ تمام مشرقی اور مغربی مقبوضات ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ حتی کہ کمال اتاترک نے ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ کو ایک سرکاری اعلان کے ذریعہ برائے نام خلافت کے بھی الغاء کا اعلان کر دیا —— شبلی نے دولت عثمانیہ کے صرف زوال کو دیکھا تھا، محمد علی مزید زندہ رہے اور انھیں دولت عثمانیہ کے خاتمہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا پڑا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے "خلافت" کے بارہ میں جو پرجوش الفاظ کہے تھے، اور جس کا ایک نمونہ مولانا شبلی نعمانی کے مذکورہ اشعار میں موجود ہے، اگر خلافت، بالفاظ دیگر سیاسی ادارہ، کی یہی اہمیت ہوتی تو اس کے خاتمہ کے بعد خود اسلام کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر خاتمۂ خلافت کے ۷۰ سال بعد اسلام نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ بہتر حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس ۷۰ سال کے دوران مسلمان بحیثیت قوم مختلف قسم کی ذلت اور بربادی سے دوچار ہوئے ہیں۔ مگر اسلام کا معاملہ یقینی طور پر اس سے مختلف ہے۔ اسلام کے نام پر آج جتنی کتابیں اور جرائد چھپ رہے ہیں، پہلے ان کا سواں حصہ بھی موجود نہ تھا۔ مولانا شبلی کو جن کتابوں کے مخطوطات دیکھنے کے لئے "روم و مصر و شام" کا سفر کرنا پڑا تھا، وہ آج ہر شہر اور ہر قصبہ میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ آج پہلے سے بہت زیادہ اسلامی ادارے دنیا میں قائم ہیں، ساری دنیا میں اسلامی اجتماعات اور کانفرنسیں جتنی زیادہ تعداد میں آج منعقد ہو رہی ہیں، پہلے ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس درمیان میں لاکھوں کی تعداد میں نئے لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ۔

تاریخ کا یہ تجربہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اسلام ایک لازوال قوت ہے۔ وہ اس سے زیادہ طاقت ور ہے کہ کوئی سیاسی یا قومی حادثہ اس کو ادنیٰ درجہ میں بھی نقصان پہنچا سکے۔ اسلام کی صورت میں خدا کا دین آخری حد تک مستحکم ہو چکا ہے۔ اس کے لئے اب اللہ کے

سوا کسی اور کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا جس میں ارشاد ہوا ہے کہ فلا تخشوھم واخشون (المائدہ ۳)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے عمل کے دو میدان تھے۔ ایک، اسلام کی فطری قوتوں کو پر امن جدوجہد سے بروئے کار لانے کا میدان۔ دوسرا سیاسی اور فوجی میدان میں اسلام کو لے کر اٹھنا۔ اول الذکر میدان کو علامتی طور پر "مسجد" کہا جاسکتا ہے، اور ثانی الذکر میدان کو علامتی طور پر "حکومت"۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نظر اگر ان امکانات پر جمی ہوئی ہوتی جن کا تعلق مسجد والے میدان سے ہے تو وہ کسی حال میں محرومی کے احساس سے دوچار نہ ہوتے اور نہ یہ سمجھتے کہ ان کے لئے تمام مواقع ختم ہو چکے ہیں۔ سیاسی محرومی کے باوجود وہ محسوس کرتے کہ جو کچھ ان سے کھویا گیا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جو اب بھی ان کے پاس موجود ہے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے کہ انھوں نے "انسان" کو کھویا ہے مگر انھوں نے "خدا" کو نہیں کھویا۔ وہ سیاسی حمایت سے محروم ہوئے ہیں مگر خداوند عالم کی حمایت بدستور انھیں پوری طرح حاصل ہے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے سیاسی ادارہ کھونے کا چرچا اتنے مبالغہ آمیز انداز میں کیا کہ تمام مسلمانوں کا ذہن اس کی وجہ سے بگڑ گیا۔ وہ سمجھے کہ سیاسی ادارہ کو کھو کر انھوں نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ یہی واحد وجہ ہے کہ سو سال سے بھی زیادہ مدت سے مسلمان صرف ایک بے فائدہ کام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانا، اور جب سر ٹوٹ جائے تو مفروضہ دشمنوں کی سازش کے خلاف پرشور بیانات دینا۔

یہ بلاشبہ خودکشی کا راستہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ خودکشی کے راستہ کو چھوڑ کر زندگی کے راستہ کو اپنائیں، اور پھر وہ کامیابی کی شاہراہ کو اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بہت بڑی تعداد میں اپنے اندر اعاظم واکابر پیدا کئے۔ مگر ان کے یہ تمام بڑے اسی اصل چیز سے ناواقف نظر آتے ہیں جو اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ یعنی اسلام کا ایک فطری مذہب ہونا۔ بطور فخر تو بہت سے لوگوں نے اس کو دہرایا ہے، مگر بطور حقیقت شاید ان میں سے کسی نے بھی اسے نہیں جانا۔

اسلام کے دین فطرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی جڑیں خود فطرت انسانی میں پیوست ہیں۔ اسلام کے خلاف تخریبی منصوبے بنائے جاسکتے ہیں۔ مگر اسلام کو ختم کرنا کسی بھی شخص یا ادارہ کے لئے ممکن نہیں۔ کیوں کہ اسلام، نفسیاتی اعتبار سے، ہر آدمی حتی کہ خود مخالفین کے دلوں میں موجود ہے۔ وہ ہر ایک کا اپنا دین ہے، ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی شخص اسلام کے خلاف اپنے تخریبی منصوبہ میں کامیاب ہوسکے۔

کوئی شخص اپنی نفی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح کوئی شخص اسلام کی نفی بھی نہیں کرسکتا۔ اسلام کی نفی کرنا اپنی نفی کرنا ہے، اور کون ہے جو خود اپنی نفی کرنے پر قادر ہو۔ یہ واقعہ بلاشبہہ اسلام کے حق میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس طاقت کے ہوتے ہوئے کسی بھی حال میں مسلمانوں کے لیے مایوسی یا "خودکشی" کا کوئی سوال نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں سب سے بڑی طاقت ہے، اسی کے ساتھ وہ اپنی ذات میں اہل اسلام کا سب سے بڑا محافظ بھی۔

اکتوبر ۱۹۸۸ میں میری ملاقات ایک امریکی سیاح سے ہوئی۔ وہ خدا کو مانتا تھا اور مذہب میں عقیدہ رکھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک بار وہ ماسکو گیا اور وہاں کچھ عرصہ ٹھہرا۔ ایک روسی لڑکی اس کی گائڈ تھی۔ یہ لڑکی اکثر مذہب کے خلاف بولتی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی کہ نہ خدا کا کوئی وجود ہے اور نہ مذہب کی کوئی حقیقت۔ مثلاً ایک بار اس نے سیاح سے کہا کہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا اور اس نے خلا کا چکر لگایا۔ مگر اس نے یہ رپورٹ نہیں دی کہ اس نے خدا کو دیکھا ہے۔

سیاح نے بتایا کہ ایک روز گفتگو کے دوران اس کی زبان سے نکلا: مائی گاڈ (My God) سیاح نے کہا کہ جب خدا کی کوئی حقیقت نہیں تو تم مائی گاڈ کیوں کہتی ہو۔ سیاح کی اس پکڑ پر لڑکی پریشان ہوگئی۔ مزید بات چیت کے بعد اس نے اقرار کیا کہ اصل بات وہی ہے جو بے اختیار میری زبان سے نکلی۔ اب اس کا مصنوعی پردہ ہٹ گیا اور اس کا حقیقی انسان سامنے آگیا۔ اس کے بعد وہ لڑکی مذکورہ سیاح سے اتنا مانوس ہوئی کہ اس نے پیشکش کی کہ وہ اس سے نکاح کرکے آئندہ زندگی اسی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔

جو عقیدہ اتنی گہرائی کے ساتھ انسانی فطرت میں داخل ہو، اس سے بڑھ کر تسخیری طاقت بلاشبہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

ہر آدمی پیدائشی مسلم ہے

گاری ملر (Garry Miller) ایک امریکی عیسائی تھے۔ وہ ایک کالج میں بائبل کے ٹیچر تھے۔ ۱۹۷۸ میں ان کو یہ خیال ہوا کہ قرآن کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے قرآن اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اوپر اسلام کی حقّانیت منکشف ہوگئی اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان کا اسلامی نام عبدالاحد عمر ہے۔ وہ اب اپنی نومسلم بیوی کے ساتھ کناڈا میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے کو مذہب بدلنے والا (Convert) کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے آپ کو واپس آنے والا (Revert) کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے بلکہ میں اپنے پیدائشی مذہب کی طرف واپس آیا ہوں:

> I haven't converted to Islam but merely
> reverted , to my birthright religion.
> *Muslim Journal* Chicago, June 21, 1985

مذکورہ نومسلم نے جو بات کہی وہ بے حد اہم ہے۔ اور عین قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے (الروم ۳۰) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا خدا کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کُلّ مولودٍ یولَد علی الفطرۃ) اس اعتبار سے ہر آدمی پیدائشی مسلم ہے۔ خدا کے کارخانے سے وہ مسلم و مومن بن کر آتا ہے۔ اس کے بعد اس کی قومی روایات اور اس کے ماحول کے اثرات اس کو کسی اور مذہب پر ڈال دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلامی دعوت کا کام حقیقۃً لوگوں کے مذہب کو بدلنا نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی غلاف کو ہٹا دینا ہے۔ اگر ہم ایسا کر سکیں کہ انسان کے اوپر پڑے ہوئے خارجی غلاف کو ہٹا دیں تو اس کے بعد جو انسان بچے گا وہ وہی ہوگا جس کو مومن کہا جاتا ہے۔

ہر آدمی حقیقت کے اعتبار سے مومن ہے، اگرچہ ظاہر کے اعتبار سے وہ کچھ اور دکھائی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ انسان کی یہ فطرت اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امدادی قوت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی کے سینہ میں دین حق کا ایک مثنیٰ موجود ہے۔ آدمی کا اندرونی شعور خود اس بات کی تصدیق کر رہا ہے کہ یہی حق ہے اور اس کو اپنی چیز سمجھ کر اسے اختیار کر لینا چاہیے۔ یہ اسلامی دعوت کے حق میں ایک ایسا امکان ہے جو کسی اور دعوت کو حاصل نہیں۔

ترکی کا سبق

ترکی کے عصمت انونو (۱۸۸۴-۱۹۷۳) ایک فوجی افسر تھے۔ انھوں نے کمال اتاترک کا ساتھ دیا۔ اتاترک کی وفات (۱۰ نومبر ۱۹۳۸) کے بعد وہ ترک حکومت کے صدر مقرر ہوگیے۔

وہ کمال اتاترک کے بعد دوسرے سب سے بڑے لیڈر تھے

کمال اتاترک کے مشہور چھ اصولوں میں سے ایک اصول سیکولرزم تھا۔ اس کا مطلب ان کے نزدیک محض مذہبی ناطرفداری نہ تھا۔ بلکہ جارحانہ لامذہبیت تھا۔ کمال اتاترک کے پورے دورِ حکومت میں اور پھر عصمت انونو کے دورِ حکومت میں یہی حکومت کی مستقل پالیسی رہی۔ مگر مذہب (اسلام) کے خلاف پوری حکومتی طاقت استعمال کرنے کے باوجود ترکی سے مذہب کا خاتمہ نہ کیا جاسکا۔ وہ بدستور پوری طاقت کے ساتھ زندہ رہا، یہاں تک کہ خود عصمت انونو کو اپنے آخری الکشن کے موقع پر بہت سی مذہبی پابندیوں کو ختم کرنا پڑا، کیوں کہ اس کے بغیر وہ عوامی حمایت کی امید نہیں کرسکتے تھے۔

عصمت انونو جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخر وقت میں انھوں نے اس معاملہ میں اپنے تجربات کا خلاصہ بیان کیا۔ ان کا یہ تجرباتی تاثر عربی رپورٹ کے مطابق یہ تھا:

انني لا اكاد اُصدق ما ارى۔ لقد بذلنا كل ما نستطيع لانتزاع الاسلام من نفوس الاتراك وغرس مبادئ الحضارة الغربية مكانه۔ فاذا بنا نفاجأ بما لم نكن نتوقعه۔ فقد غرسنا العلمانية فاثمرت الاسلام۔

(الوعی الاسلامی، کویت، ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ صفحہ ۲۷)

میرے لیے اس کا یقین کرنا مشکل ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے اپنے بس بھر تمام کوشش کی کہ ترکوں کے دل سے اسلام کو نکال دیں اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کو ان کے اندر داخل کریں۔ مگر حیرت انگیز طور پر نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا۔ ہم نے سیکولرزم کا پودا لگایا مگر اس سے جو پھل نکلا وہ اسلام تھا۔

اسلام کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ جس طرح فطرت کو ختم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسلام کو بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے خادموں کو ساری کوشش دعوت کے محاذ پر کرنا چاہیے، اسلام کی حفاظت تو اپنے آپ ہو رہی ہے۔

اسلامی عمل دعوتی عمل ہے

کسی اجتماعی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے منظم عمل لازمی طور پر ضروری ہے۔ جب بھی ایک شخص کوئی اجتماعی نشانہ تجویز کرتا ہے تو اپنے مزاج کے مطابق، اپنی مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے لیے وہ ایک عمل بھی ضرور مقرر کرتا ہے۔ اس عمل کی مختلف صورتیں ہیں۔

عمل کی ایک صورت وہ ہے جس کو متشددانہ عمل (Violent activism) کہا جاتا ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس کی ایک تازہ اور قریبی مثال آزاد سکھ ریاست (خالصتان) کے حامیوں کی ہے۔ ۱۹۸۷-۸۸ میں انھوں نے پنجاب میں اسی کے مطابق عمل کیا، اگرچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔

عمل کی دوسری صورت وہ ہے جس کو غیر متشددانہ عمل (Non-violent activism) کہا جاتا ہے۔ اس میں ہتھیار استعمال کیے بغیر عوامی مظاہرہ اور عوامی ایجی ٹیشن کے ذریعہ فریق ثانی پر دباؤ ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ فریق اول کے مطالبات کو مان لے۔ مہاتما گاندھی نے ۱۹۴۷ سے پہلے انگریزوں کے خلاف اسی طریقہ کو استعمال کیا، اور کامیابی حاصل کی۔

عمل کی تیسری صورت وہ ہے جس کو سیاسی عمل (Political activism) کہا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال الکشنی سیاست ہے۔ الکشن کے موقع پر مخالف پارٹیاں اسی طریقہ کو استعمال کرکے حکمراں پارٹی کو گراتی ہیں۔ اور حکومت کے ایوان پر قبضہ حاصل کرتی ہیں۔

عمل کے ان طریقوں میں سے کوئی بھی طریقہ اسلام کے مزاج کے مطابق نہیں۔ اسلام کا طریقِ عمل جو قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے وہ دعوت ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جاسکتا ہے۔ اس طریقہ میں سارا انحصار سنجیدہ ذرائع پر کیا جاتا ہے — منوانے کے بجائے متاثر کرنا۔ ہرانے کے بجائے دل جیتنا۔ حریف اور رقیب بننے کے بجائے ہمدرد اور ناصح بن کر سامنے آنا۔ فریق ثانی سے نفرت کرنے کے بجائے اس سے محبت کرنا، یہاں تک کہ اس کے حق میں دعائیں نکلنے لگیں دعوت خیر خواہی کا نام ہے نہ کہ مقابلہ آرائی کا۔

یہ دعوتی عمل ہی صحیح اسلامی عمل ہے۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کو اختیار کرکے مسلمان کامیاب ہوسکتے ہیں، موجودہ دنیا میں بھی اور آئندہ آنے والی ابدی جنتوں کی دنیا میں بھی۔

دعوتی شعور

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے سب سے بڑی چیز جو کھوئی ہے، وہ دعوتی شعور ہے۔ دعوت کی صورت میں انھیں ایک ایسی نعمت حاصل ہے جو انھیں تمام قوموں میں سب سے زیادہ موافق پوزیشن (Advantageous position) میں کھڑا کر دیتی ہے۔ مگر دعوتی شعور نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس قیمتی امکان کو استعمال نہیں کر پاتے۔ وہ ایسے محاذوں پر اپنی طاقت ضائع کر رہے ہیں جہاں انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔ اور جہاں سے انھیں سب کچھ مل سکتا ہے، وہاں سرے سے وہ کوئی عمل ہی نہیں کرتے۔

آج مسلمانوں کے درمیان کرنے کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ان کے اندر دعوتی شعور کو زندہ کیا جائے۔ اس کام کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں محنت کرنا صرف اپنا وقت اور سرمایہ ضائع کرنا ہے، خواہ وہ میدان بظاہر کتنا ہی زیادہ اہم نظر آتا ہو۔

مَنْ نحنُ

ستمبر ۱۹۸۲ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں سعودی عرب کے ایک سفر پر تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک عرب عالم سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے اپنے ایک مقالہ کا ذکر کیا جو انھوں نے کسی عربی ماہنامہ میں چھپوایا تھا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا: مَن نحنُ (ہم کون ہیں) انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کے معاملہ پر اظہار خیال کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں مسلمان کی شخصیت (Identity) کا تعین کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ موجودہ دنیا میں ان کی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے بعد ہی ہم مسلمان کے لیے صحیح راہ عمل کا تعین کر سکتے ہیں۔

عرب عالم کی یہ بات انتہائی حد تک درست ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "ہم کون ہیں" کا جواب معلوم کرنے کے بعد ہی اس سوال کا جواب متعین کیا جا سکتا ہے کہ "ہم کیا کریں" قومی شخصیت کی صحیح نشاندہی کے بعد ہی قومی لائحہ عمل کی صحیح نشان دہی کی جا سکتی ہے، نیز اسی سے ہمیں وہ معیار حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعہ جانچ کر معلوم کیا جا سکے کہ مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں وہ از روئے واقعہ صحیح ہے یا غلط۔

ایک مثال

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں میں امریکہ کی مثال دوں گا۔ "مَن نحنُ" کا جو سوال ہمارے لیے ہے، وہی دوسرے انسانی گروہوں کے لیے ہے۔ چنانچہ امریکہ کے سامنے بھی یہی سوال تھا۔ امریکہ کے ۳۰ویں صدر مسٹر کالون کولج (Calvin Coolidge) جو ۱۹۲۳ سے ۱۹۲۹ تک امریکہ کے صدارتی منصب پر تھے، انھوں نے اس کا جواب ان لفظوں میں دیا تھا کہ امریکہ کا کام تجارت کرنا ہے:

The business of America is business.

امریکہ نے تجارت (بزنس) کو اپنا مقصد بنایا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس میں لگا دیا۔ اس میں اس کو اتنی زبردست کامیابی ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد تقریباً ۲۵ سال تک وہ تنہا اقتصادی دنیا کا شہنشاہ بنا رہا۔ تمام اعلیٰ ٹکنالوجی، نیوکلیر انرجی سے لے کر مائیکرو الکٹرانکس تک، امریکہ کے قبضہ میں تھی۔ مگر ۱۹۷۰ کے بعد حالات میں تبدیلی شروع ہوئی۔ وہ مسلسل بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں یہ

تبدیلی اس نوبت کو پہونچ گئی کہ امریکہ کے لیے اس پر سوچ بچار کرنا ضروری ہوگیا۔

تازہ صورت حال یہ ہے کہ جاپان، ویسٹ جرمنی اور ساؤتھ کوریا عالمی مارکٹ پر چھا گئے ہیں۔ آج سیمی کنڈکٹر (Semi conductor) کا بزنس زیادہ تر جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ ۱۹۷۰ تک دنیا بھر کے ہوائی جہازوں کا ۹۵ فی صد حصہ امریکہ سے آتا تھا، آج مختلف مغربی ممالک اس صنعت میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ برطانیہ کی ایربس نے ہوائی جہاز کی تقریباً ۲۰ فی صد مارکٹ پر قبضہ کر لیا ہے، وغیرہ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کا تجارتی توازن (Trade balance) بگڑ گیا۔ ۱۹۸۸ میں مغربی یورپ کے مقابلہ میں امریکہ کا ڈیفیسٹ ۳۰ بلین ڈالر تھا اور جاپان کے مقابلہ میں امریکہ کا ڈیفیسٹ ۶۰ بلین ڈالر تھا۔

امریکی مدبرین کے پاس اپنے معاملہ پر غور کرنے کے لیے ایک معیار موجود تھا۔ اور وہ بزنس تھا۔ انھوں نے بزنس کے معیار پر اپنے آپ کو جانچنا شروع کیا۔ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ ڈیفنس ریسرچ اور فوجی اہمیت کے سامانوں کی تیاری میں ان کے غیر معمولی جھکاؤ نے یہ غیر متوازن صورت پیدا کر دی ہے۔ مثلاً امریکہ نے ۱۹۸۱ میں اپنے بجٹ کا نصف حصہ ڈیفنس سے تعلق رکھنے والی صنعتوں پر خرچ کیا۔ ۱۹۸۶ میں یہ خرچ ۶ فیصد تک پہونچ گیا، جب کہ اسی مدت میں، مثال کے طور پر، جاپان نے اپنے بجٹ کا صرف ۲ ــ ۵ فی صد سالانہ ڈیفنس ریسرچ پر خرچ کیا۔ امریکہ بم اور میزائل جیسی چیزیں بنانے میں مصروف رہا، اور دوسرے ممالک کار اور کمپیوٹر جیسی چیزیں بنانے میں لگے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ نے اگرچہ فوجی ٹکنالوجی (Military technology) میں ترقی کی مگر تجارتی ٹکنالوجی (Commercial technology) میں وہ دوسرے ملکوں سے پیچھے ہوگیا۔

امریکہ کے پاس اپنے قومی نفع اور نقصان کو جانچنے کا جو معیار تھا، اس کے لحاظ سے یہ صورت حال اس کے لیے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی پالیسی کا رخ بالکل بدل دیا۔ اگست ۱۹۸۸ میں امریکی کانگرس نے ایک نیا تجارتی قانون (US Trade Bill-1988) پاس کیا جس کے مطابق امریکہ میں اقتصادی عمل کا رُخ بالکل بدل دیا گیا۔ اس سے پہلے امریکہ اپنے بجٹ کا زیادہ حصہ ملٹری ٹکنالوجی کو ترقی دینے پر خرچ کرتا تھا۔ اب امریکہ اپنے بجٹ کا زیادہ حصہ کمرشیل ٹکنالوجی کی ترقی میں خرچ کرے گا (ٹائمس آف انڈیا ۶ ستمبر ۱۹۸۸)

موجودہ امریکی صدر رونالڈ ریگن اس سے پہلے سوویت روس سے شدید نفرت کرتے تھے۔ ان کے

لیے ناقابل تصور تھا کہ وہ ماسکو کا سفر کریں اور روسی لیڈروں سے مفاہمت کی بات کریں۔ وہ سوویت روس کو شیطانی سلطنت (Evil empire) کہا کرتے تھے۔ مگر انھوں نے سوچا کہ جب تک روس سے رقابت اور مخاصمت کا تعلق ختم نہ کیا جائے اس وقت تک ایسا نہیں ہو سکتا کہ فوجی تقاضوں کو نظر انداز کر کے تجارتی ترقی کا عمل جاری کیا جائے۔ ایک کام کو کرنے کے لیے بہر حال دوسرے کام کو چھوڑنا پڑے گا۔ چنانچہ انھوں نے سوویت روس سے مخاصمت کی پالیسی کو ترک کر کے مفاہمت (Adjustment) کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ تبدیلی کے اس انقلابی عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مدبر آرتھر شلی سنگر (Arthur Schlesinger) نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ریگن نے خود ہی ریگن ازم کو بھلا دیا ہے:

Mr Reagan himself seems to have foresaken Reaganism.

اس پورے عمل کا خلاصہ، ٹائم (۲۶ ستمبر ۱۹۸۸) کے الفاظ میں یہ ہے کہ پہلے اگر امریکہ کی توجہ صنعتوں کے فوجی بنانے (Militarization) پر لگی ہوئی تھی تو اب اس کی توجہ صنعتوں کو غیر فوجی بنانے (Demilitarization) پر مرتکز ہو گئی ہے (صفحہ ۱۹)

دورِ جدید کے مسلمان

امریکہ کے ساتھ اپنے حالات کے اعتبار سے جو کچھ پیش آیا، وہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ اپنے حالات کے اعتبار سے پیش آرہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں، کہیں اپنوں کے ساتھ اور کہیں غیر اقوام کے ساتھ، لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آج، تعلیمی اور اقتصادی اعتبار سے، دنیا کی سب سے زیادہ پسماندہ قوم ہیں۔ اور اس کا سبب ان کی یہی بے معنی لڑائیاں ہیں۔ مگر امریکہ نے صرف دس سال کے تجربہ میں اپنی غلطی کو دریافت کر لیا۔ وہ اپنی قومی پالیسی کو بدل کر اپنی اصلاح کرنے میں لگ گیے۔ جب کہ مسلمانوں پر ایک سو سال سے بھی زیادہ مدت گزر گئی، مگر اب تک وہ غفلت کی نیند سے بیدار نہیں ہوئے۔

مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا شاہ محمد اسماعیل اپنے ساتھیوں کو لے کر ۱۸۳۱ میں پنجاب پہنچے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سے جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ انتہائی بے معنی طور پر مسلمانوں کے بے پناہ جانی اور مالی نقصان پر ختم ہوئی۔ ۱۸۵۷ میں علماء ہند نے انگریزوں سے جنگ کی۔ یہ ٹکراؤ اتنا زیادہ

تھا اور اس میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان اٹھانا پڑا کہ اس

یا۔ ملکی تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد مسلمان مسلسل اکثریتی فرقہ سے جھگڑا چھیڑے ہوئے ہیں

نگی قیمت فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔

یہ قصہ آج ساری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ لنکا، اریٹیریا، برما، فلپائن،
موزمبیق اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر مسلمان تعلیمی سماجی اور اقتصادی اعتبار سے انتہائی حد تک
پچھڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ملکی حکومتوں سے غیر ضروری جنگ میں مشغول
ہونے کی وجہ سے تعمیر کے کاموں میں مصروف نہیں ہو پاتے۔ ایران و عراق آٹھ سال (۱۹۸۰-۸۸) تک
اسلامی تاریخ کی سب سے زیادہ خونی جنگ لڑتے رہے۔ اس بے معنی جنگ نے مسلم دنیا کو تمام تعمیری
شعبوں میں ناقابل بیان حد تک پیچھے کر دیا۔ اس قسم کے خونی ڈرامے، ایک یا دوسری صورت میں،
ساری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو آخری حد تک برباد کر رکھا ہے۔ مگر انتہائی لمبی مدت
گزرنے کے باوجود مسلمانوں کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے معاملہ پر نظر ثانی کریں۔

اس تباہ کن غفلت کی وجہ کیا ہے، اس کی وجہ، ایک لفظ میں، یہ ہے کہ مسلمانوں نے
’’من کُنّ‘‘ کے جواب میں ایک ایسا غیر واقعی نظریہ بنا رکھا ہے جس میں انھیں اپنے یہ غلط اعمال غلط
دکھائی نہیں دیتے۔ ان کی خود ساختہ کسوٹی میں بے معنی جنگ کا نام جہاد ہے، احمقانہ بربادی کا
قربانی ہے۔ نعرے اور جھنڈے کی بے فائدہ سیاست کا نام اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ خواہ مخواہ
ہو کر لڑ مرنے کا نام شہادت ہے۔ اس بنا پر ٹکراؤ کی پالیسی انھیں غلط نظر نہیں آتی۔ اور
غلط نظر نہ آئے وہ اس کو چھوڑنے کے لیے بھی تیار نہیں ہو سکتا۔

اسی غلط فکری کا یہ نتیجہ ہے کہ مذکورہ بالا قسم کی بے فائدہ ہلاکت اور برباد
لیا گیا بلکہ انتہائی جذباتی انداز میں اس کو گلوریفائی کیا گیا۔ مثال کے طور پر ملا
جلد ثانی میں ’’شہدائے بالاکوٹ کا مقام اور پیغام‘‘۔ ہلاکت اور بربادی کا
زمانہ کے مسلمانوں کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی، پوری انسانی تا
خالی ہے۔

بربادی کو گلوریفائی کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ بربادی

تشخص کی غلطی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں، تشخص کی غلطی کا کیس ہے۔ انھوں نے "من نحن" کا غلط جواب دریافت کر رکھا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں غلط اور بے فائدہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی صحیح کسوٹی نہیں جس کے ذریعہ جانچ کر وہ اپنی غلطی کو جانیں اور اس کی تصحیح کریں۔ تشخص کی غلطی کی مثالیں موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کی تقریروں اور تحریروں سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

آزاد سبحانی ایک پُرجوش عالم تھے۔ انھوں نے اپنے پیرووں کو یہ تعلیم دی تھی کہ جب وہ آپس میں ملیں تو اس طرح ملیں کہ ایک شخص کہے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" دوسرا شخص جواب دے "نحن خلیفۃ اللہ" اپنی موجودہ صورت میں وہ ایک عجیب طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر آج کل کے مسلمانوں کا مزاج بتانے کے لیے وہ بالکل درست ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے "من نحن" کا جو جواب دریافت کیا ہے، وہ ایک لفظ میں یہی ہے کہ "نحن خلیفۃ اللہ"۔ مسلمان اپنے آپ کو دنیا میں خدا کا خلیفہ (بمعنی نائب) سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کی طرف سے وہ اس لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ وہ دنیا کے اوپر ت کریں، خدا کی نمائندگی میں وہ ساری دنیا کے آقا و مالک بنیں۔

یہی وہ غیر قرآنی اور غیر مسنون ذہن ہے جو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان وہی لوگ مقبولیت حاصل کرتے ہیں جو ان کے لیے ان کے اس مخصوص مزاج کی تسکین فراہم کریں۔ اقبال مسلمانوں کے درمیان اسی لیے مقبول ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو ایسی لفظی خوراک دیتے تھے جس میں ان کے اس جذبہ برتری کی پوری تسکین موجود تھی۔ آج تمام مسلمانوں کی زبان پر اقبال کا یہ شعر ہے:

سبق پڑھ پھر صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مفکرین، ایک یا دوسرے لفظ میں، یہی بات کہتے ہیں۔ کسی نے دین کی تشریح اس طرح کی کہ دین کو "اسٹیٹ" کے ہم معنی بنا دیا۔ کسی نے کہا کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد ساری دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ کسی نے مسلمانوں کے نصب العین کو اقامتِ دین کے لفظ میں بیان کیا۔ مگر اس کے نیچے تشریحی نوٹ لگا دیا کہ وہ اقامتِ دین کا لفظ اقامتِ حکومت کے معنی میں استعمال کر رہا ہے۔

میں نے ایک بار کشمیر کے ایک مسلم نوجوان سے پوچھا کہ مسلمان تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں

سرگرم نہیں ہوتے۔ البتہ دوسروں سے لڑنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتے ہیں، اس کا سبب کیا ہے۔ کشمیری نوجوان نے جواب دیا: ”مسلمان اپنے آپ کو ڈکٹیٹر سمجھتا ہے“۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ مسلمانوں کی نفسیات کو بتلانے کے لیے یہ الفاظ نہایت صحیح ہیں۔

محتسب کائنات

ایک بزرگ جو آج کل مسلمانوں کے ہر حلقہ میں مقبول ہیں، اس اعتبار سے ان کو موجودہ مسلمانوں کی ایک نمائندہ شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی ایک مشہور کتاب میں ” دینِ الٰہی کا علم بردار اور دنیا کا محتسب “ کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> ” مسلمان اپنے دین کی رُو سے دنیا کے محتسب اور خدائی فوجدار ہیں۔ جس دن وہ بیدار ہوں گے اور اپنا فرض منصبی انجام دیں گے، وہ مشرق اور مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب ہوگا “ صفحہ ۳۹۴

یہی بزرگ دوسری جگہ لکھتے ہیں: ” سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم آخری امت ہیں۔ ہم حامل قرآن ہیں۔ ہم داعی الی اللہ ہیں۔ ہم محتسب کائنات ہیں۔ اقبال نے ابلیس کی زبان سے یہ حقیقت ادا کروائی ہے۔ ابلیس کے سامنے اس کی مجلس شوری میں مختلف قوموں کے بارہ میں کہا گیا اور مختلف خطروں کی نشاندہی کی گئی۔ اس کی مجلس کے ارکان نے کہا کہ ہمارے نظام اور کام کو اشتراکیت سے خطرہ ہے، ملوکیت سے خطرہ ہے۔ جمہوریت سے خطرہ ہے۔ ابلیس نے ان تمام خطروں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کے برخلاف اس نے کہا:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دین کی احتسابِ کائنات“

مسلمانوں کو حاکم اقوام سمجھنے کا ذہن تو موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنماؤں میں پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ لوگوں کو ” حاکم اقوام “ کے لفظ میں پوری تسکین نہیں ملی۔ وہ مسلمانوں کو حاکم زمین سے آگے لے جا کر حاکم کائنات کے منصب پر بٹھانا چاہتے تھے۔ یہ ضرورت شاعر نے اپنی قوت تخئیل سے ابلیس کی مجلس شوری منعقد کر کے پوری کر دی۔ اب ابلیس کے مفروضہ کلام کی بنیاد پر اعلان کر دیا گیا کہ مسلمان محتسب کائنات ہیں ـــــــ کیسا عجیب ہے مسلمانوں کا وہ اسلامی منصب جس کا ماخذ خدا اور رسول کے کلام میں موجود نہ ہو۔ البتہ وہ ابلیس کے کلام سے شاندار طور پر برآمد ہو جائے۔

پورے قرآن میں یا تمام کتب حدیث میں کہیں بھی یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ ” مسلمان محتسب کائنات

ہیں۔" تاہم جو لوگ مسلمانوں کو اس کائناتی منصب پر دیکھنا چاہتے تھے، انھوں نے ابلیس کے مفروضہ کلام سے اس کو برآمد کر لیا۔ غالباً ان کا بڑھا ہوا شوق یہ سمجھنے میں رکاوٹ بن گیا کہ مسلمانوں کا اسلامی منصب خدا اور رسول کے کلام سے نکلے گا نہ کہ ابلیس کے کلام سے۔

حاکمانہ حیثیت

اب سوال یہ ہے کہ اس نظریہ کا ماخذ کیا ہے کہ مسلمان حاکم اقوام ہیں۔ یہاں بھی قرآن وحدیث کا پورا ذخیرہ ایسے کسی جملہ سے خالی ہے جس کا ترجمہ یہ ہو کہ "مسلمان حاکم اقوام ہیں"۔ پھر یہ نظریہ کہاں سے اخذ کیا گیا، اس کو سمجھنے کے لیے مذکورہ بزرگ کی ایک کتاب کی حسب ذیل عبارت پڑھیے :

" جہاں تک کسی ملک میں مسلمانوں کے رہنے، وہاں ان کی حیثیت اور ان کے فرائض منصبی کا سوال ہے، تو تاریخ اسلام کے طویل سلسلہ اور فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں اس کے دو نمونے ملتے ہیں۔ پہلا نمونہ یہ ہے کہ مسلمان حاکمانہ حیثیت میں ہوں اور وہ ملک اسلامی حکومت کے زیر اقتدار ہو، جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد رومی و ایرانی شہنشاہیاں اور ان کے ممالک مسلمانوں کے زیر نگیں آئے۔ اور مسلمان جزیرۃ العرب سے لے کر مراکش تک پھیل گیے۔ انھوں نے افریقہ کی پوری شمالی مغربی پٹی فتح کر لی اور اس کے آگے سمندر کو عبور کر کے یورپ کے ملک اسپین پر قابض ہو گیے۔ اس حیثیت کے متعلق صریح احکام ہیں۔ قرآن مجید کے اشارات ہیں۔ ہدایات ہیں۔ صحابۂ کرام کا طرز عمل ہے کہ ایسے موقع پر مسلمانوں کا منصب کیا ہے، مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ـ ـ ـ ـ ـ دوسری شکل یہ ہے کہ مسلمان کسی جگہ مختصر و محدود اقلیت میں ہوں۔ وہ اس ملک کے حالات پر مطلقاً اثر انداز نہ ہو سکتے ہوں۔ ان کا ملک کے نظم ونسق میں کوئی حصہ نہ ہو۔ وہ خالص محکومانہ زندگی گزار رہے ہوں۔" صفحہ ۸ - ۹

اس عبارت میں اگرچہ دو نمونوں کا ذکر ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ موصوف کے بیان کے مطابق اصل نمونہ صرف ایک ہے، اور وہ "حاکمانہ حیثیت" ہے۔ کیوں کہ دوسرا نمونہ (محکومانہ حیثیت) بذات خود کوئی مستقل نمونہ نہیں۔ وہ دراصل مطلوب حاکمانہ حیثیت کے فقدان سے پیدا ہونے والی غیر مطلوب صورت حال کا نام ہے۔

اس "حاکمانہ نمونہ" کا ماخذ کیا ہے، اس کا جواب مذکورہ عبارت کے فقرہ (خلافتِ راشدہ کے بعد) میں موجود ہے۔ یہ فقرہ بتاتا ہے کہ موصوف اسلام کی تاریخ کو "خلافتِ راشدہ کے بعد"

سے شروع کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی تاریخ نام ہے فتوحات ملکی اور حکومت اقوام کا۔ اس لیے انھیں اسلام کی تاریخ میں ایک ہی اعلیٰ مطلوب نمونہ ملتا ہے اور وہ "حاکمانہ حیثیت" کا ہے۔

یہ بلاشبہ ہمالیہ پہاڑ سے زیادہ بڑی غلطی ہے۔ کیوں کہ اسلام کی تاریخ حرا کے بعد سے شروع ہوتی ہے نہ کہ خلافت کے بعد سے۔ اسلام کی تاریخ مکہ میں اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت توحید کا آغاز کیا۔ مذکورہ بزرگ اگر اسلامی تاریخ کو "مکہ" سے شروع کرتے تو انھیں سب سے پہلے داعی کا نمونہ ملتا۔ مگر جب انھوں نے اسلام کی تاریخ کو "خلافت راشدہ کے بعد" سے شروع کیا تو قدرتی طور پر حکومت اور کشور کشائی کے واقعات مسلمانوں کی اصل شناخت بن گیے۔

اسلام کی تاریخ میں دعوت اور داعی کا نمونہ ٹی ڈبلو آرنلڈ کو اتنا نمایاں طور پر نظر آیا کہ انھوں نے "پریچنگ آف اسلام" کے نام سے ۵۰۰ صفحات کی ایک مستقل کتاب لکھ کر شائع کر دی۔ مگر مسلم مفکرین کو اسلام کی تاریخ میں صرف حاکم کا نمونہ نظر آیا۔ داعی کا نمونہ نظر نہیں آیا۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک مسلم مصنف اور ایک عیسائی مصنف کے درمیان پایا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ مسلم مصنف نے اسلامی تاریخ کو متاثر ذہن کے تحت دیکھا اور عیسائی مصنف نے غیر متاثر ذہن کے تحت۔

دعوہ بلائنڈ

آنکھ کی بیماریوں میں سے ایک بیماری رنگ کا اندھاپن (Colour blindness) ہے۔ جو آدمی اس بیماری میں مبتلا ہو اس کو رنگ کا اندھا (Colour blind) کہا جاتا ہے۔ یہ بیماری عام طور پر آنکھ کا پردہ (Retina) میں خرابی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس بیماری سے متاثر افراد بعض رنگوں کو دیکھتے ہیں مگر بعض دوسرے رنگ انھیں دکھائی نہیں دیتے۔

رنگ کے یہ اندھے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص لال رنگ کا اندھا (Red blind) ہوتا ہے، کوئی نیلے رنگ کا اندھا (Blue blind) اور کوئی ہرے رنگ کا اندھا (Green blind) جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہوں وہ اپنے مبتلائے مرض ہونے سے مکمل طور پر بے خبر رہتے ہیں۔ وہ انھیں رنگوں کو جانتے ہیں جو ان کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ جس رنگ کو ان کی آنکھیں دیکھ نہ رہی ہوں، وہ سادہ طور پر سمجھ لیتے ہیں کہ ایسے کسی رنگ کا وجود ہی نہیں۔

موجودہ مسلمانوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی شاید اسی قسم کے مریض بن گیے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو دعوت کا اندھا (Dawah blind) کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کو ہر چیز دکھائی دیتی ہے، مگر ایک چیز انھیں بالکل دکھائی نہیں دیتی۔ یہ دعوت کا کام اور اس کے مواقع ہیں۔ اس مرض میں مسلمانوں کے اکابر بھی اتنا ہی مبتلا ہیں جتنا کہ ان کے اصاغر۔ جو لوگ رنگ کے اندھے پن میں مبتلا ہوں وہ لال، نیلا، ہرا، جیسے الفاظ کو سن کر یا پڑھ کر یاد کر لیں گے۔ ان کو اپنی زبان سے دہرائیں گے مگر وہ ان کی حقیقت سے مکمل طور پر بے خبر رہیں گے۔ یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو دعوت کے اندھے (دعوہ بلائنڈ) ہو گیے ہوں۔ وہ دعوت کا لفظ بولیں گے مگر دعوت کی حقیقت اور اس کی نوعیت کی انھیں کوئی خبر نہ ہوگی۔ وہ ایک طرف دعوت کا نام لیں گے اور اسی کے ساتھ ایسی باتیں کہیں گے جن کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ حتی کہ ایسی باتیں بھی جو دعوت اور دعوتی مصالح کے سراسر خلاف ہیں۔

دعوہ بلائنڈ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو قرآن و حدیث میں قتال فی سبیل اللہ کے احکام دکھائی دیتے ہیں مگر انھیں دعوت الی اللہ کے احکام نظر نہیں آتے۔ مسلمانوں کا "منصب و مقام" بتانے کے لیے انھیں قائدانہ الفاظ مل جاتے ہیں، مگر اس کے لیے انھیں داعیانہ الفاظ نہیں ملتے۔ تاریخ اسلام اور فقہ اسلامی کے ذخیرہ میں وہ حاکمانہ حیثیت کے نمونے پا لیتے ہیں مگر ان کو اس کے وسیع ذخیرہ میں داعیانہ زندگی کے نمونے نہیں ملتے۔ انھیں دار الاسلام اور دار الحرب کی اصطلاحیں معلوم ہیں مگر دار الدعوہ کی اصطلاح ان کے لیے اجنبی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں وہ فتوحات ملکی کے واقعات دیکھتے ہیں مگر تسخیر قلوب کے واقعات انھیں نظر نہیں آتے۔ ان کو مسلمانوں کا وہ زمانہ دکھائی دیتا ہے جب وہ تخت حکومت پر تھے مگر انھیں وہ زمانہ دکھائی نہیں دیتا جب مسلمان خدا کے بندوں کے سامنے خدا کے دین کے داعی بنے ہوئے تھے۔

یہ مسلمانوں کی ایک نئی قسم ہے جو موجودہ زمانہ میں وجود میں آئی ہے۔ اس کو ایک لفظ میں دعوت کا اندھا (Dawah blind) کہا جا سکتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ مسلمان ہر دوسری بات کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر دعوت کی بات کیجیے یا دعوت کے مصالح ان کے سامنے بیان کیجیے تو وہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ دعوہ بلائنڈ ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو وہ دعوتی

امکانات بالکل دکھائی نہیں دیتے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کھولے ہیں۔ عظیم امکانات کے کنارے کھڑے ہوئے وہ صرف شکایت اور احتجاج میں مشغول ہیں۔ اس کی وضاحت کے لیے یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔

کلکتہ ہائی کورٹ کا واقعہ

کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک رٹ پٹیشن کا قصہ ”جدید امکانات“ کے تحت تفصیل سے آچکا ہے۔ ہائی کورٹ کی جسٹس پدما خستگیر نے ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ کو چندن مل چوپڑا کا ایک دعویٰ برائے سماعت منظور کرلیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن کی طباعت و اشاعت پر ہندستان میں پابندی لگا دی جائے، کیوں کہ قرآن ایسے عقائد کی تعلیم دیتا ہے جو ملک کے غیر مسلم فرقوں کے لیے خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسٹس باسک نے ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو اس مقدمہ پر ہائی کورٹ کا ابتدائی فیصلہ سناتے ہوئے اس کو خارج کر دیا۔ انھوں نے تفصیلات بیان کرتے ہوئے اپنے فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۴۰ میں لکھا کہ :

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

اس کے بعد ۲۴ نومبر ۱۹۸۵ کو کلکتہ ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مسٹر دیپک سین اور مسٹر جسٹس شیامل کمار سین کی ڈویژنل بنچ نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ اس فیصلہ میں جسٹس دیپک سین نے کہا کہ قرآن مذہب اسلام کی بنیادی کتاب ہے اور پیغمبر اسلام کے زمانہ سے آج تک کسی مہذب ملک میں اس نوعیت کا مقدمہ قرآن کے خلاف دائر نہیں کیا گیا۔

فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں مزید کہا کہ ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۹۵ قرآن یا دوسری مقدس کتابوں پر لاگو نہیں ہوتی جس کے تحت انھیں ضبط کیا جائے اور قانونی پابندی لگائی جائے۔ کسی بھی عدالت کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے کہ کسی تاریخی کتابِ آسمانی کے معاملہ میں مداخلت کرے۔

مسٹر جسٹس شیامل کمار سین نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ کسی مقدس آسمانی صحیفہ کو خلافِ قانون قرار دینے کی ایسی کوئی عرضی ایک سیکولر اسٹیٹ میں نہ قبول کی جاسکتی ہے اور نہ کسی مقدس کتاب پر پابندی لگائی جاسکتی ہے۔

واقعات کے مطابق، چندن مل چوپڑا کے دعویٰ کے جواب میں مسلمانوں کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں مدافعت یا اس کو ختم کرنے کی ساری کارروائی دوسروں نے کی۔ ملک کی سیکولر حکومت، سیکولر

انتظامیہ اور سیکولر عدالت مکمل طور پر اس کے خلاف متحرک ہو گئی۔ ریاستی ذمہ داروں سے لے کر مرکزی ذمہ داروں تک سب اس کے خلاف ہو گیے۔ اس وقت تک کوئی چین سے نہیں بیٹھا جب تک اس دعویٰ کو کامل طور پر مسترد نہیں کر دیا گیا۔

مگر اس پورے واقعہ کا سب سے زیادہ عجیب پہلو وہ ہے جو مسلمانوں کی طرف سے پیش آیا۔ ہندستان کے مسلم پریس میں اور بیرون ملک کے مسلم اخبارات و جرائد میں اس کے بارہ میں مضامین اور بیانات شائع ہوئے۔ مگر بلا استثناء تمام بیانات میں صرف ایک ہی بات کہی گئی۔ اور وہ اس بات کی مذمت تھی کہ ہندستان میں قرآن کے خلاف ایسا عدالتی مقدمہ قائم کیا گیا۔ ہر ایک کو "دعویٰ" دکھائی دیا، مگر اس کا "فیصلہ" کسی کو دکھائی نہیں دیا۔

اس واقعہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ چندن مل چوپڑا نے اس قسم کا ایک لغو مقدمہ دائر کیا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جب اس نے ایسا کیا تو سارا ملک، عوام سے لے کر حکومت تک، اس کے خلاف ہو گیا۔ ۸۰ کروڑ آدمیوں کے اس ملک میں کوئی بھی اس کی حمایت میں کھڑا نہیں ہوا۔ واقعہ کا اول الذکر پہلو اگر یہ تھا کہ اس ملک میں ایک شخص قرآن کی تبلیغ و اشاعت کا مخالف ہے تو اس کا دوسرا اہم تر پہلو یہ تھا کہ سارے ملک میں کوئی شخص یا ادارہ اس کی حمایت کرنے والا نہیں۔ یہ دوسرا پہلو دور جدید میں اسلامی دعوت کے عظیم امکان کو بتا رہا تھا۔ مگر مسلمانوں کے اصاغر و اکابر اس کو دیکھ نہ سکے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ دعوہ بلائنڈ ہو چکے تھے۔

تحفظاتی ذہن

مسلمانوں کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے تقلیدی مذہب کا کوئی نشان مٹتا ہوا نظر آئے تو وہ سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس دعوت کے معاملہ میں ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ دعوت کے مواقع برباد ہوں تو انھیں اس کی کوئی پریشانی نہیں۔ اس کی ایک مثال ۱۹۷۹ کا وہ واقعہ ہے جب کہ جنتا پارٹی کی حکومت کے زمانہ میں اس کے ایک ممبر مسٹر او پی تیاگی نے مذہبی آزادی (Freedom of religion) کا بل پیش کیا۔ اس بل کا مقصد عملاً یہ تھا کہ ملک سے تبدیلیٔ مذہب کے عمل کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الرسالہ مئی ۱۹۷۹)

اس بل کی سخت مخالفت ہوئی اور وہ پارلیمنٹ میں پاس نہ ہو سکا۔ مگر اس کا کریڈٹ تمام تر

عیسائی فرقہ کو جاتا ہے۔ جس نے اس کو ختم کرنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دی۔ مسلمان اس بل کے معاملہ میں اس طرح غیر جانبدار بنے رہے جیسے کہ ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔

حاکم نہیں داعی

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک قسم کے جنونِ عظمت (Paranoia) کا کیس ہے۔ جنونِ عظمت (پیرانوئیا) کا مطلب بڑائی کا فریب (Delusions of grandeur) ہے۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں وہ شخص مبتلا ہوجاتا ہے جو بطور خود اپنے کو بڑا سمجھے، جب کہ دوسرے لوگ اس کی بڑائی کو نہ مانتے ہوں۔ ایسا آدمی جھنجلاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرتا ہے اور ان سے لڑتا رہتا ہے، کیوں کہ اس کو دوسروں سے یہ شکایت ہوتی ہے کہ انھوں نے اس کی برتر حیثیت کا اعتراف نہیں کیا۔

"جنونِ عظمت" کے معاملہ کو ایک سادہ مثال کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مثال اس عام منظر کی ہے جو ساس اور بہو کے مسئلہ کی صورت میں ہر گھر میں پایا جاتا ہے۔ ایک عورت کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ اس کو محبت کے ساتھ پالتی ہے۔ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا کر اس کو بڑا کرتی ہے۔ اس کے بعد نہایت شوق کے ساتھ اس کی شادی کرتی ہے۔ مگر جب ایک لڑکی بہو بن کر اس کے گھر میں رہنے لگتی ہے تو دھیرے دھیرے وہ اس سے متنفر ہوجاتی ہے۔ وہ بات بات میں اس سے لڑتی ہے۔ حتیٰ کہ گھر کی فضا اتنی خراب ہوجاتی ہے کہ نہ ساس کو چین رہتا ہے اور نہ بیٹے اور بہو کو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہو کے آنے سے پہلے یہ " ساس " گھر کی مالک اود حاکم بنی ہوئی تھی۔ ہر کام اس کی مرضی سے ہوتا تھا۔ مگر بہو کی آمد کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ گھر کے اندر بہو کا عمل دخل شروع ہوجاتا ہے۔ بیٹا پہلے اپنی تنخواہ ماں کو دیتا تھا، اب نئے انتظام کار کی حیثیت سے وہ اپنی تنخواہ "بہو" کے ہاتھ میں دینے لگتا ہے۔ پہلے ہر کام میں صرف ماں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات کے تحت بہو سے مشورہ لیا جانے لگتا ہے۔ وغیرہ

" ساس " اس تبدیلی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ (Adjust) نہیں کر پاتی۔ ساس کو اگرچہ کوئی حقیقی تکلیف نہیں ہوتی، بلکہ اکثر اوقات اس کو پہلے سے زیادہ آرام حاصل رہتا ہے۔ مگر نفسیاتی طور پر وہ سمجھنے لگتی ہے کہ جس گھر میں اب تک میں حاکم کی حیثیت رکھتی تھی، وہاں بہو نے آکر مجھ کو محکوم بنا دیا ہے ——— وہ چیز جس کو عام طور پر " ساس بہو کا جھگڑا " کہا جاتا ہے، وہ ساس کی نسبت

سے اسی بدلی ہوئی صورت حال سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کرسکنے کا دوسرا نام ہے۔

یہی معاملہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آیا ہے۔ جس دنیا میں وہ "ماں" بن کر رہ رہے تھے، اچانک انھیں محسوس ہوا کہ وہ اس دنیا میں "ساس" بنا دیے گیے ہیں۔ یہ تبدیلی بذات خود کوئی برائی نہیں تھی۔ وہ ایک فطری صورت حال تھی جو خود خداوند عالم کے قانون کے تحت پیش آئی۔ مگر مسلمان چوں کہ اس تبدیلی کے ساتھ ذہنی موافقت نہ کرسکے اس لیے نئے نظام میں وہ "اپوزیشن" کا کردار ادا کرنے والے، یا صحیح تر لفظ میں پیرانوئنک کیرکٹر (Paranoic character) بن کر رہ گیے۔

جس زمانہ میں بابری مسجد تحریک کی دھوم تھی، میں نے ایک مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ وسیع مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ امام صاحب نے حسب معمول عربی خطبہ سے پہلے اردو میں ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے "شاعر اسلام" کے بلند بانگ اشعار سنائے، اور "اکابر ملت" کے شاندار فرمودات نقل کیے۔ اور پھر پُرجوش طور پر کہا:

> یہ بُت پرست ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں، ہم نے ایک ہزار سال تک ان کے اوپر حکومت کی ہے

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ان کا مسئلہ کسی دوسرے کے ظلم کا مسئلہ نہیں، ان کا مسئلہ دراصل وہ غلط ذہن ہے جو ان کے اپنے رہنماؤں نے ان کے اندر پیدا کیا ہے۔ مسلمان داعی الی اللہ ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کے اندر داعیانہ نفسیات کو ابھارا جائے۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے انتہائی مجرمانہ طور پر یہ کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر حاکمانہ نفسیات کو ابھارا۔ اسی غلط رہنمائی کا نتیجہ وہ سب چیزیں ہیں جن کو آج ہم مسلمانوں کی بربادی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف مغل سلطنت ٹوٹی۔ دوسری طرف عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوا۔ اس کے بعد بے شمار لوگ مسلمانوں کو رہنمائی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر ان تمام لوگوں نے ایک ہی مشترک غلطی کی۔ ان میں سے کسی شخص نے بھی ایسا نہیں کیا کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کے مطابق مسلمانوں کو صحیح رہنمائی دے۔ ہر ایک نے بس یہ کیا کہ ایک یا دوسرے انداز میں ماضی کی سیاسی کہانیاں سنانے لگا۔ ہر ایک کے پیغام کا خلاصہ وہی تھا جو ان کی تقلید میں

مسجد کے امام نے دہرایا : ہم ہزار سال تک دنیا کے حکمراں رہے ہیں ۔ اور ہم ہی ہیں جس کو دوبارہ دنیا کے سیاسی تخت پر بیٹھنا ہے ۔

بات یہیں تک نہیں رہی ۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ، کچھ لوگوں نے مزید آگے بڑھ کر یہ اعلان کر دیا کہ ——— " ہم محتسب کائنات ہیں ، ہمارا منصب ساری کائنات کا احتساب کرنا ہے "۔ یہ بات بلاشبہ مضحکہ خیز حد تک غلط ہے ۔ کیوں کہ " محتسب کائنات " اگر کوئی منصب ہے تو وہ صرف خالق ومالک کے لیے سزاوار ہے ۔ یہ صرف اللہ عزوجل ہے جو اگر چاہے تو کائنات ارض وسما کا احتساب کرے ۔ اس کے سوا کسی کے پاس نہ اس کی طاقت ہے اور نہ کسی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسا کر سکے ۔

اس بنا پر اس غیر عقلی اور غیر اسلامی نظریہ کے لیے خدا کی کتاب میں کوئی دلیل نہیں مل سکتی تھی ۔ یہاں رہنماؤں کی شاعرانہ تخئیل نے کام کیا ۔ چنانچہ ابلیس کی ایک خیالی مجلس شوریٰ منعقد کی گئی اور اس کی فرضی روداد مرتب کر کے ابلیس کی زبان سے اس " حقیقت " کا اعلان کر دیا گیا کہ :

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

یہ ایک واقعہ ہے کہ مذکورہ " حقیقت " کا ماخذ خدا و رسول کے کلام میں کہیں موجود نہیں ۔ اور اگر کسی صاحب کے نزدیک موجود ہو تو وہ مجھے ایسی آیت یا حدیث لکھ کر بھیج دیں جس میں یہ " حقیقت " بیان کی گئی ہے کہ مسلمان محتسب کائنات ہیں ۔

مزید یہ کہ اس کو خود ابلیس کا کلام بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ فن روایت کے مطابق اس میں یہ نقص ہے کہ ابلیس سے راوی کی ملاقات ثابت نہیں ۔ اس بنا پر دینی معاملہ میں اس کا حوالہ قطعی غیر معتبر ہے ۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود یہ غیر ثابت شدہ کلام ابلیس اتنا پھیلا کہ بڑے بڑے بزرگ اور اکابر اس کو حقیقتِ واقعہ سمجھ کر دہرانے لگے ۔ بلکہ مسلمانوں کے " مقام ومنصب اور ان کی صحیح حیثیت " کو بتانے کے لیے اس کا حوالہ اس طرح دیا جانے لگا گویا اس کو آخری سند کا درجہ حاصل ہو (تعمیر حیات، ۱۰ اگست ۱۹۸۸)

کیسا عجیب ہوگا امت مسلمہ کا وہ اسلامی منصب جو قرآن وحدیث میں تو نہ بتایا گیا ہو، البتہ ابلیس کے مفروضہ کلام سے حیرت انگیز طور پر اس کو برآمد کر لیا جائے ۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان انھیں غلط رہنمائیوں کے وارث ہیں ۔ ان کا ذہن اپنے نام نہاد رہنماؤں کے شاعرانہ اور خطیبانہ اور انشا پردازانہ کلام سے بنا ہے نہ کہ حقیقۃً خدا و رسول کے سچے کلام سے ۔ اس

چیز نے ان کے ذہن و فکر کو لغویت کی حد تک غیر حقیقی بنا دیا ہے جس کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ حاکمانہ نفسیات میں جینے والی ایک قوم بن کر رہ گیے ہیں، جب کہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ داعیانہ نفسیات میں جینے والی قوم بنتے۔

اب پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اس غلط اور غیر حقیقی ذہن کی اصلاح کی جائے۔ جب تک مزاجی اصلاح کا یہ کام نہ ہو، نہ کوئی دوسرا عملی کام صحیح طور پر کیا جا سکتا اور نہ مسلمانوں کے مستقبل کو بدلا جا سکتا۔ کوئی شخص عام پسند نعرہ دے کر وقتی طور پر مسلمانوں کی بھیڑ جمع کر سکتا ہے۔ مگر فکری اصلاح سے پہلے کوئی حقیقی انقلاب اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ بیج کے بغیر درخت کا وجود میں آنا۔ بلاتشبیہ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک تاجر کے اندر اگر داداگیری کا مزاج پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے اس کے اس مزاج کی اصلاح کی جائے گی۔ کیوں کہ تجارت کا کام تاجرانہ مزاج کے ساتھ کیا جا سکتا ہے نہ کہ داداگیری کے مزاج کے ساتھ۔

مسلمان، قرآن کے الفاظ میں، مذکِّر (نصیحت کرنے والے) ہیں۔ وہ دوسری قوموں کے اوپر مُصیطِر (داروغہ) نہیں ہیں (۸۸ : ۲۲) مسلمان اس دنیا میں حاکم نہیں ہیں بلکہ داعی ہیں۔ وہ سلطان نہیں بلکہ سفیر ہیں۔ وہ دنیا کے جج نہیں ہیں بلکہ دنیا کے ناصح ہیں۔ انھیں دو لفظوں پر غور کر کے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآنی ذہن کیا ہے اور مسلم رہنماؤں کا پیدا کردہ ذہن کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی میں مسلمانوں کو بہت سی چیزیں دی گئیں۔ جن میں غلبہ واقتدار بھی شامل تھا۔ مگر وہ خدا کا عطا کردہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا حاصل کردہ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ان چیزوں کی حیثیت انعام کی ہے نہ کہ نشانہ کی۔ مسلمان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کی پیغام رسانی کرے اور اس کے سوا تمام چیزوں کو اللہ کے خانہ میں ڈال دے۔ کیوں کہ وہی جس کو چاہے جو چیز دے اور جس سے چاہے جو چیز چھین لے۔

مسلمانوں نے جب اپنی برتر حیثیت کو کھویا، اس وقت اگر وہ اس کے سبب پر غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ اپنا داعیانہ کردار کھونے کی وجہ سے ان پر یہ افتاد پڑی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی ساری کوشش داعیانہ ذمہ داری کو ادا کرنے میں لگا دیتے اور اس طرح دوبارہ انعام خداوندی کے مستحق قرار پاتے۔ مگر اس کے برعکس یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نگاہیں صرف ظاہری واقعہ پر اٹک کر رہ گئیں۔ انھیں واقعہ نظر آیا مگر سببِ واقعہ انھیں دکھائی نہیں دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان قوموں کے خلاف شکایت

اور احتجاج اور ٹکراؤ میں مشغول ہو گیے جن کو وہ غلط طور پر اپنے المیہ کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ وہ خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انسان کی طرف متوجہ ہو گیے ـــــــ انھیں دو لفظوں میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے المیہ کی پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما ایک انتہائی خطرناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ وہ صرف دو اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں ـــــــ حاکم اور محکوم۔ ان دو کے علاوہ کوئی تیسری اصطلاح انھیں شعوری طور پر معلوم ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اگر "حاکم" کا درجہ نہ دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں "محکوم" کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اسی غلط فکری کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کے دینی منصب کو حاکم کی اصطلاح میں بیان نہ کرے تو وہ فوراً اس پر الزام لگانے لگتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو محکوم اور مغلوب بنا دینا چاہتا ہے۔

مگر یہ سراسر کوتاہ فہمی کی بات ہے۔ ان کے پاس صرف دو پیمانے ہیں، تیسرا زیادہ اہم پیمانہ ان کے پاس موجود ہی نہیں، اور وہ دعوت الی اللہ کا پیمانہ ہے۔ ان لوگوں کو چاہیے کہ حاکم کا تقابل محکوم سے کرنے کے بجائے حاکم کا تقابل داعی سے کریں۔ یہ مشورہ یقیناً لغو ہوگا کہ مسلمان مغلوب اور محکوم بن کر زندگی گزاریں۔ مگر یہ کہنا بھی اتنا ہی بے بنیاد اور لغو ہے کہ مسلمان حاکم اقوام اور محتسب کائنات بن کر رہنے کے لیے پیدا کیے گیے ہیں۔

صحیح بات ان دونوں کے علاوہ ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان داعی ہیں۔ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اللہ کے سچے دین کی طرف لوگوں کو بلائیں۔ یہ ایک خالص خدائی مشن ہے۔ مسلمان اگر ایسا کریں تو آخرت میں وہ خدا کے انعامات کے مستحق ہوں گے۔ اور اگر خدا نے چاہا تو دنیا میں بھی وہ انھیں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا، خواہ وہ سیاسی انعام ہو یا اور کوئی انعام۔

شہید اور شہادت

اسلام کے دور اوّل میں ہزاروں صحابہ نے دین کی راہ میں اپنی جان قربان کی۔ ان میں اکابر صحابہ مثلاً عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم بھی شامل تھے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ "شہید" کے لفظ کو ان کے نام کا جزء بنا دیا جائے جیسا کہ آجکل کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی معلوم شخص نہیں جس نے ان حضرات کو عمر شہید، عثمان شہید اور علی شہید لکھا ہو۔

مگر آج کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آج یہ حال ہے کہ سید اسماعیل شہید اور سید قطب شہید جیسے الفاظ فخر کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ یہ فرق بتاتا ہے کہ موجودہ طریقہ بدعت ہے، وہ سنت رسول اور طریق صحابہ کے مطابق نہیں۔ ذیل کے مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ شہید اور شہادت کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

دور اول میں

"شہادت" کے اصل معنی گواہی کے ہیں۔ قرآن میں شہد کا مادہ تقریباً ڈیڑھ سو مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ ہر جگہ وہ گواہی یا اس کے قریبی مفہوم ہی میں ہے۔ مثلاً واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون (المنافقون) یا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم (حم السجدہ ۲۰) اسی سے شاہد یا شہید ہے، یعنی گواہی دینے والا۔ قرآن میں ہے: انا ارسلناک شاھدا ومبشرا ونذیرا (الاحزاب) بعض مقامات (مثلاً النساء ۷۰) میں مفسرین نے شہداء کے معنی اللہ کی راہ میں جان دینے والے کے لئے ہیں۔ مگر یہ استنباطی طور پر ہے، یہاں بھی یہ لفظ اس مفہوم کے لئے صریح نہیں ہے۔

آجکل عام طور پر "شہید" کا لفظ مقتول کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ مگر یہ عوامی استعمال ہے نہ کہ قرآنی استعمال۔ قرآن میں صراحۃً جہاں بھی اللہ کی راہ میں جان دینے کا ذکر ہے وہاں قتل کا لفظ ہے نہ کہ شہید کا لفظ۔ مثلاً ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات (البقرہ ۱۵۴) یا ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب (النساء ۷۴) اس طرح گویا اللہ کی راہ میں جان دینے والے کے لئے قرآنی لفظ مقتول فی سبیل اللہ ہے۔

بعض احادیث میں یہ لفظ اس دوسرے مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً من سئل اللہَ الشہادۃ بصدقٍ بلّغہ اللہ منازلَ الشہداء وان مات علیٰ فراشہ (مسلم) من قتل فی سبیل اللہ فھو شہید ومن قتل دون مالہ فھو شہید (مسلم) تاہم حدیث میں مقتول فی سبیل اللہ کے لئے شہید کا استعمال اس لفظ کی ایک ضمنی توسیع ہے۔ نہ کہ اس کے اصل معنی کا تعین۔ دور اول میں ہزاروں صحابہ نے دین کی راہ میں اپنی جان قربان کی۔ مگر کسی کے ساتھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ شہید کا لفظ اس کے نام کے ساتھ بولا یا لکھا جانے لگے۔

یہ موجودہ زمانہ کی ایک سیاسی بدعت ہے کہ شہید اور شہادت کا لفظ اصلاً مقتول فی سبیل اللہ کے لئے یا قتال فی سبیل اللہ کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ مزید یہ کہ اس کو اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے اتنا زیادہ گلوریفائی کیا گیا کہ اس کے آگے شہید اور شہادت کا اصل مفہوم بالکل ماند پڑ گیا۔ شہید (بمعنی مقتول) کا لفظ مسلمانوں میں عظیم ترین ہیرو کے ہم معنی بن گیا ہے۔ اب مسلمانوں میں یہ تڑپ تو نہیں رہی کہ وہ قوموں کے درمیان خدا کے دین کے گواہ بن کر کھڑے ہوں۔ البتہ اپنی مدعو اقوام سے بے معنی طور پر لڑائی جھگڑا چھیڑنا اور لڑنا مرنا سب سے بڑا اسلامی عمل قرار پا گیا۔ قرآن کے مطابق شہید وہ ہے جو لوگوں کی ہدایت کے لئے سرگرم ہو۔ مگر عوامی رواج میں شہید کا لفظ ہر اس شخص کے لئے خاص ہو گیا ہے جو لوگوں کو قتل کرنے کے لئے سرگرم ہو، یہاں تک کہ خود قتل ہو جائے۔ یہ بلاشبہ ایک سیاسی بدعت ہے۔ اور اس بدعت کا نقصان معروف بدعتوں سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "شہید" کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے: فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بك علیٰ ھٰؤلاء شہیدا (النساء) یا ویوم نبعث فی کل امۃ شہیدا علیہم من انفسہم وجئنا بك شہیدا علی ھٰؤلاء (النحل ۸۹) یا لیکون الرسول شہیدا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس (الحج ۷۸)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان معنوں میں شہید نہ تھے جن معنوں میں لفظ شہید کا استعمال آج کل کیا جاتا ہے۔ آجکل جب کہا جاتا ہے سید اسماعیل شہید یا سید قطب شہید، تو اس کا مطلب

مقتول ہوتا ہے۔ یعنی دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہو کر وفات پانے والا۔ مگر معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات طبعی موت سے ہوئی تھی۔ کسی دشمن کی تلوار نے آپ کو موت سے دوچار نہیں کیا تھا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس معنی میں شہید تھے۔ آپ گواہ کے معنی میں شہید تھے۔ آپ نے لوگوں کو خدا کے دین سے باخبر کیا، اس لئے آپ خدا کے گواہ (شہید) قرار پائے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب نے شہید کا ترجمہ "بتانے والا" کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہونے کا مطلب آپ کا داعی ہونا ہے۔ یعنی اقوام عالم کو دین خداوندی سے باخبر کرنے والا۔ مگر یہ کام لوگوں کو اتنا عظیم معلوم نہیں ہوتا جتنا کہ شہادت اپنے موجودہ معروف معنی میں بظاہر عظیم ہے۔ کسی شخص کو مبلغ کہیں تو وہ ایک غیر اہم لقب معلوم ہوتا ہے۔ مگر جس شخص کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ لگ جائے وہ غیر معمولی عظمت حاصل کر لیتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے۔ "سید قطب مبلغ" میں وہ عظمت نہیں جو "سید قطب شہید" میں بربنائے استعمال پائی جاتی ہے۔ حسن البنا مبلغ میں وہ بات نہیں جو حسن البنا شہید میں ہے۔

شاہد، مشہود

دعوت کا عمل جو دنیا میں کیا جاتا ہے، آخری اعتبار سے اس کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے لئے گواہ حاصل کئے جائیں۔ قیامت میں جب تمام انسان خدا کے سامنے حاضر کئے جائیں گے، اس وقت تمام انسانوں کا معاملہ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ اگرچہ خدا کو ہر ایک کا ذاتی علم ہے۔ تاہم وہ لوگوں کے اوپر گواہ کھڑا کرے گا جو وہاں بتائیں گے کہ دعوت حق کے مقابلہ میں کس نے کیا رویہ اختیار کیا۔ کس نے مانا اور کس نے نہیں مانا۔

قرآن میں اس عمل کو شہادت کہا گیا ہے اور اس عمل کو انجام دینے والے کے لئے شاہد یا شہید کا لفظ آیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے اوپر گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر گواہ بنے (وكذالك جعلناكم امة وسطا لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا، البقره ۱۴۳) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہو اور تم لوگوں کے اوپر گواہ ہو (ليكون

الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس ، الحج ، ۷۸)

اس طرح تمام انسان اللہ کی نظر میں دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ شہادت دینے والے، اور وہ لوگ جن کے اوپر شہادت دی جائے۔ اول الذکر کو قرآن میں شاہد کہا گیا ہے، اور ثانی الذکر کو مشہود (والسماء ذات البروج ۔ والیوم الموعود وشاہد ومشہود) شاہد اور مشہود کی تفسیر میں ایک حوالہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

قیل الشاہد ھذہ الامۃ والمشہود سائر الامم (صفوۃ التفاسیر)

کہا گیا ہے کہ شاہد سے مراد امت محمدی ہے اور مشہود سے مراد تمام دوسری قومیں۔

شاہد ، مشہود کو دوسرے لفظوں میں داعی ، مدعو کہا جا سکتا ہے۔ سورہ ق میں ہے کہ قیامت میں ہر شخص اس طرح آئے گا کہ اس کے ساتھ ایک سائق (ہنکانے والا) ہوگا۔ اور ایک شہید (گواہی دینے والا) وجاءت کل نفس معہا سائق وشہید ۔ یہاں سائق سے مراد فرشتہ ہے اور شہید سے مراد وہ انسانی داعی جس نے دنیا میں اس کے اوپر حق کی گواہی دی تھی۔

بعض حدیثوں میں "شہید" کا لفظ مقتول فی سبیل اللہ کے معنی میں آیا ہے۔ یہ شہید کے لفظ کا "مفہوم ثانی" نہیں ہے۔ یہ دراصل شہادت کے قرآنی مفہوم کی توسیع ہے۔

قرآن میں شہادت کا لفظ گواہی کے معنی میں آیا ہے۔ اور شہید کا لفظ گواہ کے معنی میں۔ یہ گواہی کس چیز کی ہے۔ یہ خدائی حقیقتوں کی گواہی ہے۔ یہ دنیا کو اس بات سے باخبر کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی منصوبہ کیا ہے۔ اور وہ آخر کار انسانوں سے کیا معاملہ فرمانے والا ہے۔ جو لوگ دنیا میں اس طرح خدا کی گواہی دیں گے، ان کو آخرت میں یہ اعزاز دیا جائے گا کہ وہ آخرت کی خدائی عدالت میں لوگوں کے اوپر سرکاری گواہ کی حیثیت سے کھڑے کئے جائیں گے (ویوم یقوم الاشہاد ، ۴۰ : ۵۱)

خدا کی طرف سے اس کا گواہ بننا ، یہی موجودہ دنیا میں اہل اسلام کا اصل مشن ہے۔ ابتدائی طور پر یہ کام اعلان وتبلیغ کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ تاہم بعض اوقات گواہی کے اس عمل میں اپنی جان بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ جان دینے والا گواہ بھی شہید ہے۔ جس طرح جان نہ دینے والا گواہ شہید ہے۔ تاہم جان دینے والا زیادہ افضل شہید نہیں۔ اگر یہ افضل شہادت ہوتی تو پیغمبر کو ضرور یہ افضلیت دی جاتی ، کیوں کہ قرآن سے ثابت ہے کہ آپ کامل معنی میں شہید تھے

ایک شخص گواہی، بالفاظ دیگر، خدائی حقیقت کے اعلان کے لئے اٹھتا ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اس کو شاعر اور دیوانہ کہتے ہیں۔ وہ اس کو ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ شخص اپنے مقصد سے نہیں ہٹتا۔ وہ دوسروں کی جارحیت کا شکار ہوتا ہے، پھر بھی وہ اپنی بات کو نہیں بدلتا۔ حتیٰ کہ اسی راہ میں اپنی جان کھو بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں جب وہ اپنی جان دیتا ہے تو گویا وہ اپنے مقصد پر یقین کا آخری ثبوت دیتا ہے۔

قومی اور سیاسی لڑائیوں میں لڑ کر ہلاک ہونے کا نام شہید ہونا نہیں ہے۔ یہ بھی شہادت نہیں کہ کوئی شخص حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلائے اور حکمراں اس سے بگڑ کر اس کو سولی پر چڑھا دے یا گولی مار کر ہلاک کر دے تو اس کے معتقدین اس کے نام کے ساتھ شہید کا لقب شامل کر کے اس کو شہید کہنے لگیں۔ شہید در اصل گواہی کے عمل میں اپنے کو قربان کرنے کا نام ہے نہ کہ قومی اور سیاسی لڑائی لڑ کر اس میں اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا۔

شہید دنیوی لقب نہیں

آجکل یہ حال ہے کہ جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو اس کے نام کے ساتھ "مرحوم و مغفور" کا لفظ لگا دیتے ہیں۔ مگر سلف کا یہ طریقہ نہ تھا۔ علماء سلف "غفر اللہ لہ" جیسے الفاظ بولتے تھے۔ غفر اللہ لہ ایک دعائیہ کلمہ ہے۔ یعنی اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔ جب کہ مرحوم و مغفور کے الفاظ ہونے والے واقعہ کو بتاتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص کی رحمت و مغفرت ہو چکی۔ حالانکہ یہ واقعہ صرف اللہ کے علم میں ہے۔ انسان صرف دعا کرنے کا حق رکھتا ہے، وہ اس کو واقعہ کے طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

یہی معاملہ شہید (بمعنی مقتول فی سبیل اللہ) کا بھی ہے۔ دین میں تمام اعمال و درجات کا مدار نیت پر ہے۔ اسی طرح شہید وہ شخص ہے جو باعتبار نیت شہید قرار دئے جانے کا مستحق ہو۔ چونکہ نیت کا حال صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس لئے اللہ ہی کسی کو شہید قرار دینے کا حق رکھتا ہے۔ انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ بطور خود کسی کو شہید کہنے لگے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب جامع صحیح میں ایک باب ان الفاظ کے ساتھ قائم کیا ہے: لا یقول فلان شہید (یہ نہ کہے کہ فلاں شہید ہے) اس کی تشریح حافظ ابن حجر نے اس طرح کی ہے:

لا یقول فلان شہید ای علی سبیل القطع الا ان کان بالوحی (اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص قطعیت کے ساتھ یہ نہ کہے کہ فلاں آدمی شہید ہے، سوا اس کے کہ وہ وحی کی بنیاد پر ہو)

حضرت عثمان بن مظعون رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے تھے۔ ام علاء انصاریہ رض کہتی ہیں کہ عثمان بن مظعون کی وفات ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ کی موجودگی میں میں نے ان کی نعش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے ابو صائب، تم اللہ کے یہاں معزز و مکرم ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: وما یدریك ان اللہ اکرمہ (تمھیں کیا معلوم کہ اللہ نے ان کو معزز و مکرم کیا ہے) ایک شخص بطور دعا کہہ سکتا ہے کہ فلاں آدمی کو اللہ تعالیٰ شہادت کا درجہ نصیب کرے۔ مگر یہ کہنا حد بندگی سے تجاوز کرنا ہے کہ فلاں شخص شہید ہو گیا۔

امام بخاری نے لا یقول فلان شہید کے باب کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ ایک آدمی بظاہر اہل جنت کا عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جہنمی ہوتا ہے۔ اور ایک آدمی بظاہر اہل دوزخ کا عمل کرتا ہے حالاں کہ وہ جنتی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا کام صرف دعا ہے نہ کہ نتیجہ کا اعلان۔

دین میں بدعت

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہمارے اس دین میں نئی بات نکالے جو کہ اس میں نہ ہو تو وہ قابل رد ہے (من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو ردّ، متفق علیہ)

ایک چیز ہے امر دین۔ دوسری چیز ہے وسیلۂ دین۔ جہاں تک امر دین کا تعلق ہے، اس میں کسی بھی قسم کا اضافہ سراسر ممنوع ہے۔ مثلاً کوئی شخص مغرب کی نماز تین کے بجائے چار رکعت پڑھے یا روزہ کو قمری مہینہ کے بجائے شمسی مہینہ میں قائم کرے۔ تو ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس قسم کی ہر چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے (ایّاکم ومحدثات الامور فان کلّ محدثة بدعة وکلّ بدعة ضلالة)

مگر جو چیزیں وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہوں، وہ اس فہرست میں نہیں آتیں۔ مثلاً اونٹ کے بجائے مشینی سواری کے ذریعہ سفر حج۔ منھ سے چیخنے کے بجائے آلۂ مکبر الصوت استعمال کرنا، وغیرہ۔ اس قسم کی تمام چیزیں وسائل کی حیثیت رکھتی ہیں، اور وسائل میں نئی چیزوں

کو اختیار کرنا جائز بھی ہے اور مطلوب بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں بہت سی بدعات رائج ہوگئی ہیں اور بعض جماعتیں ان کے خلاف زبان وقلم کے ذریعہ جہاد کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ خود یہ مجاہدینِ سنت بھی بہت سی بدعات میں مبتلا ہیں، اور وہ جن بدعات میں مبتلا ہیں ان کا نقصان معروف بدعتوں سے کسی طرح کم نہیں۔

انھیں بدعتوں میں سے ایک بدعت وہ ہے جو شہید کے لفظ کے بارہ میں اختیار کی گئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ ہیں جن کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ لکھا جاتا ہے۔ اس استعمال نے ان کی شخصیت کو غیر معمولی عظمت عطا کی ہے۔ مثلاً سید احمد شہید، سید اسماعیل شہید، سید قطب شہید حسن البنا شہید، وغیرہ۔

یہ طریقہ سراسر بدعت ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ دور اول میں موجود نہ تھا۔ دور اول میں ہزاروں صحابہ ہیں جنھوں نے اللہ کی راہ میں جان دی۔ مگر ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ بھی لفظِ شہید کو شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی کی وفات طبیعی موت سے نہیں ہوئی بلکہ ظالموں کی تلوار سے ہوئی۔ مگر صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کو عمر شہید، عثمان شہید اور علی شہید کہا جائے۔ اسی طرح حضرت حسین کو قدیم زمانہ میں کبھی حسین شہید نہیں کہا گیا۔ حضرت یحییٰ بن زکریا پیغمبر تھے۔ اور ان کی وفات ایک ظالم کی تلوا سے ہوئی۔ مگر قرآن میں ان کو یحییٰ شہید نہیں کہا گیا۔ وغیرہ وغیرہ

بدعت سے سنت کا خاتمہ

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی گروہ جب کوئی بدعۃ نکالتا ہے تو اسی کے بقدر سنت اس سے اٹھا لی جاتی ہے۔ ایک سنت کو پکڑے رہنا ایک بدعت نکالنے سے بہتر ہے۔ (ما احدثَ قومٌ بدعةً الا رُفِعَ مثلُها من السنّ فتمسُّكٌ بسنة خيرٌ من احداثِ بدعة (رواہ احمد)

بدعت سرے سے کوئی نئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ دین ہی کی کسی چیز کو نئی حیثیت اور نئی اہمی دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلم گروہ میں جب کوئی بدعت رائج ہوتی ہے تو دین

توازن ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک چیز کا درجہ بڑھانا، دوسری چیز کا درجہ گھٹانے کے ہم معنی بن جاتا ہے حتیٰ کہ اگر بدعت میں زیادہ غلو کیا جائے تو بات توازن ٹوٹنے سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اب ایک بدعت کا آنا ایک سنت کے چلے جانے کے ہم معنیٰ بن جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال شہادت کا مسئلہ بھی ہے "شہید" کے معاملہ میں بدعت کے رواج کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک اہم ترین سنت غیر اہم بن کر مسلمانوں کے درمیان عملاً حذف ہوگئی ہے۔ یہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ دعوت بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی سنت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سرے سے اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اس کی کم ازکم ایک بڑی وجہ "شہید" کا موجودہ تصور ہے۔ شہید (بمعنی مقتول) کے معاملہ کو اتنا زیادہ بڑھایا گیا کہ اب شہید تو لوگوں کو ہیرو معلوم ہوتا ہے۔ مگر داعی انھیں ہیرو دکھائی نہیں دیتا۔ مزید یہ کہ اس مبتدعانہ تصور نے مسلمانوں کو اپنی مدعو اقوام سے ہر جگہ برسر جنگ کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں یہ قومیں اسلام سے متوحش ہو کر دور ہوتی جا رہی ہیں۔ گویا مبتدعانہ شہادت کا عمل جاری کرنے میں حقیقی شہادت کا عمل غائب ہوگیا۔

دین کی اجنبیت

آج جب یہ بات کہی جاتی ہے تو وہ لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ عین وہی صورت حال ہے جس کی پیشین گوئی حدیث میں بہت پہلے کر دی گئی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا، اور وہ دوبارہ اجنبی ہو جائے گا (بدأ الاسلام غريباً وسيعود كما بدأ، مسلم)

اس قول رسول کا مطلب یہ ہے کہ بعد کے لوگ اپنے بگڑے ہوئے دین سے اتنا مانوس ہو جائیں گے، وہ ان سے اتنا زیادہ وابستہ ہو چکے ہوں گے کہ جب اصل دین ان کے سامنے دوبارہ لایا جائے گا تو وہ اس کی اہمیت کو محسوس نہ کر سکیں گے۔ وہ اس کو کچھ اور چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے۔ اپنے بنائے ہوئے دین سے مانوس ہونے کی وجہ سے وہ خدا اور رسول کے دین کو اجنبی محسوس کرنے لگیں گے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت کے برابر بھی جدا ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال پھینکا (من فارق الجماعة شبراً فقد

خلع ربقة الاسلام من عنقه)

یہاں جماعت سے مراد معیاری جماعت ہے، یعنی اصحاب رسول۔ اسی بنا پر صحابہ کرام کو قدوۃ کہا گیا ہے۔ اس سے مراد ہر زمانہ کے مسلمانوں کا گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ الجماعت (صحابہ رسول کے مسلک) سے ذرا بھی ہٹیں گے وہ گمراہی کے گڑھے میں جا گریں گے اور سچے اسلام سے دور ہو جائیں گے۔

قرون مشہود لہا بالخیر میں بے شمار لوگوں کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آئے۔ خدا کے دشمنوں نے ان کو اپنی تلوار کا نشانہ بنایا مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بولنے یا لکھنے والے جب ان کا نام لیں تو ان کو فلاں شہید یا فلاں ابن فلاں شہید کہیں۔ وہ سادہ طور پر ان کا اصل نام لیتے تھے اور بس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت کے مطابق امورِ دین حقیقۃً وہی ہیں جن کی مثالیں دور اول میں قائم ہو چکی ہیں۔ بعد کے لوگوں کو خالص تقلیدی انداز میں ان کی پیروی کرنی ہے۔ ان معاملات میں کسی بھی قسم کا اضافہ یا کمی یقینی طور پر بدعت ہے۔ اور ہر بدعت ضلالت ہے۔ خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، خواہ وہ بظاہر معصوم نظر آئے یا غیر معصوم۔

مثال کے طور پر اسی مذکورہ بدعت کو لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں لفظ "شہید" کو انتہائی حد تک گلوریفائی کیا گیا۔ کسی کے نام کے ساتھ لفظِ شہید کا اضافہ اس کو آخری عظمت دینے کے ہم معنی بن گیا۔ اس تعظیم وتمجید (Glorification) کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نظر میں "لڑنا مرنا" سب سے بڑا کام قرار پایا۔ اب ہر آدمی ٹکراؤ کی باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر آدمی قوم سے قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کیوں کہ نفسیاتی طور پر وہ جانتا ہے کہ موجودہ مسلم سماج میں اس طرح وہ ہیرو کا مقام حاصل کرے گا۔

یہ انداز سراسر بدعت ہے۔ اور اس بدعتی انداز کا نقصان موجودہ مسلمانوں کے حق میں یہ ہوا ہے کہ ان کی نگاہیں اصلی اور ابتدائی کام سے یکسر ہٹ گئی ہیں۔ مسلمانوں کے کرنے کا سب سے پہا اور ضروری کام یہ ہے کہ ایک طرف وہ داخلی اصلاح (Internal reform) کا کام کریں او دوسری اہم ترین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دوسری اقوام کو خدا کے دین کی دعوت دیں۔ مگر موجو

مسلم معاشرہ میں ، مذکورہ بالا اسباب سے خاموش داخلی اصلاح اور پر امن دعوتی جدوجہد ایک غیر اہم کام بن گیا۔ اس کام نے اپنے اندر سے اخباری اہمیت (News value) کھودی ہے۔ اس قسم کا کام کرنے والے کو نہ مسلمانوں کا تعاون ملتا اور نہ ان کا استقبال۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مسلم رہنما داخلی اصلاح اور دعوت کے کام سے بے رغبت ہو گئے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص ٹکراؤ کے میدان کی طرف دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ زبان اور قلم کے ذریعہ دوسری قوموں سے ٹکراؤ کر کے "غازی" بن رہے ہیں۔ اور جو لوگ زیادہ باحوصلہ ہیں وہ سرگرم مقابلہ آرائی کے میدان میں کمالات دکھا کر "شہید" کا ٹائٹل پا رہے ہیں۔

حقیقت حال کا واقعی علم تو صرف آخرت میں سامنے آئے گا مگر ظاہری حالات واضح طور پر اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا طریقہ خدا کے منصوبہ کے مطابق نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ دور اول میں نسبتاً بہت کم اہل ایمان کی قربانی نے عالمی سطح پر انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں ان کے مقابلہ میں قربانی کرنے والوں کی تعداد سو گنا سے بھی زیادہ ہے مگر کسی محدود علاقہ میں بھی آج تک کوئی دینی انقلاب نہیں آیا۔ اگر اسلام کے نام پر لڑنا مرنا ہی وہ واحد چیز ہو جو خدا کی نصرت کو کھینچنے والی ہو تو اب تک خدا کی مدد کو موسلا دھار بارش کی شکل میں پھٹ پڑنا چاہئے تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ "شہیدوں" کے خون سے زمین لالہ زار ہو رہی ہے اور نصرت خداوندی کی بارش کہیں برستی ہوئی نظر نہیں آتی۔

عمل آخرت

جیسا کہ عرض کیا گیا ، قرآن و حدیث میں دعوت الی اللہ کے کام کو شہادت کہا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں پیغمبر اور آپ کی امت کے بارہ میں یہ الفاظ آئے ہیں : لیکون الرسول شہیدا علیکم وتکونوا شہداء علی الناس (تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہو ، اور تم لوگوں کے اوپر گواہ ہو) حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب (اور ان کی نیابت میں پوری امت) سے فرمایا کہ : انتم شہداء اللہ فی الارض (تم لوگ زمین پر اللہ کے گواہ ہو)

دعوت کے کام کو شہادت اس لئے کہا گیا کہ اس کا رشتہ آخرت سے جڑا ہوا ہے۔ دعوت کا کام اپنے آخری اور انتہائی مرحلہ کے اعتبار سے ، آخرت کی گواہی کا کام ہے۔ قرآن سے

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اس لئے بھیجے کہ وہ اہل عالم کو اللہ کی مرضی سے باخبر کردیں۔ تاکہ اللہ کے اوپر بندوں کی حجت باقی نہ رہے۔ یعنی آخرت میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ہم کو حقیقت حال سے باخبر نہیں کیا گیا تھا (النسا، ۱۶۵) یہ لوگ جو دنیا میں خدا کے داعی بنے تھے، وہ آخرت میں خدا کے گواہ بنیں گے۔ وہ اپنے دنیوی تجربہ کے مطابق آخرت کی عدالت میں اپنے زیر دعوت لوگوں کے بارہ میں بیان یا گواہی دیں گے، اور انھیں کے بیان یا گواہی پر لوگوں کے ابدی انجام کا فیصلہ کیا جائے گا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اسی معنی میں "شہید" بنے۔ اب آپ کی پیروی میں آپ کی امت کو بھی اسی معنی میں شہید بننا ہے۔ انھیں دنیا کی قوموں سے لڑنا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی قوموں پر کار دعوت یا عمل شہادت انجام دینا ہے۔ ان کو یہ کرنا ہے کہ دوسری قوموں کو مدعو کا درجہ دے کر ان کے اوپر داعی کا فریضہ ادا کریں۔ مسلمانوں کو لوگوں کی روحوں کو مسخر کرنا ہے نہ کہ ان کے جسموں کو قتل کرنا۔ انھیں لوگوں کو اپنی خیر خواہی کا موضوع بنانا ہے نہ کہ اپنی دشمنی کا موضوع بنانا۔

یہی واحد راستہ ہے جس سے مسلمان دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ اس کو چھوڑ کر دوسرا کام کرنا، یا کسی اور کام میں مشغول ہونا اور اس کے اوپر شہید اور شہادت کا لفظ چسپاں کرنا کسی بھی حال میں مسلمانوں کی فلاح ونجات کا سبب نہیں بن سکتا۔ قرآن وحدیث کے دلائل اگر مسلمانوں کی آنکھ نہ کھولیں تو وہ وقت دور نہیں جب کہ اسرافیل کا صور ان کی آنکھیں کھول دے گا، اگرچہ اس وقت آنکھ کا کھلنا کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

دعوت الی اللہ

انسان کو زمین پر کیوں بسایا گیا ہے اور انسان کے بارے میں خدا کا منصوبہ کیا ہے، اس کا جواب جب ہم قرآن میں تلاش کرتے ہیں تو واضح طور پر اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ انسان کو امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے ـــــــ اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ انسانوں کو آزمائے کہ کون اچھا عمل کرنے والا ہے اور کون برا عمل کرنے والا (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا، الملک ۲)

یہ امتحان کا معاملہ بے حد سنگین معاملہ ہے۔ کیوں کہ اسی امتحان کی بنیاد پر ہر ایک انسان کے لئے ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ معاملہ کی اسی سنگینی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس کا خصوصی انتظام فرمایا کہ انسان کو خدا کے اس منصوبہ (Scheme of things) سے باخبر کیا جاسکے۔ ایک طرف خود انسان کی فطرت اس ڈھنگ پر بنائی گئی کہ وہ مذکورہ واقعہ پر ہر انسان کے لئے ایک اندرونی گواہ بن گئی۔ اسی کے ساتھ وسیع تر کائنات میں اس کا آفاقی اہتمام کیا گیا کہ پوری کائنات خاموش زبان میں اس کا مظاہرہ کرتی رہے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: اسلام اور عصر حاضر، مذہب اور جدید چیلنج)

دوسری طرف یہ غیر معمولی انتظام کیا گیا کہ خدا نے انسانوں میں سے اپنے پیغمبر چنے۔ ان کو فرشتہ کے ذریعہ براہ راست حقیقت کا علم دیا۔ اور انھیں مامور کیا کہ وہ انسان کی قابل فہم زبان میں اعلان کرکے اس کو پوری طرح اس تخلیقی صورت حال سے باخبر کردیں۔ وہ اللہ کی منشا کو اللہ کے بندوں کے لئے ایک معلوم چیز بنا دیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر اٹھے، ان سب کا مشترک مشن یہی تھا۔ ہر ایک کی یہی اصل ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے دور کے انسانوں کو اس منصوبۂ الٰہی سے باخبر کردے تاکہ آخرت میں کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ اس کو حقیقتِ حال کا علم نہ تھا:

رسلاً مبشرین ومنذرین لئلاً یکون للنّاس علی اللہ حُجّة بعد الرسل (النساء ۱۶۵)

اللہ نے رسولوں کو خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔

ٹائم بم

ایک عمارت کے بارے میں آپ کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ وہاں ٹائم بم رکھا ہوا ہے۔ اور وہ صرف پانچ منٹ کے بعد پھٹنے والا ہے۔ اس وقت آپ کیا کریں گے۔ آپ کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ عمارت کے اندر جو لوگ ہیں، انھیں اس سنگین حقیقت سے باخبر کریں۔ اس وقت ہر دوسری بات آپ کے لئے غیر اھم بن جائے گی، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہو۔ یہی معاملہ موجودہ دنیا کا ہے۔ موجودہ دنیا پوری کی پوری ایک خدائی ٹائم بم پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہ ٹائم بم قیامت ہے۔ قیامت بلاشبہ سخت ترین لمحہ ہے جو انسان کے اوپر آنے والا ہے۔ اس کا آنا یقینی ہے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ مگر اس کے وقت کا حقیقی علم صرف خدا کو ہے۔

قیامت کا یہ معاملہ اس کو انسان کے لئے سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ سنگین مسئلہ بنا دیتا ہے۔ اس کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان اس کے بارے میں سب سے زیادہ جانے، کیوں کہ اس سے بڑا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اس کے بارے میں سب سے زیادہ چوکنّا رہے، کیوں کہ وہ کسی بھی لمحہ ایک عظیم بھونچال کی صورت میں اس کے اوپر پھٹ پڑے گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں داعی کو منذر اور دعوت کو انذار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے ہوشیار کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آتا ہے کہ جب آپ لوگوں کے سامنے خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے اور اس آنے والے لمحہ کا ذکر فرماتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے آپ لوگوں کو کسی اچانک ہونے والے فوجی حملہ سے ڈرا رہے ہیں (کانہ منذر جیش)

اس معاملہ میں آپ کا طرز کلام کیا ہوتا تھا، اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہوتا ہے۔ جو آپ نے قم فانذر (المدثر ۲) کا قرآنی حکم ملنے کے بعد مکہ کے قریب صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر فرمائی تھی:

قال البخاری حدثنا محمد سلام حدثنا ابو معاویة حدثنا الاعمش عن عمرو بن مرة عن سعید بن جبیر عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیه وسلم خرج الی البطحاء فصعد الجبل فنادی یا صباحاه۔ فاجتمعت الیه قریش فقال: أرأیتم ان حدثتکم ان العدو مصبحکم او ممسیکم اکنتم تصدقونی۔ قالوا نعم۔ قال فانی نذیرلکم

بین یدی عذاب شدید۔ فقام ابولہب ینفض یدیہ وھو یقول۔ تبالک سائر الیوم آلھذا جمعتنا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر وادی بطحا کی طرف گئے۔ پہاڑی کے اوپر چڑھ کر آپ نے پکارا کہ ہائے صبح کا خطرہ۔ پس قریش آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے کہا کہ اگر میں بتاؤں کہ دشمن تمہارے اوپر صبح یا شام کو ٹوٹ پڑنے والا ہے تو کیا تم مانو گے۔ لوگوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا، میں تم کو آنے والے ایک سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ ابولہب یہ سن کر ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھا، وہ کہہ رہا تھا: سارے دن تمہارا برا ہو۔ کیا تم نے اسی کے لئے ہم کو بلایا تھا۔

یہ مکی دور کی تقریر ہے۔ مگر مدنی دور میں پہنچ کر بھی آپ کا طرز خطاب یہی تھا۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت (الجزء الثانی، صفحہ ۱۱۸) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پہلا خطبہ نقل کیا ہے جو آپ نے مدینہ پہنچ کر لوگوں کے سامنے دیا تھا۔ اس پورے خطبہ میں آخرت سے انذار کا وہی انداز ہے جو آپ نے مکہ میں اختیار فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ جس انسان کو اس کا ادراک ہو جائے، اس کو دوسرے تمام مسائل بالکل ہیچ معلوم ہوں گے۔ ہر دوسرا مسئلہ خواہ بظاہر وہ کتنا ہی بڑا دکھائی دیتا ہو، اس کی نظر میں بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔ یہی پیغمبر کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ آخرت کو براہ راست دیکھ رہا ہوتا ہے، اس لئے آخرت اس کی نظر میں وہ سب سے بڑی چیز بن جاتی ہے جس سے وہ لوگوں کو آگاہ کرے۔ اسی انتباہ سے اس کے مشن کا آغاز ہوتا ہے اور اسی پر اس کا اختتام بھی۔

ختم نبوت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی تھے۔ آپ کے بعد دین ہمیشہ کے لئے محفوظ اور مکمل ہو چکا ہے، اب قیامت تک کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اسی عقیدہ کا نام ختم نبوت ہے۔

ختم نبوت، سادہ طور پر، صرف فہرست نبوت کے ختم ہونے کا نام نہیں۔ یہ دراصل پیغمبرانہ ذمہ داری کی نئی نوعیت کو بتاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس خدائی پیغام رسانی کا کام پہلے پیغمبر کی سطح پر ہوتا تھا، اب اس پیغام رسانی کا تسلسل امت پیغمبر کی سطح پر جاری ہے۔ ختم نبوت کے عقیدہ کا اصل مطلب امت محمدی کے اعتبار سے یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد وہ مقام نبوت پر ہے۔

اب اس کو وہ دعوتی کام انجام دینا ہے جس کے لئے اس سے پہلے پیغمبر آیا کرتے تھے۔

موجودہ مسلمانوں نے ختم نبوت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ کوئی دیوانہ آدمی اگر نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو فوراً اس سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو جائیں یا کم از کم اس کے ساتھ مناظرہ بازی کا اکھاڑا قائم کر دیں۔ مگر اس قسم کی بحثوں اور جھگڑوں کا ختم نبوت کے عقیدہ سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں پر اصلاً جو ذمہ داری ڈالتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام اقوام کو اپنا مدعو سمجھیں۔ اور ان کو دین محمدی سے باخبر کرنے کے لئے اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں۔ کسی شخص یا گروہ کو منکر ختم نبوت قرار دے کر اس سے لڑنا کسی بھی درجہ میں وہ کام نہیں جو ختم نبوت کے عقیدہ کی رو سے مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں سے ہر قسم کی لڑائی ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے، تاکہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل فضا قائم ہو اور ان کو خدا کے دین رحمت کا مخاطب بنایا جا سکے۔ دنیا کی نظر میں ان کی تصویر یہ ہونی چاہئے کہ وہ دین رحمت کے حامل ہیں، نہ یہ کہ وہ ایک جھگڑالو اور دہشت پسند قوم ہیں۔ اس تصویر کو برقرار رکھنے کے لئے اگر انھیں اپنے جائز حقوق کی قربانی دینی پڑے تو اس سے بھی انھیں گریز نہیں کرنا چاہئے۔

ایک سوال

رسول اور اصحاب رسول کے حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں لمبے عرصے تک خالص انذار و تبشیر کے انداز میں کام کیا۔ مگر بعد کے دور میں وہ جنگ اور فتح کے میدان میں مشغول نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کیا مطابقت ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں دوروں میں آغاز اور تکمیل کی نسبت ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ دونوں دوروں میں حقیقت اور اضافت کی نسبت ہے۔ یعنی اصل منصب رسالت کے اعتبار سے آپ کا حقیقی کام وہی تھا جو آپ نے منذر اور مبشر کی حیثیت سے انجام دیا۔ اور دوسرا کام جو رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ انجام پایا وہ آپ کی حیثیت رسالت کا اضافی جزء تھا۔ یع وہ دوسرے اسباب کے تحت آپ کے کار رسالت میں شامل ہوا نہ کہ نفس منصب رسالت

حیثیت سے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مشن وہی تھا جو تمام دوسرے پیغمبروں کا مشن تھا۔ آپ کو بھی وہی دین توحید دیا گیا جو دوسرے تمام پیغمبروں کو دیا گیا تھا (الشوریٰ ۱۳) اس دین کا اعلان وابلاغ وہ اصل منصبی کام تھا جس پر آپ بحیثیت رسول مامور کیے گئے تھے۔ قرآن میں ایک مقام پر مختلف پیغمبروں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، پس تم بھی انھیں کے طریقے کی پیروی کرو (فبھداھم اقتدہ، الانعام ۹۱)

جب تمام پیغمبر (بشمول پیغمبر اسلام) سب کا مشن ایک تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مشن بھی وہی قرار دیا جائے گا جو تمام پیغمبروں کے یہاں یکساں اور مشترک طور پر پایا جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی ایسی مختلف چیز ہے جو آپ کے یہاں ملتی ہے اور دوسروں کے یہاں وہ موجود نہیں، تو یہ چیز آپ کی حیثیت رسالت کا اضافی جزء قرار پائے گی نہ کہ آپ کی حیثیت رسالت کا حقیقی جزء۔

"جنگ وقتال" کا معاملہ اسی اضافی جزء سے تعلق رکھتا ہے جو قرآن کے مطابق "فتنہ" کے خاتمہ کے لئے عمل میں لایا گیا۔ یہ کوئی مستقل عمل نہ تھا، وہ ایک وقتی عمل تھا جس کا جواز خود فریق ثانی نے اپنی جارحیت کے ذریعہ فراہم کیا، اور جو اللہ کی خصوصی مدد سے صحابہ وتابعین کے زمانہ میں اپنے تکمیلی مرحلہ تک پہنچ گیا۔

فتنہ کا استیصال

قرآن میں دو مقام پر معمولی فرق کے ساتھ یہ آیت آئی ہے: وقاتلوھم حتّٰی لاتکون فتنۃ ویکون الدّین کلّہ للہ (اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے زمانہ میں جو جنگیں پیش آئیں، ان کی حیثیت کیا تھی، وہ حقیقۃً جنگ نہیں تھی بلکہ اس کی حیثیت ایک قسم کی فوجی کارروائی (Military operation) کی تھی جس کا مقصد خدا کی دنیا سے "فتنہ" کو ختم کرنا تھا۔ یہ فتنہ ختم ہو گیا، اس لئے اب اس قسم کی جنگ یا فوجی کارروائی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی تشریح سے واضح ہوتا ہے:

عن نافع عن ابن عمر قال اتاه رجلان في فتنة ابن الزبير فقالا۔ ان الناس ضيعوا وانت ابن عمر وصاحب النبيّ صلى الله عليه وسلم فما يمنعك ان تخرج فقال يمنعني ان الله حرم دم اخي۔ قالا، الم يقل الله (وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة) فقال، قاتلنا حتى لم تكن فتنة وكان الدين لله وانتم تريدون ان تقاتلوا حتى تكون فتنة وحتى يكون الدين لغير الله (تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۲۲۷)

نافع عبداللہ بن عمر کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے پاس ابن زبیر کے فتنہ کے زمانہ میں دو آدمی آئے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ ضائع ہو رہے ہیں۔ اور آپ عمر کے صاحبزادے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ پھر آپ کو کیا چیز روک رہی ہے کہ آپ نکلیں۔ عبداللہ بن عمر نے کہا مجھے یہ چیز روک رہی ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کے خون کو حرام قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ عبداللہ بن عمر نے کہا۔ ہم لڑے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ لڑو یہاں تک کہ فتنہ دوبارہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے۔

فتنہ کے لفظی معنی وہی ہیں جس کو انگریزی میں Persecution کہتے ہیں۔ اس سے مراد در اصل وہ سیاسی جبر ہے جو قدیم طرز کی بادشاہت کے تحت ساری دنیا میں قائم تھا۔ یہ مطلق بادشاہت (Empirical absolutism) کا دور تھا۔ بادشاہوں کے لئے خدائی اختیارات فرض کر لئے گئے تھے۔ بادشاہوں کو حق تھا کہ وہ جو چاہیں کریں۔ ان سے ان کے عمل کی باز پرس نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانہ یہ سیاسی عقیدہ بن گیا تھا کہ بادشاہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے، وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا:

The king can do no wrong.

اس اصول نے بادشاہ کو اپنی رعایا پر مطلق اختیار دے دیا تھا۔ اس کی وجہ سے سماج میں دو بن گئے تھے۔ ایک بادشاہوں کا اور دوسرا رعایا کا۔ اس جابرانہ نظام کے تحت جو برائیاں پیدا ہ ان میں سنگین ترین برائی یہ تھی کہ دین توحید کی تبلیغ ناممکن ہو گئی تھی۔ کیوں کہ توحید کا مطلب یہ ایک خدا کے سوا سارے لوگ برابر ہیں۔ کسی کو کسی کے اوپر مطلق اختیار حاصل نہیں۔ توحید کے ا

میں قدیم شاہی نظام کی نفی ہوتی تھی۔ اس لئے وہ لوگ توحید کے داعیوں کو اپنی سیاسی طاقت سے کچل دیتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو توحید کی دعوت کے ساتھ ایک مزید مشن یہ سپرد کیا گیا کہ وہ سیاسی جبر (قدیم طرز کی بادشاہت) کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں تاکہ دعوت توحید کی راہ کی رکاوٹیں ختم ہو جائیں اور دنیا میں توحید اور انسانی برادری کا دور لانا ممکن ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دو عظیم ترین شہنشاہیتیں پائی جاتی تھیں۔ ایک ایرانی (ساسانی) سلطنت، اور دوسرے رومی (بازنطینی) سلطنت۔ یہ دونوں سلطنتیں قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر قابض تھیں اور قدیم طرز کی جابرانہ بادشاہت کی طاقتور نمائندہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کا باقی رہنا قدیم بادشاہت کے باقی رہنے کے ہم معنی تھا، اور ان کا ٹوٹنا قدیم بادشاہت کے ٹوٹنے کے ہم معنی۔ رسول اور اصحاب رسول نے اپنی غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ ان شاہی نظاموں کو توڑ دیا۔ ان کا یہ عمل معروف معنوں میں ملک گیری کا عمل نہ تھا، بلکہ وہ ایک قسم کا خدائی آپریشن تھا جو بہترین اور موزوں ترین افراد کے ذریعہ کیا گیا۔ آزادی اور مساوات اور جمہوریت کا موجودہ دور تمام تر اسی انقلاب کی پیداوار ہے۔ صحابہ کرام نے اگر قدیم نظام جبر کو توڑا نہ ہوتا تو انسان پر موجودہ آزادی کا دور کبھی نہ آتا۔

موجودہ زمانہ کے مغربی مورخین نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔ خاص طور پر فرانسیسی مورخ ہنری پیرین (Henri Pirenne) نے اس کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ اس کی تحقیقات نے اس نقطۂ نظر کو ایک مستقل تاریخی مکتب فکر کی حیثیت دے دی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی دو کتابیں قابل مطالعہ ہیں: تاریخ یوروپ (History of Europe) اور محمد اور شارلیمان (Mohammad and Charlemagne) اول الذکر کتاب میں اس نے یہ تاریخی نظریہ پیش کیا ہے کہ قدیم اور جدید دنیا کے درمیان بنیادی انفصال (Essential break) درحقیقت عرب فتوحات کے ذریعہ پیش آیا (EB-13/155) اس سلسلہ میں اس نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام نے زمین کی صورت کو بدل دیا۔ تاریخ کا روایتی نظام بالکل توڑ پھوڑ ڈالا گیا:

> Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown (p.46).

حضرت عبد اللہ بن عمر کا جو قول اوپر نقل کیا گیا، وہ اس معاملہ کی نہایت عمدہ تشریح کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیت فتنہ کا تعلق فتنۂ مسلم سے نہ تھا بلکہ فتنۂ مشرک تھا۔ اس کا مقصد قدیم سیاسی جبر کے نظام کو ختم کرنا تھا، اور وہ اللہ کی مدد سے ختم ہوگیا۔ اس کے بعد دعوت توحید یا اقامت حریت کی راہ میں وہ رکاوٹ باقی نہ رہی جو قدیم نظام کے تحت ساری دنیا میں پائی جاتی تھی۔

اب اگر اس کو مسلم حکمرانوں تک وسیع کیا جائے اور مسلم حکمرانوں کے بگاڑ پر فتنہ کا اطلاق کرکے ان کے خلاف بغاوت کی جائے یا ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلائی جائے تو یہ دوبارہ ایک نئے فتنہ کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی بن جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ حکمراں غیر ضروری طور پر اسلامی دعوت کو اپنا سیاسی حریف سمجھ لیں گے اور اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے اسلامی دعوت کو کچلنا شروع کر دیں گے۔ اس طرح جو فتنہ ختم ہو چکا تھا، غیر ضروری طور پر از سر نو اس کا آغاز ہو جائے گا۔

تاریخ کا پردہ

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مشن وہی تھا جو تمام نبیوں کا تھا، یعنی دعوت الی اللہ۔ دعوت کو اتمام حجت تک پہنچا دینے کے بعد آپ کے اس مشن کی تکمیل ہوگئی جو پیغمبر کی حیثیت سے آپ کے اوپر عائد ہوتا تھا۔ اس کے بعد جنگ اور فتوحات کی صورت میں جو واقعہ پیش آیا وہ آپ کے مشن کا اضافی جزء (Relative part) تھا نہ کہ حقیقی جزء (Real part)

یہ دوسرا حصہ ہجرت مدینہ سے شروع ہوا۔ اور اس کے بعد صحابۂ کرام کے دور آخر تک جاری رہا۔ آپ کے مشن کے اس جزء کے تحت اولاً عرب اور اس کے بعد ایشیا اور افریقہ کے بیشتر حصے فتح ہوئے۔ ایران اور روم کی سلطنتیں ختم ہوگئیں۔ یہ سیاسی اور جنگی واقعات بعد کے لوگوں کے ذہن پر اتنا زیادہ چھائے کہ وہی ان کے فکر پر غالب آگئے، حتی کہ وہ بھول گئے کہ یہ عمل منصب رسالت کا اضافی پہلو تھا، وہ منصب رسالت کا حقیقی پہلو نہ تھا۔

چنانچہ بعد کے دور میں جو اسلامی لٹریچر تیار ہوا وہ تقریباً سب کا سب اسی واقعہ سے متاثر نظر آتا ہے۔ مثلاً حدیث کو لیجئے۔ حدیث کی تدوین وترتیب زیادہ تر تبع تابعین کے زمانے

میں انجام پائی۔ آپ حدیث کی جس کتاب کو بھی دیکھیں، اس میں کتاب الجہاد جیسے ابواب لازمی طور پر نظر آئیں گے۔ مگر حدیث کی کوئی بھی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں جس میں دعوت و تبلیغ کا باب قائم کیا گیا ہو اور اس کے تحت دعوت الی اللہ سے متعلق حدیثیں یکجا کی گئی ہوں۔

اسی طرح فقہ کی صورت میں اسلامی قانون کا عظیم الشان ذخیرہ تیار ہوا۔ مگر دوبارہ ہم دیکھتے ہیں کہ فقہ کی کتابوں میں جہاد اور اس سے متعلق ابواب تو بالالتزام پائے جاتے ہیں مگر دعوتِ حق اور انذار و تبشیر کے ابواب کسی فقہ کی کتاب میں موجود نہیں۔

اسی طرح دین کی تشریح اور اس کی حکمتوں کے بیان پر پچھلی صدیوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً عزالدین بن عبدالسلام، الغزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور ان کے جیسے دوسرے لوگوں نے ہزاروں کتابیں لکھیں مگر اسلام کے وسیع اور قیمتی کتب خانہ میں کوئی بھی قابل ذکر کتاب نہیں جو حقیقی معنی میں دعوت الی اللہ کے موضوع پر لکھی گئی ہو۔ حتی کہ دور آخر میں علم اسرار شریعت پر لکھی جانے والی جامع ترین کتاب حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ دہلوی) میں ہر قسم کے ابواب موجود ہیں، مگر اس میں دعوت الی اللہ کا باب موجود نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پچھلی صدیوں میں نفس دعوتِ اسلام معدوم ہوگئی ہو۔ جو چیز معدوم ہوئی وہ شعورِ دعوت ہے نہ کہ عملِ دعوت۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے دین کی دعوت اور اس کی اشاعت کا کام عملی طور پر پچھلے پورے چودہ سو سال میں کسی ایک دن کے وقفہ کے بغیر مسلسل جاری رہا ہے۔ مگر یہ زیادہ تر اسلام کی اپنی طاقت کے زور پر اپنے آپ ہوتا رہا ہے نہ کہ کسی دعوتی شعور یا تبلیغی منصوبہ بندی کے تحت۔ پچھلی صدیوں میں دعوتی شعور، اپنے حقیقی معنی کے اعتبار سے ضرور غیر موجود رہا ہے۔ مگر دعوت کا عمل بطور واقعہ پوری تاریخ میں کبھی ایک دن کے لئے بھی غیر موجود نہیں رہا۔

میری معلومات کے مطابق، دور صحابہ کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ - ۶۲ھ) آخری شخص تھے جن کے یہاں دعوت کا شعور اپنی حقیقی اور کامل صورت میں پایا جاتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے عامل نے شکایت کی کہ لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اس بنا پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ خراج کی رقم تشویشناک حد تک گھٹ جائے اور بیت المال کا خزانہ خالی ہو جائے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ سن کر فرمایا: ویحك ان محمداً بُعث هادياً

ولم يبعث جابيا (تمہارا رہبر، محمد ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، وہ ٹیکس وصول کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے)

حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس قول میں جو شعور دعوت پایا جاتا ہے، اس کا اعادہ اسلام کی بعد کی تاریخ میں دوبارہ نہ ہو سکا۔

راقم الحروف نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان لال قلعہ کی دیواریں حائل ہیں۔ یہ بلاشبہ موجودہ زمانہ کی تلخ ترین حقیقت ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلام اور موجودہ مسلمانوں کے درمیان فتوحات اور حکمرانی کی تاریخ ایک آڑ بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اس آڑ کی وجہ سے موجودہ زمانہ کے مسلمان اسلام کو اس کے اصل روپ میں دیکھ نہیں پاتے۔ اور اسلام کا جو سب سے زیادہ اہم پہلو مسلمانوں کی نظر سے اوجھل ہوا ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ اسلام کی اصل تسخیری قوت بلاشبہ دعوت ہے۔ دعوت ہی وہ اصل عمل ہے جس پر فتح و غلبہ کی وہ تمام نصرتیں نازل ہوتی ہیں جن کا قرآن میں واضح طور پر وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر اسی سب سے بڑی بات کو موجودہ مسلمان سب سے زیادہ بھولے ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی غفلت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ دوسرے دوسرے کام کرتے ہیں اور ان کو "دعوت" کا نام دیدیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا یہ فعل انھیں مائنس مارکنگ (Minus marking) کا مستحق بناتا ہے نہ کہ انعام و تحسین کا۔

دوبارہ دریافت کی ضرورت

میں نے ایک عربی جریدہ میں ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا: الدعوة الى الله۔ اس مضمون میں دعوت کے بارہ میں چوٹی کے عرب علماء کے خیالات ظاہر کئے گئے تھے۔ مضمون نگار نے شروع میں لکھا تھا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ دعوت کا نشانہ مقرر کیا جائے۔ دعوت کا نشانہ کیا ہے۔ کیا اس سے مراد فرد کی اصلاح ہے۔ کیا اس سے مراد معاشرہ اور خاندان کی اصلاح ہے۔ کیا اس کا مطلب حکومت کی اصلاح ہے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی ہدایت پر لایا جائے (فما غايات الدعوة۔ هل هي اصلاح الفرد۔ او اصلاح المجتمع والاسرة۔ او اصلاح الدولة۔ او هداية المسلمين الى الاسلام الصحيح۔ او هداية غير المسلمين الى الاسلام)

ان ابتدائی سطروں کے بعد جو اصل گفتگو شروع ہوئی وہ ساری کی ساری اسلام اور مسلمانوں کے دشمن (اعداء الاسلام والمسلمین) پر چلتی رہی، یہاں تک کہ سات صفحات کا طویل مضمون ختم ہوگیا اور کسی عالم نے یہ نہیں بتایا کہ دعوت الی اللہ کا لفظ اصلاً جس عمل کے لئے قرآن میں استعمال ہوا ہے وہ دیگر اقوام میں اسلام کی اشاعت ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اگرچہ دعوت کا لفظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں مگر وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ "دعوت" سے فی الواقع کون سا عمل مراد ہے۔ ان کی یہ بے خبری اتنی ہمہ گیر ہے کہ اصاغر تو در کنار ان کے اکابر بھی اس سے ناواقف ہیں۔ ایسی حالت میں یہ ان کے لئے ازسرنو دریافت کا معاملہ بن گیا ہے۔ ان کے لئے یہ ایک بھولی ہوئی بات ہے جس کو انھیں دوبارہ اپنی یادوں کی گرفت میں لے آنا ہے۔

بلاشبہ آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے شعور کو بیدار کیا جائے اور انھیں فکری اعتبار سے اس قابل بنایا جائے کہ وہ دعوت کو ازسرنو دریافت (Rediscover) کرسکیں۔ یہی وقت کا سب سے بڑا تقاضا ہے، دنیا کے اعتبار سے بھی، اور یقینی طور پر آخرت کے اعتبار سے بھی۔

مہاتما گاندھی کی مثال

اس معاملہ کی وضاحت کے لئے میں مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ - ۱۹۴۸) کی مثال دوں گا۔ ہندستان میں تحریک آزادی کا آغاز ۱۸۵۷ میں ہوا جو تقریباً ۱۹۱۹ تک جاری رہا۔ اس پہلے مرحلے میں آزادی کے حصول کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ تشدد کا طریقہ تھا۔ تشدد کے طریقے میں طاقت فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اور اس وقت کے ہندستان میں طاقت تمام تر برطانیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے آزادی کو بذریعہ تشدد حاصل کرنے کی کوشش مکمل طور پر ناکام رہی۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی سیاست کے منظر پر نمایاں ہوئے۔ انھوں نے پورے معاملہ کو الٹ دیا۔ انھوں نے تشدد کے بجائے عدم تشدد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کا نعرہ دیا۔ یہ طریقہ وہی تھا جس کو موجودہ زمانہ کے سیاسی مورخین عمل بغیر تشدد (Nonviolent activism) کا نام دیتے ہیں۔

عمل بغیر تشدد کا نظریہ اس سے پہلے مختلف لوگ پیش کرچکے تھے۔ مثلاً ہنری تھارو

(Henry Thoreau) اور جان رسکن (John Ruskin) اور ٹالسٹائے (Tolstoy) اور جارجز سوریل (Georges Sorel) وغیرہ۔ تاہم اس نظریہ کو مہاتما گاندھی نے جتنے بڑے پیمانے پر عملاً استعمال کیا وہ ابھی تک کوئی دوسرا استعمال نہیں کرسکا تھا۔

غیر تشدد پسند طریقہ کو مؤثر بنانے کے لئے مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی (Civil Disobedience) اور عدم تعاون (Non cooperation) کی اصطلاح ایجاد کی۔ اس طریقہ کی کامیابی اس میں تھی کہ ہتھیار کی طاقت کی جگہ عوام کی طاقت کو استعمال کیا جائے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے یہ کیا کہ عوام کو ان کے مقامات سے نکال کر سڑکوں پر لے آئے۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔ قانون ساز اداروں کا بائیکاٹ، عدالتوں کا بائیکاٹ، دفتروں کا بائیکاٹ، حتی کہ اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ اس "پرامن تشدد" میں یہ بھی شامل تھا کہ سرکاری ٹیکس نہ دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ میں نمک کا ٹیکس نہ دینے کے جرم میں ساٹھ ہزار ہندستانی گرفتار ہوئے۔ ان چیزوں کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۷ تک جاری رہا۔

اس کے نتیجہ میں برطانیہ کے خلاف جو عوامی طاقت منظم ہوئی اس نے برطانی حکومت کی جڑیں ہلا دیں۔ یہاں تک کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۷ میں انگریز کو ہندستان چھوڑ دینا پڑا۔ اس طرح مہاتما گاندھی کی تدبیر حصول آزادی کے لئے تو کار آمد ثابت ہوئی مگر اس کا دوسرا نتیجہ منفی تھا۔ اس کی وجہ سے ملک میں قانون شکنی کی روایت قائم ہوئی۔ ڈسپلن کو توڑنا ایک مقدس قومی عمل قرار پایا۔ تعمیر کے بجائے تنقید کر شخص کے لئے نمایاں ہونے کا آسان ذریعہ بن گیا۔ اتھارٹی کی تائید کمتر چیز قرار پائی اور اتھار کو چیلنج کرنا ایک ایسا ہیروانہ عمل بن گیا جو فی الفور آدمی کو اخبارات کے صفحہ میں نمایاں کردے۔

ان چیزوں نے سابقہ روایات کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیا۔ وہ بھول گئے کہ سول نافر ایک وقتی تدبیر تھی نہ کہ مستقل اصول۔ اب ضرورت تھی کہ آزادی کے بعد ڈسپلن اور قانون کے اح کی روایت کو ازسرنو دریافت (Rediscover) کیا جائے۔ جو چیز تحت شعور میں چلی گئی ہے، ا دوبارہ شعور کی سطح پر زندہ کیا جائے۔ مگر یہ کام نہ ہوسکا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستان کی آزاد بے معنی ہو کر رہ گئی۔

جہاں تک میرا اندازہ ہے، ہندستانی لیڈروں میں صرف مہاتما گاندھی ایک ایسے شخص

اس معاملے کی اہمیت کو شعوری طور پر جانتے تھے۔ چنانچہ آزادی کے فوراً بعد انھوں نے اس کی کوشش شروع کر دی۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کو سیاسی پارٹی کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے اور "جن کانگریس" کے نام سے ایک خالص تعمیری اور غیر سیاسی پارٹی بنائی جائے۔ مگر قانون شکنی کے سیلاب کو دوبارہ وہ قانونی احترام کے رخ پر نہ موڑ سکے۔ یہاں تک کہ آزادی کے صرف ساڑھے پانچ مہینہ بعد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے "نمک" کے معاملے میں قانون کو توڑا تھا، یہ عمل آخر کار "جان" کے معاملہ میں قانون کو توڑنے تک پہنچ گیا۔

مہاتما گاندھی کا خاتمہ ہندستان کے لئے نئی امید کا بھی خاتمہ تھا۔ اس کے بعد ہندستان ان قدروں کو دوبارہ دریافت (Rediscover) نہ کر سکا جس کو اس نے عدم تشدد کی پرشور تحریک کے درمیان کھو دیا تھا۔ اب پورا ملک انارکی کے راستہ پر چل پڑا۔ بظاہر اس کی امید نہیں کہ آزادی کے پچاس سال بعد بھی اس کے رخ کو موڑنا ممکن ہو سکے گا۔

جاپان کی مثال

وہ دور جس کو جاپان کی تاریخ میں میجی کی بحالی (Meji Restoration)) کا دور کہا جاتا ہے، وہ ۱۹ویں صدی کے وسط میں شروع ہوا۔ شہنشاہ میجی نہایت ترقی پسند آدمی تھا۔ اس نے نئی چیزوں کو فروغ دینے کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس دور میں جاپان میں تیزی سے مغربی تعلیم اور مغربی صنعت کا رواج ہوا۔ انگریزی اور دوسری یورپی زبانیں پڑھی جانے لگیں۔ جاپانی نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم کے لئے یوروپ اور امریکہ گئے۔ (6/370)

مگر ۱۹ویں صدی کے آخر میں ایک اور انقلاب آیا۔ ۱۸۷۷ میں بغاوت ہوئی جس کو جاپان کی تاریخ میں (Satsuma Rebellion) کہا جاتا ہے۔ اس انقلاب کے بعد ایک نیا ذہن پیدا ہوا۔ مغربی تہذیب کو جاپانی قومیت کے لئے خطرہ بتایا جانے لگا۔

اس طرح جاپان میں ایک نیا عسکری دور شروع ہوا۔ جرمنی کے زیر اثر فاشزم (Fascism) کی تحریک پھیلی۔ ۲۶ فروری ۱۹۳۶ کو فوج نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ معتدل دانشور اور مفکر قتل کئے جانے لگے۔ مغرب کے لبرل خیالات کے بارے میں یہ کہا جانے لگا کہ اس سے جاپان کی روایتی فوجی اسپرٹ (Military spirit) ختم ہو جائے گی۔ یہ سمجھا جانے لگا کہ جاپان میں عسکریت پیدا کرنا اس کے نیشنل آئیڈیل

(National ideal) کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ جاپانی یہ خواب دیکھنے لگے کہ وہ اپنے اقتدار کو ”پانچوں براعظموں“ تک وسیع کرسکیں (7/188) ۔

یہی عسکری مزاج تھا جس کے تحت جاپانی دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں (Axis Powers) کے ساتھ مل کر اتحادی طاقتوں (Allied Powers) کے خلاف لڑ گئے۔ اس جنگ میں انھوں نے جنون کی حد تک فوجی جوش کا مظاہرہ کیا جس کی ایک مثال جاپان کے خودکشی کرنے والے جہاز تھے جن کو کامی کاز جہاز (Kamikaze Planes) کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بمبار جہاز تھے جن کو لے کر ان کا پائلٹ اپنے نشانہ پر گر پڑتا تھا۔ اور غیر معمولی تباہی برپا کرتا تھا۔ مگر جاپانیوں کے تمام جنگی جنون کے باوجود انھیں اس جنگ میں شکست ہوئی۔ امریکہ کے دو ایٹم بموں نے ان کی معاشیات اور ان کی فوجی طاقت کو تہس نہس کر دیا۔

جاپان کے لئے یہ انتہائی غیر متوقع حادثہ تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ غیر متوقع ان کا وہ ردعمل ہے جو اس حادثہ کے بعد ان کی طرف سے ظاہر ہوا۔ انھوں نے پورے معاملہ پر ازسرِ نو غور کیا۔ انھوں نے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ انھیں جنگ کے بجائے علم کے میدان میں اپنی قومی جدوجہد کو جاری کرنا چاہئے۔ انھوں نے علم کی اس اہمیت کو ازسرِ نو دریافت (Rediscover) کیا جس کو وہ پچھلے برسوں میں بھول گئے تھے۔

اس دریافتِ نو کا عظیم فائدہ جاپان کو ملا۔ نئے راستہ پر صرف ایک نسل تک عمل کرنے کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ انھوں نے وہ بالاتری سائنس اور صنعت کے ذریعہ حاصل کر لی جس کو وہ بے فائدہ طور پر جنگ کے ذریعہ تلاش کر رہے تھے۔

وہ چیز جس کو میں ازسرِ نو دریافت (Rediscovery) کہہ رہا ہوں اس کی جدید تاریخ میں غالباً اتنی شاندار مثال کوئی دوسری نہیں ہے جو جاپان کے یہاں نظر آتی ہے۔

دورِ جدید کے مسلمان

قرآن و سنت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ دین میں اصل اہمیت دعوت کی ہے۔ یعنی غیر مسلم اقوام تک خدا کے پیغام کو پہنچانا۔ مگر بعض واضح اسباب کے تحت موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کام کی اہمیت کو بھول گئے ہیں۔ وہ دعوت کے شعور سے اتنے بے بہرہ ہو چکے ہیں کہ دوسرے دوسرے کاموں کو دعوت کا کام

سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی قومی سرگرمیوں میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کو دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں۔ ان کی مثال اس گروہ کی سی ہے جو "صلوٰۃ" سے اس درجہ بے خبر ہو جائے کہ ۱۲ ربیع الاول کو میلاد النبی کی دھوم مچائے اور سمجھے کہ وہ اس فریضہ کو انجام دے رہا ہے جس کو قرآن و حدیث میں اقامت صلوٰۃ کہا گیا ہے۔

ان کی بے خبری اس آخری انتہا تک پہنچ گئی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود دعوت کا کام نہیں کر رہے ہیں، بلکہ دعوتی شعور سے محرومی کی بنا پر وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں جو دعوت کے مواقع کو بالکل ختم کر دے۔ دعوت کی لازمی شرط یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی قسم کی مادی یا قومی کشمکش نہ پائی جاتی ہو۔ مدعو کے ساتھ مادی اور قومی کشمکش اس فضا کو بالکل برباد کر دیتی ہے جس میں دعوت موثر ہو سکے۔ چنانچہ داعی یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ مدعو کے ساتھ کسی بھی حال میں مادی اور قومی کشمکش نہیں کرے گا۔ وہ مدعو کے ساتھ ہر مادی اور قومی نزاع کو یک طرفہ طور پر ختم کر دے گا تاکہ دعوتی عمل کی راہ ہموار ہو سکے۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی دعوتی بے شعوری کی بنا پر ساری دنیا میں مدعو اقوام کے ساتھ سیاسی اور مادی اور قومی جھگڑے چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ جھگڑے خواہ مسلمانوں کے نزدیک کتنے ہی زیادہ ضروری ہوں، وہ دعوتی عمل کے لئے زہر ہیں۔ یہاں پہنچ کر مسلمانوں کی دعوتی بے شعوری ایک سنگین جرم کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مسلمانوں کو مدعو اقوام سے ہر قسم کی غیر دعوتی نزاع کو یک طرفہ طور پر ختم کرنا ہوگا۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ خدا کے اس قانون کی زد میں آجائیں جس کی زد میں یہود آئے اور پھر وہ دنیا اور آخرت میں خدا کی نصرت سے محروم ہو کر رہ گئے۔

موجودہ زمانہ میں تمام دوسرے کاموں سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر از سر نو دعوت کا شعور پیدا کیا جائے۔ دعوت کیا ہے، دعوت کی ذمہ داریاں کیا ہیں، خدا کی نصرت کس طرح تمام تر دعوت کے عمل پر منحصر ہے۔ یہ تمام باتیں مسلمانوں کے ذہن سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ مسلمانوں کے اصاغر اور اکابر دونوں ہی طبقے یکساں طور پر اس معاملہ میں بے شعوری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس شعور کو بیدار کرنا، مسلمانوں کے لئے دعوت کو از سر نو دریافت (Rediscovery بنانا وقت کا سب سے بڑا اور سب سے اہم کام ہے۔ ہر دوسرے کام کا نمبر

اس کے بعد آتا ہے۔ شعورِ دعوت کے زندہ ہونے پر ہی بقیہ تمام چیزوں کی زندگی کا انحصار ہے۔

ڈیوٹی کے خلاف

بادشاہ نے ایک قحط زدہ علاقہ کی ریلیف کے لئے کچھ لوگوں کو بھیجا۔ ان کو نقد اور ضروری سامان دیا کہ لے جاکر قحط زدہ لوگوں میں تقسیم کردو۔ وفد وہاں پہنچا تو اس نے بادشاہ کے دئے ہوئے سامان کو اپنے پاس رکھ لیا اور مقامی لوگوں کے خلاف طرح طرح کی شکایتیں نکال کر ان سے لڑنے جھگڑنے لگا ـــــ تم نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ تم نے ہم کو رہنے کے لئے گھر نہیں دئے۔ تمہارے لڑکوں نے ہم کو اجنبی سمجھ کر ہمارے ساتھ برا سلوک کیا، وغیرہ

بادشاہ کو معلوم ہوا تو وہ ریلیف کمیٹی کے ممبران پر سخت غضب ناک ہوا۔ اس نے ان سب کو گرفتار کرکے جیل خانہ میں بند کر دیا۔ اس نے کہا کہ تم کو میں نے قحط زدہ لوگوں کی امداد کے لئے بھیجا تھا نہ کہ ان سے جھگڑنے کے لئے۔ تم یہ امید لے کر وہاں کیوں گئے کہ تمہارے ساتھ وہاں شاندار سلوک کیا جائے گا۔ بالفرض اگر انھوں نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی تھی، تب بھی تم کو یہ کرنا چاہئے تھا کہ میرا دیا ہوا سامان دیانت اور ذمہ داری کے ساتھ ان کے درمیان تقسیم کرو اور پھر میرے پاس واپس چلے آؤ۔ تمہارا معاوضہ میرے ذمہ تھا نہ کہ ان کے ذمہ۔ اگر ان کے برے سلوک کے باوجود تم اپنی ڈیوٹی بخوبی طور پر انجام دیتے تو میرے نزدیک تمہاری قدر بڑھ جاتی اور میں کئی گنا اضافہ کرکے اس کا انعام تمہیں دیتا۔ مگر جب تم اپنی ذمہ داری کے بجائے اپنے حقوق کی فکر میں پڑ گئے تو اب میرے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں۔ اب جاؤ جیل خانہ کی سزا بھگتو۔

یہی مثال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہدایت دے کر انھیں مامور کیا تھا کہ وہ تمام قوموں کو اس کی تعلیمات سے باخبر کردیں۔ وہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ مگر مسلمانوں نے یہ کیا کہ طرح طرح کی شکایتیں لے کر اپنی مدعو اقوام سے لامتناہی جھگڑا چھیڑ دیا اب خدا کا پیغام تو مسلمانوں کے گھروں میں رکھا ہوا ہے اور جن قوموں تک یہ پیغام پہنچانا تھا، ان سے ہر جگ جنگ چھڑی ہوئی ہے، کہیں لفظی اور کہیں عملی۔ کہیں احتجاج کی سطح پر اور کہیں ٹکراؤ کی سطح پر۔ مسلمان اپنے اس عمل سے عین اسی انجام کے مستحق ہو رہے ہیں جس کے مستحق وہ لوگ ہوئے

جن کو مذکورہ بادشاہ نے ریلیف کے مقصد کے تحت قحط زدہ علاقہ میں بھیجا تھا۔ بلکہ مسلمانوں کا انجام ان سے شدید تر ہوگا۔ کیوں کہ ریلیف کمیٹی وقتی تکلیف کو دور کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی، جب کہ اہل اسلام کو جس مہم پر مقرر کیا گیا ہے وہ انسان کو ابدی عذاب سے بچانے کی مہم ہے۔ مسلمانوں کا جرم مذکورہ ریلیف کمیٹی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ دونوں کی مصیبت میں فرق ہے۔ اور سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ پہلے گروہ کی مصیبت کی مدت محدود ہے، اور دوسرے گروہ کی مصیبت کی مدت لامحدود۔

دعوت الی اللہ خدا کے بندوں کے درمیان خدا کی نمائندگی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں داعی کی نگاہ تمام تر صرف اپنی ذمہ داری پر ہوتی ہے نہ کہ اپنے حقوق پر۔ داعی انسانوں کو دیتا ہے مگر اس کا معاوضہ وہ خدا سے پانے کی امید رکھتا ہے۔ لوگ اس کو ستاتے ہیں مگر وہ خدا کی خاطر انھیں سہتا ہے۔ لوگ اسے محروم کرتے ہیں، پھر بھی وہ سوغات خداوندی کی تقسیم کے مقدس کام میں خلل آنے نہیں دیتا۔

داعی اپنے "بیج" کو دنیا میں کھوتا ہے تاکہ وہ آخرت میں ہرے بھرے درخت کی شکل میں اس کی طرف واپس لوٹے۔ دعوت کا کام صبر کی زمین پر انجام دیا جاتا ہے، جو لوگ صبر کا حوصلہ نہ کر سکیں وہ دعوت کا کام بھی انجام نہیں دے سکتے: وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم (۴۱: ۳۵)

تاریخ دعوت

مسلمان خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ مسلمانوں کی یہی حیثیت یہ متعین کر رہی ہے کہ بحیثیت امّت ان کی ذمہ داری موجودہ دنیا میں کیا ہے۔ وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کا وہ کام انجام دیں جس کے لیے پچھلے زمانہ میں رسول آیا کرتے تھے۔ رسول کا آنا بلاشبہ ختم ہوگیا۔ مگر رسول کا کام بلاشبہہ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوّت کے بعد مسلمان مقام نبوّت پر ہیں۔ کارِ نبوت سے کم تر درجہ کا کوئی کام ان کی حیثیتِ امت کے تحقق کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔

رسول کا کام کیا ہے۔ رسول کا کام اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہونچانا ہے۔ شرک میں مبتلا لوگوں کو توحید کا پیغام دینا ہے۔ جو لوگ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھے ہوئے ہیں، انھیں آخرت کے آنے والے دن سے باخبر کرنا ہے۔ ہر شخص کو یہ بتانا ہے کہ موجودہ دنیا میں وہ آزاد نہیں ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ خدا کے احکام کے ماتحت ہے۔ اسے پابند زندگی گزارنی ہے نہ کہ آزاد زندگی۔ قرآن وسنت کی صورت میں جو علم ربّانی محفوظ ہے اس کو تمام لوگوں تک اس طرح پہنچانا ہے کہ آخرت میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ میں اس سے بے خبر تھا۔

یہی امّت مسلمہ کا اصل منصبی فریضہ ہے۔ مگر یہی وہ سب سے بڑا فریضہ ہے جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس چھوڑنے کی سب سے بڑی وجہ صرف ایک ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ذہن پر ان کے قومی مسائل چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتی مسائل ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیے ہیں۔

عرب دنیا کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ غیر مسلم اقوام تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: آج کے مسلمانوں کو تو خود اپنے مسائل سے فرصت نہیں، پھر وہ دوسری قوموں میں دعوت کا کام کس طرح کر سکتے ہیں۔

مذکورہ جواب اس نفسیات کو بتاتا ہے جس کے تحت موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے عمومی

دعوت کے کام کو یکسر چھوڑ رکھا ہے۔ ان پر اپنے تحفظاتی مسائل کا غلبہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بحیثیت قوم ان کا وجود خطرہ میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ساری توجہ دفاع کے محاذ پر لگا دی ہے۔ یہ فکر ان کے اوپر اتنا زیادہ چھایا کہ دعوت کی ذمہ داریوں کا احساس ان کے اندر سے نکل گیا۔ حتی کہ بہت سے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دفاعی کام ہی کو " اسلامی دعوت" کا نام دے دیا ہے۔

یہ سراسر غیر اسلامی اور غیر قرآنی ذہن ہے۔ کیوں کہ قرآن کی رو سے مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بھی خود اسی دعوتی کام سے وابستہ ہے۔ اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا کی طرف سے ان کے قومی تحفظ کی بھی ضمانت ہے۔ اور اگر وہ دعوت الی اللہ کا کام نہ کریں تو ان کے قومی تحفظ کی بھی کوئی ضمانت نہیں۔ ماضی کی تاریخ پہلی بات کا ثبوت ہے اور مسلمانوں کی حال کی تاریخ دوسری بات کا ثبوت۔

دعوت کے ذریعہ تحفظ

یا ایہا الرسول بلّغ ما اُنزل الیک	اے پیغمبر، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب
من ربک وان لم تفعل فما بلّغت	کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچا دو۔ اور اگر
رسالتہ۔ واللہ یعصمک من الناس	تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں
ان اللہ لا یہدی القوم الکٰفرین	پہونچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا
(المائدہ ۶۷)	اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں کئی روایتیں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مجھ کو اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تو میں نے اپنے اندر اس کے لیے تنگی محسوس کی۔ اور مجھے خیال ہوا کہ لوگوں میں ایسے ہیں جو مجھے جھٹلائیں گے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت اتاری۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہریداری کی جاتی تھی۔ حتی کہ یہ آیت اتری۔ اس وقت رسول اللہؐ نے اپنے حجرہ سے سر نکالا اور فرمایا کہ اے لوگو واپس جاؤ۔ کیوں کہ اللہ نے مجھ کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (صفوۃ التفاسیر، الجلد الاول، صفحہ ۳۵۵)

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ رسول کے لیے حفاظت کا مسئلہ ہو تو اس کا الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں، دعوت کا عمل ہی اس کی حفاظت کا بھی ضامن ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصلاً تھا اور آپ کی امّت کے لیے یہ وعدہ تبعاً ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کی روشنی میں ہمیں اپنے معاملات کو دیکھنا چاہیے۔ دوسری اقوام کی طرف سے جب بھی اہل اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہو تو اس کا سبب یہی ہوگا کہ امت نے دعوت الی اللہ کے فریضہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اور جب امت دعوت الی اللہ کے فریضہ کے لیے اٹھے تو اس کو یقین رکھنا چاہیے کہ بقیہ تمام خطرات اور اندیشے کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے۔ بقیہ خطرات کے لیے الگ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دعوت الی اللہ کا کام کیجئے، اور بقیہ تمام خطرات کے دفعیہ کی صورتیں اپنے آپ پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔

دعوت سے یہاں مراد غیر مسلموں میں دعوت ہے۔ یعنی اللہ کے پیغام کو اللہ کے ان بندوں تک پہونچانا جو ابھی اللہ کے حلقۂ اطاعت میں داخل نہیں ہوئے۔ قرآن میں دعوت یا تبلیغ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے غیر مسلموں ہی میں دعوت پہونچانے کے لیے آیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر جو کام کرنا ہے اس کے لیے قرآن میں تذکیر، اصلاح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی اصلاح کے کام کو مجازی طور پر دعوت اور تبلیغ کہا جا سکتا ہے، مگر دعوت اور تبلیغ کا لفظ اصلاً جس دینی کام کا عنوان ہے وہ غیر مسلم اقوام تک خدا کا پیغام پہونچانا ہے نہ کہ مسلمانوں کی داخلی اصلاح کرنا۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کے زمانہ کے ایک "رجل مومن" کا ذکر ہے۔ یہ فرعون کے دربا کا ایک شخص تھا جو اپنے ایمان کو بربنائے مصلحت چھپائے ہوئے تھا۔ مگر ایک وقت آیا جب ک فرعون نے اپنے اس فیصلہ کا اعلان کیا کہ وہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔ اس وقت رجل مومن خاموشی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت میں بول پڑا اور فرعون اس کے درباریوں کے سامنے ایک پوری دعوتی تقریر کر ڈالی۔

یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ کے ساتھ اپنی د

پوری طرح ظاہر کر دی تو اس کے بعد یقینی تھا کہ وہ حضرت موسیٰ کی حمایت کرنے والے کے ساتھ بھی وہی برا معاملہ کرے گا جو وہ خود حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنا چاہتا ہے۔ مگر رجل مومن نے تبلیغ حق کو دوسرے ہر پہلو پر ترجیح دی اور نہایت کھلے طور پر سچائی کا اعلان کیا۔

قرآن میں رجل مومن کی مفصل تقریر نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:

فوقٰه الله سیئات ما مکروا وحاق
بآل فرعون سوء العذاب۔
المومن ۴۵

پھر اللہ نے اس کو ان لوگوں کی بری تدبیروں سے بچالیا اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رجل مومن کو جو چیز "سیئات ما مکروا" سے بچانے والی ثابت ہوئی وہ دعوت حق تھی۔ رجل مومن کے پاس صرف حق کی معرفت اور اس کی دعوت کا سرمایہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں فرعون کے پاس ہر قسم کی مادی طاقتیں تھیں۔ مگر رجل مومن جب داعی بن کر کھڑا ہو گیا تو خدا کی حمایت اس کے ساتھ ہو گئی۔ فرعون اپنی ساری طاقتوں کے باوجود اس کے خلاف اپنے برے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

دعوت الی اللہ کے کام پر عصمت وحفاظت کا خدائی وعدہ بلاشبہ یقینی ہے۔ مگر اس وعدہ کی تکمیل حقیقی دعوت ہی کے کام پر ہو سکتی ہے نہ کہ کسی اور کام پر۔ اگر ہم کوئی اور کام کریں اور اس کو "دعوت الی اللہ" کا عنوان دیدیں تو ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ خدا کا وعدۂ حفاظت ہمارے حق میں پورا ہوگا۔

تاریخ کی تصدیق

تاریخ حیرت انگیز طور پر اس قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول سے لے کر بعد کے زمانہ تک بار بار یہ واقعہ ہوا ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے اہل اسلام کے لیے حفاظت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور ہر بار جس چیز نے اس مسئلہ کو حل کیا وہ دعوت الی اللہ ہی کی طاقت تھی۔

دعوت کے ذریعہ حفاظت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ اہل اسلام خدا کی بات کو پوری طرح پہونچا دیں۔ اس کے باوجود مخاطب انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کرے تو اس وقت یہ معاملہ براہِ راست خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا کی طرف سے خصوصی مدد آتی ہے جو اہلِ حق

کو غالب اور ان کے دشمنوں کو مغلوب کر دیتی ہے۔ حضرت ہود اور حضرت لوط کے واقعات اسی کی مثالیں ہیں۔

خدا کا دین ہر آدمی کی خود اپنی فطرت کی آواز ہے۔ دین حق کی دعوت دینا گویا آدمی کے دل کے دروازے پر دستک دینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے اندر اگر کچھ بھی سنجیدگی ہو تو اس کا دل فطرت کی پکار کے آگے جھک جاتا ہے۔ اگر وہ باقاعدہ طور پر اس کو قبول نہ کرے تب بھی اس کے دل میں ایسے لوگوں کے حق میں نرم گوشہ پیدا ہو جاتا ہے جو خود اس کے دل کی دھڑکنوں کی زبان میں کلام کر رہے ہوں۔ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کم از کم انسانی اور اخلاقی سطح پر اسے ان لوگوں کی مدد کرنا چاہیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

تیسری شکل وہ ہے جس کو انتہائی شکل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی مخاطب کا داعی کی بات سے اس حد تک متاثر ہونا کہ وہ اس پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہ آخری صورت بھی تاریخ میں بار بار پیش آئی ہے اور جہاں یہ صورت پیش آجائے وہاں ہر قسم کا مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی تیسری صورت پیش آئی۔ آپ کے ساتھ پیش آنے والی صورت اس نوعیت کی آخری کامل ترین مثال تھی۔

ایک اعتراف

ٹامس کارلائل (۱۸۸۱– ۱۷۹۵) نے اسلامی دعوت کی تسخیری قوت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ بات بہت کہی گئی ہے کہ محمد نے اپنا مذہب تلوار کے ذریعہ پھیلایا۔ تلوار یقیناً، مگر آپ تلوار کہاں سے لائیں گے۔ ہر نیا فکر اپنے آغاز میں لازمی طور پر ایک کی اقلیت میں ہوتا ہے۔ وہ ابتداءً صرف ایک انسان کے دماغ میں آتا ہے۔ ساری دنیا میں صرف ایک آدمی اس کو ماننے والا ہوتا ہے۔ تمام آدمیوں کے مقابلہ میں صرف ایک آدمی۔ ایسی حالت میں اگر وہ ایک تلوار لے اور اس کے ذریعہ سے اپنے عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کرے تو اس کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا:

Much has been said of Mahomet's propagating his religion by the sword. The sword indeed; but where will you get your sword. Every new opinion, at its starting, is precisely in a minority of one. In one man's head alone, there it dwells as yet. One man alone of the whole world believes it; there is one man against all men. That he take a sword, and try to propagate with that, will do little for him.

Thomas Carlyle, *The Hero As Prophet*, p. 23.

اگلے صفحات میں ہم اسلامی تاریخ کے کچھ حوالے نقل کریں گے جس سے دعوت کی تسخیری حیثیت کا واقعاتی ثبوت ملتا ہے۔

تدبیر انسانی، تدبیر ربانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تقریباً تیرہ سال رہے۔ مکہ کے قیام کے آخری زمانہ میں مشرکین نے یہ منصوبہ بنایا کہ آپ کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ان کے سرداروں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

واذ یمکر بك الذین کفروا لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین (الانفال ۳۰)	اور جب منکرین تمہاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہترین تدبیر والا ہے۔

پیغمبر اسلام کے بارہ میں مشرکین کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو قید یا قتل یا اخراج کے ذریعہ اپنے میدان سے ہٹا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زیادہ بہتر تدبیر کے ذریعہ اس ظالمانہ منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔ یہ خدائی منصوبہ کیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ منصوبہ یہ تھا کہ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں آپ کے خاتمہ کی تدبیریں کی جا رہی تھیں، مکہ کے دو مسلمان مدینہ بھیجے گیے اور وہاں انھوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ان کی تبلیغ سے مدینہ میں کثرت سے لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدینہ میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں ہو گیے کہ انھوں نے مدینہ میں غالب حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خاموشی کے ساتھ مکہ سے مدینہ منتقل ہوگیے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: امرت بقریۃ تاکل القریٰ (مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی) بخاری و مسلم۔

یہ آیت واضح طور پر تدبیر انسانی اور تدبیر ربانی کا فرق بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر انسانی قید اور قتل اور اخراج کی سطح پر چلتی ہے، اور تدبیر ربانی دعوت کے ذریعہ تسخیر قلوب کی سطح پر۔ انسان کی سوچ کی آخری حد یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کو محبوس کرکے اس کی سرگرمیوں کو روک دے۔ یا اس کو اپنے علاقہ سے نکال دے یا اس کو قتل کرکے اس کا خاتمہ کر ڈالے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا طریقہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے دین کا مبلغ بنا کر بستیوں میں داخل کرتا ہے۔ وہ اپنے پیغام کے لیے لوگوں کے دلوں کے دروازے کھولتا ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ تمام زندہ لوگ ٹوٹ ٹوٹ کر دینِ حق کی جانب اکٹھا ہوجاتے ہیں۔ دین حق کی طاقت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ دشمنوں کی کوئی تدبیر ان کے اوپر کارگر نہ ہوسکے۔

تسخیری کلمہ

ابو طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش کے سردار ان کے پاس جمع ہوئے اور کہا کہ "ہمارے اور محمد کے درمیان کوئی بات طے کر دیجیے تاکہ دونوں ایک دوسرے سے رُکے رہیں"۔ ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا کہ یہ قریش کے سردار لوگ جمع ہیں۔ بتائیے کہ آپ ان سے کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

نعم، کلمة واحدة تعطونها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم	ہاں، تم مجھے ایک کلمہ دیدو، تم اس کے ذریعہ سے عرب کے مالک ہوجاؤگے اور عجم اس کے ذریعہ سے تمہارے لیے جھک جائیں گے۔

(سیرۃ ابن کثیر)

انھوں نے پوچھا کہ وہ کلمہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو ان کو چھوڑ دو (تقولون: لا اله الا الله وتخلعون ماتعبد

من دونه)

آپ جب مکہ میں حق کا پیغام لے کر اٹھے تو آپ ایک فی دنیا کی اقلیت رکھتے تھے۔ مگر بہت جلد عرب کے ذہین اور صالح افراد کو آپ کے کلمہ (بالفاظ دیگر آپ کے فکر کی طاقت) نے کھینچ لیا۔ اگرچہ ابتداءً آپ کی شدید مخالفت کی گئی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ سنجیدہ اور صاحب فکر افراد کے لیے آپ کا پیغام اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔

مکہ کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ طفیل بن عمرو الدوسی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے۔ وہ اپنے قبیلہ کے معزز آدمی تھے۔ قریش کے کچھ لوگ ان سے ملے اور کہا کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک جادوگر آدمی ہیں۔ تم ان کی بات نہ سننا اور ان سے دور رہنا۔ طفیل بن عمرو کو معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ میں ہیں۔ چنانچہ وہ وہاں گیے تو اپنے کانوں میں روئی ڈال لی تاکہ آپ کی آواز نہ سن سکیں۔

بعد کو انھیں خیال آیا کہ میں خود ایک سمجھ دار آدمی ہوں۔ مجھے کان میں روئی ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے محمد کا کلام سننا چاہیے۔ آخر میں کیوں ڈروں کہ میں ان کا کلام سن کر بھٹک جاؤں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور پورا قصہ انھیں بتایا۔ پھر کہا کہ آپ مجھے اپنا کلام سنائیے۔ آپ نے طفیل بن عمرو کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم وہ اتنا اچھا کلام تھا کہ اتنا اچھا کلام میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ ایسا منصفانہ امر تھا کہ ویسے منصفانہ امر سے میں ابھی تک واقف نہیں ہوا تھا (فلا واللہ ما سمعت قولاً قطُّ احسن منہ ولا امراً اعدل منہ) اس کے بعد طفیل بن عمرو اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گیے۔

ہجرتِ حبشہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں جب کام شروع کیا، اس وقت وہاں شرک چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ مکہ کے لوگوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کو طرح طرح سے ستایا جاتا۔ نبوّت کے پانچویں سال آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم لوگ مکہ چھوڑ کر حبش چلے جاؤ۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے دو بار حبش کی جانب ہجرت کی۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد تقریباً ۱۲۰ ہے۔

مکہ کے مشرکین کو جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے ساتھی حبش چلے گیے ہیں اور وہاں اطمینان کے ساتھ رہ رہے ہیں تو انھوں نے مشورہ کرکے اپنے دو آدمیوں (عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ) کو حبش کے بادشاہ نجاشی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے وہاں جاکر شاہ نجاشی اور اس کے درباریوں کو تحفے پیش کیے اور کہا کہ ہمارے شہر کے کچھ نادان لوگ اپنا آبائی دین چھوڑ کر تمہارے یہاں آگیے ہیں۔ ان کو ہمارے حوالے کردو کہ ہم انھیں اپنے ساتھ واپس لے جائیں۔

یہ ایک طویل قصہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ نجاشی کے درباری مشرکین مکہ کے وفد کی باتوں سے متاثر ہوگیے اور انھوں نے شاہ سے یہ سفارش کی کہ مسلمانوں کو دوبارہ مکہ واپس بھیج دیا جائے۔ یہ ایک بے حد نازک لمحہ تھا۔ کیوں کہ واپسی کا مطلب بھیڑیوں کے منھ میں واپس جانا تھا۔ مگر اس نازک لمحہ میں جو چیز مسلمانوں کے کام آئی وہ وہی "دعوت" تھی جس کو یہ بے سروسامان لوگ اپنے ساتھ لے کر وہاں گیے تھے۔

چنانچہ آخری مرحلہ میں یہ طے ہوا کہ مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوں اور بتائیں کہ وہ دین کیا ہے جو انھیں پیغمبر عربی سے ملا ہے۔ اس وقت حضرت جعفر بن ابی طالب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے دربار میں ایک تقریر کی جو سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد حضرت جعفر نے قرآن سے سورہ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔ روایات بتاتی ہیں کہ اس کو سُن کر بادشاہ اور اس کے درباریوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حتی کہ بادشاہ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اس کے بعد شاہ نجاشی نے حکم دیا کہ مشرکین مکہ کا وفد جو تحفے لایا تھا وہ اُسے واپس کر دیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کو عزّت کے ساتھ اپنے دربار سے رخصت کیا۔ ان کو امان دی اور مشرکین کے دونوں آدمی ذلیل ہوکر وہاں سے نکلے اور مسلمان وہاں اچھے مقام اور اچھے پڑوس میں ٹھہرے رہے (وردّ المسلمین ردًّا کریما وأمّنهم وخرجا (عبدالله بن ابی ربیعه وع بن العاص) من عنده مقبوحین۔ فاقام المسلمون بخیر دار مع خیر جار)

اسلام عمر بن الخطاب

نبوت کے چھٹے سال تک مکہ کی ایک قابلِ لحاظ تعداد اسلام کے حلقہ میں داخل ہوچکی مگر یہ لوگ زیادہ تر نیچے کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے مکہ میں ابھی تک اسلام کا

قائم نہیں ہوسکا تھا۔ یہ دروازہ بھی پہلی بار دعوت ہی کے ذریعہ سے کھلا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں دعا فرمائی کہ اے اللہ عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام کے ذریعہ اسلام کو طاقت دے۔ (اللّٰھم اعز الاسلام باحد العمرین) اس کے بعد حالات بڑھتے رہے یہاں تک کہ مکہ کے سردار ابوجہل نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمد کو قتل کرڈالے اس کو میں سو اونٹ دوں گا۔ عمر بن خطاب مکہ کے نہایت طاقتور اور پہلوان قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور اس ارادہ سے گھر سے روانہ ہوئے کہ رسول اللہ کو قتل کرکے ایک سو اونٹ حاصل کریں۔

وہ جارہے تھے کہ راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور ان کے بہنوئی سعید بن زید دونوں اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوگیے ہیں۔ عمر کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ وہ اپنی بہن کے گھر پہونچے اور بہن اور بہنوئی کو مارنا شروع کیا۔ بہن نے کہا کہ اے خطاب کے بیٹے، تم جو کچھ کرسکتے ہو کرو، ہم تو اب اسلام قبول کرچکے ہیں۔ اس کے بعد عمر کچھ نرم پڑے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ وہ دین کیا ہے جس کو تم نے اختیار کیاہے۔ انھوں نے ایک صحیفہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا جس میں قرآن کی سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ان کی زبان سے نکلا: ما احسن ھٰذا الکلام واکرمہ (کیسا اچھا اور برتر یہ کلام ہے)

خلاصہ یہ کہ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ حضرت عمر اپنے زمانہ میں مکہ کے نہایت طاقتور آدمی تھے۔ ان کا قد اتنا بلند تھا کہ مسجد نبوی (مدینہ) بننے کے بعد جب وہ اس میں داخل ہوئے تو ان کا سر دروازہ سے ٹکرا گیا۔ ایسے شخص کا اسلام کے حلقہ میں داخل ہونا بلاشبہ اسلام کی عظیم الشان مدد تھی۔ اور اسلام کو یہ عظیم الشان مدد دعوت کے راستہ سے حاصل ہوئی، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ عمر کا اسلام ایک فتح تھا۔ ہم کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے یہاں تک کہ عمر نے اسلام قبول کیا۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو انھوں نے مشرکین مکہ سے لڑائی کی یہاں تک کہ انھوں نے خود بھی کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی

(انّ اسلام عمر کان فتحًا ولقد کنّا ما نصلّی عند الکعبة حتی اسلم عمر فلما اسلم قاتل قریشًا حتی صلّی عند الکعبة وصلّینا معه)

قبائل یثرب کا قبول اسلام

اسلام ایک فطری دین ہے۔ وہ ہر آدمی کے دل کے دروازہ پر دستک دیتا ہے۔ اگر کوئی نفسیاتی رکاوٹ حائل نہ ہو تو آدمی اس کو ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کی صداقت کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس کی ایک تاریخی مثال مدینہ کے انصار (اوس اور خزرج) کا معاملہ ہے۔

مکی دور میں مدینہ سے ایک صاحب زیارت کعبہ کے لیے مکہ آئے۔ ان کا نام سُوَید بن الصامت تھا۔ وہ نہایت باصلاحیت آدمی تھے۔ چنانچہ ان کی قوم ان کو الکامل کہتی تھی۔ مکہ میں ان کی ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی۔ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ سُوید نے کہا کہ آپ کے پاس شاید اسی قسم کی چیز ہے جو میرے پاس ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکمت لقمان۔ آپ نے کہا کہ اس کو میرے سامنے پیش کرو۔ انھوں نے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ اچھا کلام ہے۔ مگر میرے پاس قرآن ہے جو اس سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ پھر آپ نے قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ سُوید بن الصامت نے اس کو سن کر کہا: ان ھذا القول حسن (بے شک یہ بہتر کلام ہے)

اس کے بعد ابوالحیسر انس بن رافع مکہ آئے۔ ان کے ساتھ قبیلہ اوس کے چند اور افراد تھے۔ اس وقت اوس اور خزرج میں لڑائی چل رہی تھی۔ اور یہ لوگ خزرج کے مقابلہ میں قریش کی حمایت حاصل کرنے کے لیے مکہ آئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی بابت سنا تو آپ ان کے پاس آئے۔ اور ان سے کہا کہ جس چیز کے لیے تم آئے ہو کیا اس سے بہت چیز کی طرف تمہیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر انھیں سنایا۔ اس کے بعد مدینہ کے وف کے ایک نوجوان ایاس بن معاذ نے کہا۔ اے قوم، خدا کی قسم یہ اس سے بہتر ہے جس کے لیے

آئے ہو (ای قوم ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ) تاہم اس وقت انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا اور مدینہ واپس چلے گئے۔

اس کے بعد زیارت کعبہ کا زمانہ آیا اور عرب کے مختلف قبیلے مکہ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر ان قبائل کے پاس گیے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس سلسلہ میں عقبہ کے پاس آپ کی ملاقات قبیلۂ خزرج (مدینہ) کے چھ آدمیوں سے ہوئی۔ جس میں اسعد بن زرارہ اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ ابتدائی گفتگو کے بعد آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ یہ لوگ مدینہ کے یہود سے یہ سنتے آئے تھے کہ ایک آخری نبی آنے والے ہیں ان کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ خزرج کے لوگوں نے آپ کا پیغام سن کر پہچان لیا کہ یہ وہی نبی ہیں۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ اے قوم، خدا کی قسم یہی وہ پیغمبر ہیں جن کے بارے میں یہود تمہیں بتا رہے تھے۔ تو یہود اس کے بارے میں تم پر سبقت نہ کرنے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہی اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ قال بعضھم لبعض یا قوم تعلمون واللہ انہ النبی الذی توعدکم بہ الیھود فلا تسبقنکم الیہ فاجابوہ وصدقوہ واسلموا۔

مدینہ میں اسلام کی اشاعت

یہ لوگ اسلام کے بعد مدینہ واپس ہوئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ہر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اگلے سال موسم حج میں دوبارہ مدینہ کے ۱۲ آدمی مکہ آئے۔ یہ لوگ اسلام سے متاثر ہو چکے تھے۔ انھوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت اسلام قبول کرنے کے ساتھ آپ کی حمایت کرنے کی بیعت بھی تھی۔ چنانچہ اس کو بیعت النسار کہا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نام تاریخ اسلام میں بیعت عقبہ اولیٰ ہے۔

یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر کو بھیج دیا تاکہ وہ مدینہ کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کریں اور قرآن سنائیں اسی لیے ان کو مدینہ میں مُقری (پڑھ کر سنانے والا) کہا جاتا تھا۔

اس وقت مدینہ کے ایک نمایاں سردار اُسید بن حُضیر تھے۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی تو وہ اس پر غصہ ہوگیے۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ مکہ کے کچھ لوگ یہاں آکر ہمارے کم سمجھ لوگوں کو بہکا رہے ہیں اور ان کے آبائی دین سے انھیں پھیر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے گھر سے ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو مار کر بھگا دیں۔

ان کی ملاقات ایک باغ میں مصعب بن عمیر سے ہوئی جو کچھ لوگوں کو اسلام کی باتیں بتا رہے تھے۔ اُسید بن حُضیر نے انھیں بُرا بھلا کہا اور کہا کہ تم یہاں اس لیے آئے ہو کہ ہمارے کمزور لوگوں کو ان کے دین سے پھیرو۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ بیٹھئے اور ہماری بات سنیے۔ اگر وہ صحیح ہو تو اس کو مان لیجئے، اور اگر صحیح نہ ہو تو اسے رد کر دیجئے۔ اُسید بن حضیر نے کہا کہ تم نے انصاف کی بات کہی (انصفت)

اس کے بعد وہ اپنا ہتھیار الگ رکھ کر بیٹھ گیے۔ مصعب بن عمیر نے ان کے سامنے قرآن کی آیتیں پڑھیں۔ اس کو سُن کر اُسید بن حضیر کا ذہن بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتنا اچھا اور کتنا حسین کلام ہے (ما احسن هذا و اجمله) اس کے بعد انھوں نے غسل کر کے اپنے کو پاک کیا اور کلمۂ شہادت ادا کر کے اسلام میں داخل ہوگیے۔

تقریباً یہی واقعہ مدینہ کے دوسرے بڑے سردار سعد بن معاذ کے ساتھ پیش آیا۔ ان کو مدینہ میں اسلام کی اشاعت کی خبر ہوئی۔ ابتداءً وہ بھی غصہ ہوئے۔ اور اپنا ہتھیار لے کر نکلے تاکہ ایسے لوگوں کو تنبیہ کر دیں۔ وہ مصعب بن عمیر کے پاس پہونچے تو انھوں نے کہا کہ آپ پہلے میری بات سنیے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیجئے۔ اس کے بعد انھوں نے سعد بن معاذ کو قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ راوی کہتے ہیں کہ قرآن کو سنتے ہی ہم نے ان کے چہرے پر اسلام کی جھلک دیکھی۔ (فعرفنا واللّٰه في وجهه الاسلام) اس کے بعد انھوں نے پوچھا کہ اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے۔ مصعب بن عمیر نے کہا کہ آپ غسل کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے اس کے بعد حق کی گواہی دیجئے پھر دو رکعت نماز پڑھیے۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور اسلام میں داخل ہوگیے۔

اس کے بعد دونوں سردار سعد بن معاذ اور اُسید بن حُضیر اپنے قبیلہ کی طرف واپس آئے

اور لوگوں سے کہا کہ میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہمارے بہترین شخص ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے مردوں اور عورتوں سے بولنا میرے لیے اس وقت تک حرام ہے جب تک تم اللہ اور رسول پر ایمان نہ لاؤ۔ چنانچہ اسی دن شام تک ان کے قبیلہ کے تمام مرد اور عورت مسلمان ہوگیے۔

مدینہ کے قبائل اپنی سادہ فطرت پر تھے۔ ان کے اندر سلامت طبع کمال درجہ میں موجود تھی۔ وہ حق کو جان لینے کے بعد اس سے اعراض کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے قبائل میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر نہ رہا جس میں کچھ مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں موجود نہ ہوں۔

اس کے بعد حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس آئے۔ ان کے ساتھ ستّر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ یہ لوگ حج سے فارغ ہوئے تو قرارداد کے مطابق ایک روز رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جس کو بیعت عقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ کافی تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آخری مرحلہ میں جب آپ ان لوگوں سے بیعت لے رہے تھے تو ان میں سے ایک شخص (عباس بن عبادہ بن نضلہ) نے کہا کہ اے لوگو، تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر ہم نے بیعت کا حق ادا کر دیا تو ہمارے لیے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جنّت۔ انھوں نے کہا کہ ہاتھ بڑھائیے۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے بیعت کی (قالوا فمالنا بذالك یارسول الله ان نحن وافینا قال الجنة۔ قالوا ابسط یدك فبسط یده فبایعوه) التفسیر المظہری، المجلد الثانی، صفحہ ۱۲ــ۱۰۷

ہجرتِ مدینہ

قدیم عرب میں آدمی قبیلہ کی حمایت میں زندگی گزارتا تھا۔ قبیلہ اس کی جان و مال کی حفاظت کا ضامن ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے سردار اس وقت ابو طالب بن عبد المطلب تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابو طالب کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد قبیلہ کے رواج کے مطابق سرداری کا عہدہ ابو لہب کو ملا۔ ابو لہب نے آپ کو اپنی حمایت

میں لینے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ تھا۔ کیوں کہ قبیلہ کی حمایت سے محرومی کا مطلب یہ تھا کہ آدمی کی جان و مال دوسروں کی نظر میں مباح ہو جائے۔ چنانچہ اس کے بعد آپ کے مخالفین آپ کے اوپر جری ہو گیے۔ سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ ابو طالب کی زندگی تک قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہ کر سکے۔ مگر جب ابو طالب کی وفات ہو گئی تو وہ آپ کے خلاف جارحیت کرنے لگے یہاں تک کہ قریش کے بعض نادانوں نے آپ کے سر پر مٹی ڈال دی۔

مکہ میں قیام بظاہر اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ عین اس وقت دعوت کے ذریعہ ایک نیا شاندار امکان آپ کے لیے نکل آیا۔ نبوت کے گیارہویں سال مدینہ کے چند آدمی کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ آئے اور آپ کے پیغام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد اگلے سال مزید کچھ لوگ آئے۔ انھوں نے آپ کی زبان سے قرآن سنا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو گیے۔ یہ لوگ جب واپس ہونے لگے تو ان کے ساتھ مکہ سے دو آدمی (عبداللہ بن ام مکتوم اور مصعب بن عمیر) قرآن اور اسلام کی تعلیم کے لیے بھیجے گیے۔ مدینہ پہونچ کر انھوں نے لوگوں کو قرآن سنانا شروع کیا۔ اور اسلام کی تعلیم سے لوگوں کو آگاہ کرنے لگے۔ مدینہ کی زمین اسلام کی دعوت کے لیے نہایت زرخیز ثابت ہوئی۔ وہاں کے لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے۔ حتی کہ یہ نوبت آگئی کہ اسلام مدینہ کے تمام محلوں میں پھیل گیا۔ انصار مدینہ کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کچھ مرد اور کچھ عورت مسلمان نہ ہو گیے ہوں (وجعل الاسلام یفشو فی منازل الانصار۔ حتی لم تبق دارٌ من دور الانصار الاّ وفیہا رجال و نساءٌ مسلمون)

مدینہ کی فضا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے موافق دیکھا تو آپ نے مکہ کے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہجرت کر کے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مکہ سے مدینہ منتقل ہو گئی۔ مکہ کے مشرکین نے اس صورتِ حال کو اپنے خلاف ایک چیلنج سمجھا۔ انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لوگ مدینہ کو اپنا مرکز بنا کر دوبارہ ہمارے

خلاف کارروائی کریں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ قبل اس کے کہ مدینہ کے مسلمان کوئی کارروائی کریں پیغمبر اسلام کو قتل کر دیا جائے۔ مگر اب معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جس رات کو وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے تھے عین اسی رات کو آپ مکہ سے نکل کر مدینہ پہونچ گیے۔

اس کے بعد مدینہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہوئی اور اس نئی تاریخ کا دروازہ جس چیز نے کھولا وہ بلاشبہ دعوت تھی۔

حدیبیہ کے بعد اشاعت اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ۱۳ سال مکہ میں رہے۔ اس کے بعد آپ مکہ والوں کی شدید مخالفت کی بنا پر مکہ سے مدینہ چلے گیے۔ مگر مکہ کے مشرکین کا غصہ اب بھی ختم نہ ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر انھوں نے مسلمانوں کو اسی طرح چھوڑ دیا تو وہ طاقت ور ہو جائیں گے اور ایک روز مکہ پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے خود پہل کر کے اہلِ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ بدر و اُحد جیسی کچھ بڑی جنگیں ہوئیں اور زیادہ تر چھوٹے مقابلے ہوئے جن کو جھڑپ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۸۰ تک پہونچتی ہے۔

ایک کے بعد ایک جنگیں ہوتی رہیں۔ مگر اہل شرک اور اہل توحید کے درمیان فیصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گہرا دعوتی منصوبہ بنایا۔ یہ دعوتی منصوبہ وہی ہے جس کو اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ (۶ھ) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات حدیث کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مختلف واقعات کے بعد وہ مرحلہ آیا جب کہ مقام حدیبیہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کش کی کہ آپ کے اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) ہو جائے۔ مشرکین مکہ سے اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی تو انھوں نے اس ناجنگ معاہدہ پر راضی ہونے کے لیے بالکل یک طرفہ قسم کی شرطیں پیش کیں۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب عمرہ کیے بغیر مقام حدیبیہ سے مدینہ واپس چلے جائیں۔ قریش کا کوئی آدمی مسلمانوں کے یہاں چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ اس کے برعکس کوئی مسلمان مدینہ

سے مکہ چلا جائے تو مکہ کے لوگ اسے واپس نہیں کریں گے۔ مشرکین مکہ کی ضد یہاں تک بڑھی کہ جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو انھوں نے معاہدہ کی عبارت میں محمد رسول اللہ لکھنے نہیں دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ محمد بن عبداللہ لکھا جائے۔ اسی طرح انھوں نے اور بھی بہت سی اشتعال انگیز باتیں کیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یک طرفہ طور پر ان کی تمام اشتعال انگیزیوں کو برداشت کر لیا۔ اور مشرکین مکہ کی اپنی شرائط پر دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر کے حدیبیہ سے واپس آگیے۔

مشرکین کی شرائط کو یک طرفہ طور پر مان کر یہ معاہدہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ دعوت کا دروازہ کھلے۔ چنانچہ اس معاہدے کے بعد امن قائم ہوگیا۔ دونوں فریق کے لوگ آپس میں ملنے لگے۔ مومن اور غیر مومن کے درمیان دعوتی گفتگوئیں ہونے لگیں۔ علم دین چاروں طرف پھیلنے لگا (وامن الناس واجتمع بعضهم ببعض وتكلم المومن مع الكافر وانتشر العلم النافع و الایمان، ابن کثیر)

جنگ بند ہونے کے بعد جو دعوتی کام شروع ہوا اس کے نتیجہ میں قبائل کے لوگ کثرت سے مسلمان ہونے لگے۔ معاہدہ حدیبیہ کے وقت قابل جنگ مسلمانوں کی تعداد اگر ڈیڑھ ہزار تھی تو دو سال سے بھی کم عرصہ میں ان کی تعداد دس ہزار ہوگئی۔ چنانچہ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف مارچ کیا تو مکہ کے سردار ابوسفیان نے اعلان کر دیا کہ اطاعت قبول کر لو، کیوں کہ آج ہمارے اندر ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں (هذا محمد قد جاءكم فيما لا قِبَلَ لكم به فمن دخل دار ابي سفيان فهو آمن)

دعوت ایک ابدی طاقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی قعدہ ۶ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ آپ کے چودہ سو اصحاب تھے۔ آپ کا مقصد مکہ پہنچ کر عمرہ کرنا تھا۔ لمبا پُرمشقت سفر طے کر کے آپ حدیبیہ کے مقام پر پہونچے جو مکہ سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں قریش کے لوگ آگیے اور انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ آپ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کریں۔ دو ہفتہ تک گفتگو ہوتی رہی۔ مگر قریش راضی نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ خود قریش کی شرائط پر ایک صلح کر کے واپس چلے آئے جس کو تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

اس سفر سے واپسی کے بعد ہی آپ نے اطرافِ عرب کے حاکموں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ یہ دعوتی خطوط ۷ھ میں روانہ کیے گیے۔ جن لوگوں کو یہ خطوط روانہ کیے گیے ان کے نام یہ ہیں :

ہرقل	شہنشاہِ روم	مُنذر بن ساویٰ	شاہِ بحرین
خسرو پرویز	شہنشاہِ ایران	جیفر و عبد الجلندیٰ	شاہِ عُمان
نجاشی	شاہِ حبش	ہوذہ بن علی	حاکمِ یمامہ
مقوقس	شاہِ مصر و اسکندریہ	حارث غسانی	حاکم دمشق

اگرچہ بعض حکمرانوں نے آپ کے دعوتی مکتوب کے ساتھ متکبّرانہ معاملہ کیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ مگر اکثر کے دل اس سے مرعوب اور متاثر ہوگیے اور کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ قیصر روم نے اپنی قوم کے ذمہ داروں سے کہا کہ آؤ ہم ان کے پیرو بن جائیں اور ان کی تصدیق کریں تاکہ ہماری دنیا اور آخرت دونوں سلامت رہیں (فهلموا فلنتبع و لنصدقه فتسلم لنا دنيانا وآخرتنا) حاکم یمامہ نے اپنے جواب میں لکھا کہ کتنی اچھی ہے وہ چیز جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ما احسن ماتدعوا اليه واجمله)

عین اس وقت جب کہ اسلام مادی اعتبار سے پیش قدمی کی پوزیشن میں نہ تھا، وہ فکری اعتبار سے اس پوزیشن میں تھا کہ شاہانِ وقت کو اپنا مخاطب بنا سکے۔ یہ تمام تر دعوت کا کرشمہ تھا۔ کوئی دشمن اسلام کے مادی اقدام پر روک لگا سکتا ہے۔ مگر اسلام کے فکری اقدام پر روک لگانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام بیرون عرب میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے گیے تو اسلام عرب میں غالب آچکا تھا۔ تاہم عرب کے آس پاس ممالک میں جو قومیں آباد تھیں ان کا مذہب تہذیب اور زبان سب اسلام سے بالکل الگ تھی۔ اس وقت وہ وسیع دنیا وجود میں نہیں آئی تھی جس کو آج عرب دنیا (Arab world) کہا جاتا ہے۔

یہ صورت حال اسلام کی زندگی کے لیے مستقل خطرہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اگر صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود رہتا تو بعد کے زمانے میں خود اس کا وجود قائم رہنا مشکل

تھا۔ اسلام کی مستقل زندگی کے لیے ضروری تھا کہ وسیع خطہ میں اسلام کا مذہب اس کی زبان اور اس کی تہذیب غالب حیثیت حاصل کرے۔ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تقریباً نصف صدی کے اندر پیش آگیا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ عظیم واقعہ اسلام کی دعوتی قوت کے ذریعہ پیش آیا نہ کہ اس کی سیاسی قوت کے ذریعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی قوت اس قسم کے واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے ناکافی ہے۔ اگر سیاسی قوت کے ذریعہ مذہب کو بدلنا ممکن ہوتا تو آج ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سب کے سب عیسائی ممالک ہوتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بیرون عرب کی اقوام سے لڑائیاں شروع ہوئیں۔ اور اہل اسلام نے بہت کم مدت میں ایشیا سے لے کر افریقہ تک کا بہت بڑا علاقہ فتح کر ڈالا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان مفتوحہ ممالک میں کبھی بھی تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر مصر کو لیجیے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مصر کی تاریخ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ۶۴۲ء میں مصر کو نہایت تیزی سے فتح کر لیا۔ مگر انھوں نے وہاں شدت کے ساتھ مذہبی رواداری (Religious tolerance) پر عمل کیا۔ مصریوں کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔ حتی کہ حکومتی سطح پر انھیں ترغیب بھی نہیں دلائی گئی۔ عرب حکمرانوں نے اس بات کا عہد کیا کہ وہ عیسائی گرجاؤں کو باقی رکھیں گے:

> There was no attempt to force, or even to persuade, the Egyptians to convert to Islam. The Arabs even pledged to preserve the Christian Churches (6/487-88).

اسی طرح پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب (پریچنگ آف اسلام) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مصر کے مسلم فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ کامل رواداری کا ثبوت دیا۔ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ مصری عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا مسلم حکمرانوں کی طرف سے کسی ظلم یا نامنصفانہ دباؤ کا نتیجہ تھا:

> There is no evidence of their widespread apostasy to Islam being due to persecution or unjust pressure on the part of their new rulers (p. 104).

اسی طرح پروفیسر آرنلڈ نے دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ مصریوں کا قبول اسلام کسی سیاسی یا فوجی جبر کا نتیجہ نہ تھا :

These conversions were not due to persecutions (110).

اب سوال یہ ہے کہ جب اہلِ مصر پر تبدیلیٔ مذہب کے لیے جبر نہیں کیا گیا تو کیوں کر ایسا ہوا کہ ان کی بہت بڑی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا جواب مصریات کے ماہر سر آرتھر کیتھ نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ ـــــــ مصر کے عیسائی تلوار سے فتح نہیں کیے گیے بلکہ قرآن کے ذریعہ فتح کیے گیے :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran.
Sir Arthur Keith, *A New Theory of Human Evolution*, London, Watts & Co. 1950, p. 303.

یہی صورت تمام مفتوحہ ممالک میں پیش آئی۔ ان ملکوں کی غیر مسلم آبادی کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔ یہ صرف اسلام کی دعوتی طاقت تھی جس نے انھیں مسخر کر لیا اور وہ بہت تھوڑے عرصہ میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیے۔ جو مسلمان ان کے ملک میں داخل ہوئے تھے ان سے روزانہ کے میل جول میں وہ اسلام کی باتیں سنتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اسلامی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس سے ان پر یہ بات کھلی کہ ان کے آبائی مذہب کے مقابلہ میں اسلام زیادہ معقول ہے۔ اس کی تعلیمات زیادہ سادہ اور قابل عمل ہیں۔ اس تاثر کے تحت وہ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی اور جغرافی نقشہ پر وہ دنیا وجود میں آئی جس کو اسلامی دنیا کہا جاتا ہے۔

سلجوق ترکوں کا قبول اسلام

سلجوق، ترکان غز کے ایک سردار کا نام تھا۔ اس نے قبائل کی ایک فوج جمع کی اور گیارہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیا پر حملہ کر دیا۔ اس نے ایک طاقت ور سلطنت بنائی۔ اس کی سلطنت میں اُردن، شام، عراق، فلسطین وغیرہ علاقے شامل تھے۔ ان علاقوں میں اس وقت مسلمانوں کی حکومت تھی۔ سلجوقی ترکوں نے مسلم افواج کو زیر کر کے یہاں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سلجوق کے بعد طغرل بیگ (م ۱۰۶۳) اور الپ ارسلان (م ۱۰۷۳) وغیرہ اس کے وارث ہوئے۔ تاریخ اسلام کا یہ عظیم الشان واقعہ ہے کہ سلجوق ترک جو ابتداءً وحشی قبائل تھے، انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور ۲۰۰ سال سے زیادہ مدت تک اسلام کی پاسبانی کی۔ انھوں نے شیعہ سنی لڑائیوں کو ختم کرکے اسلامی دنیا میں اتحاد پیدا کیا۔ انھوں نے بڑی بڑی مسجدیں اور مدرسے بنائے۔ انھوں نے اسلام کے خلاف عیسائی حملوں کا طاقت ور دفاع کیا۔

ہماری تاریخی کتابوں میں سلاجقہ کے اس قسم کے کارنامے بہت ملیں گے مگر یہ کتابیں اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں کہ سلجوق ترکوں نے کس طرح اور کس مرحلہ پر اسلام قبول کیا۔ اسلام کی مدوّن تاریخ کا یہ عظیم خلا ہے کہ اس میں جنگی واقعات اور سیاسی فتوحات کی داستانیں تو نہایت تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ مگر یہ کتابیں اس عظیم تر فتح کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں کہ اسلام نے کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ اور کس طرح قومیں کی قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اسلامی تاریخ کی موجودہ کتابیں "دولت سلجوقیہ" کی تفصیلات بتاتی ہیں مگر وہ "اسلام سلجوقیہ" کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ نہیں کرتیں۔

پورے اسلامی لٹریچر میں غالباً تاریخ دعوت کے موضوع پر ایک ہی قابلِ ذکر کتاب لکھی گئی ہے اور اس کتاب کے مصنف کا نام ٹی ڈبلیو آرنلڈ ہے۔ پروفیسر آرنلڈ مذکورہ واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet,—the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,—and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p. 2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیرؤوں کے گردن پر رکھ دیئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں منگولوں نے۔ مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

مغل تاتاریوں کا قبول اسلام

قدیم زمانہ میں ترکستان (روس) اور منگولیا (چین) کے علاقے میں کچھ قبائل آباد تھے جن کو ترک کہا جاتا تھا۔ ان کا ایک سردار چنگیز خاں (۱۱۶۲ - ۱۲۲۷) تھا۔ یہ غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا۔ وہ ۲۰ ہزار جنگجو افراد کو جمع کر کے اپنے علاقہ سے نکلا اور فتوحات کرتا ہوا چین سے ایران تک پہونچ گیا۔

اس کے بعد یہ قبائل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہلاکو خاں (۱۲۱۷ - ۱۲۶۵) اٹھا۔ اس نے اسلامی سلطنت کو برباد کرنے کے بارہ میں اپنے دادا (چنگیز خاں) کے منصوبہ کو مکمل کیا۔ اس نے دار السلطنت بغداد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور خلیفہ مستعصم کو قتل کر ڈالا۔ تاتاری سرداروں کو مسلم حکمراں (خوارزم شاہ) سے کچھ شکایت پہونچی تھی، اس بنا پر وہ غضب ناک ہو گیے اور مسلم سلطنت کو برباد کرنے کے درپے ہو گیے۔

یہ اسلامی تاریخ کا سب سے زیادہ خوف ناک واقعہ تھا۔ تاتاریوں کے ظلم و فساد کی بنا پر اسلامی دنیا میں ان کا اتنا زیادہ ہول طاری ہوا کہ کہا جانے لگا: اذا قیل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق (اگر کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گیے تو یقین مت کرنا)

یہ ہولناک مسئلہ بھی دعوت ہی کے ذریعہ حل ہوا۔ تاتاری جب مسلمانوں کا خون پوری طرح بہا چکے تو ان کے انتقام کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔ اب انھوں نے اپنی "رعایا" کے مذہب پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا۔ مختلف طریقوں سے تاتاریوں کا سابقہ مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تھا۔ بے شمار مسلمان مرد اور عورتیں گرفتار ہو کر ان کے گھروں پر پہنچیں، سڑکوں اور بازاروں میں مختلف اسباب کے تحت ایک تاتاری کی ملاقات ایک مسلمان سے ہوتی تھی۔ تاتاری حکمرانوں کے دربار میں مسلمان جاتے رہتے تھے۔ اس طرح مختلف طریقہ سے تاتاری لوگ اسلام کی تعلیمات سے آشنا ہوئے اور اس سے تعارف حاصل کیا۔

اس کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اولاً ان کے حکمرانوں اور سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد عام تاتاریوں نے اس کی پیروی کی۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اسلام کی عمارت کو ڈھایا تھا

وہی دوبارہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے والے بن گیے۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم دعوتی واقعہ کی تفصیل پیش کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ فاتح نے مفتوح کے مذہب کو اختیار کرلیا:

> The conquerors have accepted the religion of the conquered.

پروفیسر فلپ ہٹی نے اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے:

> The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے۔

سب کچھ چھننے کے بعد بھی

دعوت ایک ایسی طاقت ہے جو اہل ایمان کے پاس اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب کہ ان کا سب کچھ ان سے چھن چکا ہو۔ اس کی ایک سبق آموز مثال وہ ہے جو افریقہ میں پائی جاتی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں دکھایا ہے کہ الجزائر کے بربری قبائل میں اسلام کس طرح پھیلا۔ ان قبائل میں کچھ لوگ عیسائی تھے اور زیادہ تر وہ لوگ تھے جو قدیم مشرکانہ مذہب پر قائم تھے۔

یہ لوگ پہاڑی علاقہ میں رہتے تھے اور پہاڑوں کے حصاروں میں بند تھے۔ قبائلی مزاج کے تحت وہ اپنی خودمختاری کے دل دادہ بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے عرصہ تک اپنے یہاں عربی عناصر کے داخلے کو کامیابی سے روکا، لہذا ان کو مسلمان بنانے میں بہت سی مشکلات حائل تھیں۔ اس سے پہلے قادریہ سلسلہ کی ایک خانقاہ (ساقیۃ الحمرا) کے صوفیوں نے ان کے یہاں ایک تبلیغی مشن قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر انھیں اس کام میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے درمیان اسلام کے لیے راستہ ہموار کرنے کا سہرا اندلسی مسلمانوں کے سر ہے جو سقوطِ غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے بعد اسپین سے نکال دیے گیے تھے، اور اس خانقاہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ خانقاہ کے شیخ نے دیکھا کہ یہ لوگ تبلیغ کے اس دشوار کام کے لیے بہت موزوں ہیں جس کے سرانجام دینے میں ان کے اپنے مریدوں کی کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس کام پر روانہ کرنے سے پہلے انھوں نے ان کو ان الفاظ میں مخاطب کیا:

"ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اسلام کی مشعل اُن ملکوں میں لے جائیں جو برکاتِ اسلام کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان بدقسمت قبائل کے ہاں نہ تو مدارس ہیں اور نہ کوئی شیخ ہے جو اُن کے بچوں کو اصولِ اخلاق اور محاسنِ اسلام کی تعلیم دے سکے۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح رہتے ہیں جن کو نہ خدا کا علم ہے، نہ دین کا۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس ناگوار صورتِ حال کی اصلاح کے لیے تمہاری دینی حمیّت اور تمہارے نورِ ایمان سے درخواست کروں تاکہ یہ کوہستانی لوگ اپنی قابلِ رحم جہالت کی دلدل میں غلطاں و پیچاں نہ رہیں اور ہمارے دین کی شاندار صداقتوں سے باخبر ہو جائیں۔ جاؤ اور ان کے ایمان کی بجھتی ہوئی آگ کو ہوا دو اور اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ روشن کرو۔ اپنے پہلے مذہب یعنی عیسائیت کی جس ضلالت سے وہ اب تک آلودہ ہیں، اس سے ان کو پاک کرو اور ان کو یہ سمجھاؤ کہ سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں عیسائیت کے برعکس میل کچیل اللہ تعالیٰ کی نظروں میں مقبول نہیں ہے۔ میں تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ تمہارے کام میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ لیکن تمہاری ناقابلِ تسخیر حمیّتِ اسلامی اور حرارتِ ایمانی خدا کے فضل و کرم سے تمام مشکلات پر غالب آئے گی۔ میرے بچو! جاؤ، اور اس بدنصیب قوم کو خدا اور اس کے رسول کی طرف دوبارہ لاؤ جو اس وقت جہالت اور کفر کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان کو نجات کا پیغام پہنچاؤ۔ خدا تمہارے شاملِ حال رہے اور تمہاری مدد فرمائے۔"

یہ مبلغ پانچ پانچ، چھ چھ کی جماعتوں میں مختلف اطراف میں روانہ ہوگیے۔ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور ہاتھ میں عصا لیے چل دیے اور انھوں نے پہاڑوں کے سنسان اور غیرآباد مقامات کا انتخاب کرکے وہاں کے غاروں میں چٹانوں کے درمیان خانقاہیں قائم کیں۔ قبائل کے درمیان ان کی پرہیزگاری اور عبادت گزاری کا چرچا ہونے لگا۔ چنانچہ یہ قبیلے جلد ہی ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنے لگے۔ ان مبلغوں نے آہستہ آہستہ اپنے علمِ طب اور صنعت و حرفت اور تمدن کے دوسرے فوائد کی بدولت بربری قبائل کے یہاں کافی اثر و رسوخ قائم کرلیا۔ حتیٰ کہ ہر خانقاہ اسلامی تعلیم و دعوت کا مرکز بن گئی۔ ان نو واردوں کے علم و فضل کی کشش سے بہت سے لوگ علم کی طلب میں ان کے گرد جمع ہوگیے۔ کچھ عرصہ بعد یہی طالب علم اپنے ابنائے وطن میں اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب بربری قبائل کے تمام علاقوں اور الجزائر کی تمام بستیوں میں پھیل

گیا (صفحہ ۲۹-۱۲۸)

جزائر ملایا میں اسلام

جنوب مشرقی ایشیا کے علاقہ میں ۲۰۰ ملین (۲۰ کرور) مسلمان ہیں۔ صرف انڈونیشیا میں ۱۲۰ ملین مسلمان ہیں۔ یہ تعداد کسی بھی دوسرے مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کا سب سے زیادہ اثر انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر صرف تبلیغی عمل کے ذریعہ مسلمان ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں کبھی بھی مسلمانوں کی طرف سے کوئی فوجی اقدام نہیں کیا گیا۔

اس علاقہ میں اسلام کا نمایاں ظہور ۱۳ ویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اور یہی وہ صدی ہے جس میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت پر زوال آیا۔ پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ جزائر ملایا کی تاریخ پچھلی چھ صدیوں میں اسلامی تاریخ کا نہایت دلچسپ باب پیش کرتی ہے۔ جہاں اسلام کی اشاعت تمام تر صرف تبلیغی کوششوں کے ذریعہ ہوئی (صفحہ ۳۶۷)

۱۳ ویں صدی وہ صدی ہے جب کہ اسپین میں اسلامی سلطنت پر زوال آیا۔ اور یہی وہ صدی ہے جب کہ اسلام جزائر ملایا میں فکری فتح حاصل کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کرافورڈ (Dr. Crawford) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بڑا عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ اسلامی مذہب عین اس وقت ایشیا میں بڑھ رہا تھا جب کہ وہ یورپ سے نکال دیا گیا تھا:

> It may be remarked as a singular co-incidence that the Mohammedan religion was extending itself thus in Asia at the very time it was expelled from Europe.

پروفیسر آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں کہ بعد کے سالوں میں اگرچہ اسلام کی عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی طاقت بہت گھٹ گئی تب بھی اس کی روحانی فتوحات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون میں غرق کر دیا، اور جب فرڈیننڈ نے ۱۲۳۶ میں مسلمانوں کو قرطبہ سے نکال دیا اور غرناطہ کے مسلم سلطان نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا اس وقت اسلام سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں فاتحانہ اقدام کر رہا تھا۔ سیاسی انحطاط کے لمحات میں اسلام نے

اپنی بعض شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں (صفحہ ۲)

وان لیر (Van Lear) نے لکھا ہے کہ جو شخص بھی انڈونیشیا کی تاریخ میں داخل ہوتا ہے وہ ایک نامعلوم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی پُراسرار، معجزاتی طاقت کارفرما تھی جس نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ایک معجزاتی طاقت اس اشاعتِ اسلام کے پیچھے کام کر رہی تھی۔ مگر یہ کوئی پُراسرار طاقت نہ تھی بلکہ یہ اسلام کی دعوتی طاقت تھی۔ اسلام کی دعوتی طاقت کے اندر بلاشبہ اس بات کی معجزاتی صلاحیت چھپی ہوئی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے اور لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور کر دے۔

اس علاقے میں اسلام تاجروں کے ذریعہ داخل ہوا۔ تاجر کے اندر جو اخلاقیات ہوتی ہیں وہ داعی کی اخلاقیات ہیں۔ بہترین داعی وہی ہے جو تاجر کی طرح مدعو کے ساتھ معاملہ کرے۔ ایسا داعی کبھی اپنے مشن میں ناکام نہیں ہوسکتا۔

الکس ڈی ٹاکویل (Alex de Toqueville) نے لکھا ہے کہ تجارت متشدّدانہ جذبات کی قاتل ہے۔ تجارت اعتدال اور مفاہمت کو پسند کرتی ہے۔ تاجر آدمی اس معاملہ میں نہایت محتاط ہوتا ہے کہ وہ غصہ سے اعراض کرے۔ تاجر برداشت والا ہوتا ہے۔ تجارت ایک تاجر کے اندر یہی صفات پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا ہے کہ خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے:

God is making commerce His missionary.

اسلامی دعوت بیسویں صدی میں

بیسویں صدی مسلم تحریکوں کی صدی ہے۔ اس صدی میں مسلمانوں نے بے شمار بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ یہ تمام کی تمام سیاسی اور انقلابی تحریکیں تھیں۔ ان تحریکوں کو افراد اور وسائل کا اتنا زیادہ سرمایہ ملا جو کمیت کے اعتبار سے انھیں کامیاب بنانے کے لیے کافی تھا۔ مگر یہ تحریکیں اپنی تمام تر وسعت کے باوجود ناکام ہوکر رہ گئیں۔ ان سے امت کو کسی بھی قسم کا کوئی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ یہ تحریکیں طوفان کی طرح اٹھیں اور گرد و غبار کی طرح مٹ گئیں۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کا یہ حال سیاسی اعتبار سے تھا۔ مگر عین اسی صدی میں اسلام کی دعوتی طاقت ہر ملک کے لوگوں کو مسخر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگرچہ اسلامی دعوت کے میدان میں مسلم قائدین نے کوئی بھی قابلِ ذکر کوشش نہیں کی۔ مگر اسلام اپنی ذاتی قوت سے مسلسل لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا رہا ہے۔

پچھلے ایک سو سال کے اندر دنیا کے مختلف حصوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں ہم ان میں سے کچھ افراد کا نام بطور علامت درج کر رہے ہیں۔ اس فہرست سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح پچھلے سو سال کے اندر ہر زمانہ میں لوگ اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ ناموں کے سامنے ان کے قبولِ اسلام کا سن دیدیا گیا ہے :

1	Prof. Haroon Mustafa Leon	England	1822
2	Mohammad Alexander Russel Webb	U.S.A.	1890
3	Dr Nishikanta Chattopadhya	Hyderabad	1904
4	Lord Headly al-Farooq	England	1913
5	Dr William Burchell B. Pickard	England	1922
6	Sir Abdulla Archibald Hamilton	England	1923
7	Mohammad Leopold Asad	Austria	1926
8	Muhammad Marmaduke Pickthall	England	1935
9	Dr Abdul Karim Germanus	Hungary	1940
10	Dr ali Muhammad Mori	Japan	1947
11	Dr Ali Selman Benoist	France	1953
12	Dr R.L. Mellema	Holland	1955
13	Ibrahim Khalil Phillips	Egypt	1960
14	Prof. A.H.B. Hewett	U.S.A.	1966
15	Umar Bongo (President, Gabon)	Gabon	1973
16	Dr Roger Garoudy	France	1982
17	Moosa Fondi	Tanzania	1986
18	Abdullah Adiar	Madras	1987

یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے بطور خود اسلام کا مطالعہ کیا۔ ان کو اسلام کی تعلیمات نے متاثر کیا۔ ان میں سے کئی لوگوں نے اسلام کو براہِ راست سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھی۔ اور آخر کار اسلام قبول کر لیا ——— بیسویں صدی مسلمانوں کے لیے بحیثیت قوم ناکامی کی صدی ہے، مگر عین اسی صدی میں اسلام بحیثیت دین کے مسلسل آگے بڑھتا رہا ہے اور بڑھ رہا ہے۔

حرفِ آخر

اسلام کی پوری تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسلام عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی صورت میں انسان

کے سامنے لایا جائے تو وہ سیدھا آدمی کے دل میں اتر جاتا ہے، وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنی ذات میں تسخیری طاقت رکھتا ہے۔ وہ خود لوگوں کو متاثر ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

مگر اس طاقت کو بروئے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام اور اس کے مخاطب کے درمیان سے تمام نفسیاتی رکاوٹیں دور کر دی گئی ہوں۔ دور اوّل کے مسلمان اس راز کو جانتے تھے۔ چنانچہ وہ جن قوموں کے درمیان گیے اور جن ممالک کو فتح کیا، انھوں نے ان کے ساتھ کامل رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے ہر ایک کو اس کے مذہب کی پوری آزادی دی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انھوں نے لوگوں کے ساتھ قومی نزاع کھڑی کی یا مذہب کے معاملہ میں ان پر جبر کرنا شروع کیا تو ان کے اندر ضد کی نفسیات پیدا ہو جائے گی۔ ضد کی بنا پر وہ ایک ماننے والی چیز کو بھی ماننے سے انکار کر دیں گے۔

مشہور انگریز مورخ ہنری ٹامس بکل (۱۸۶۲-۱۸۲۱) نے قدیم مسلمانوں کی اس حکمت اور تدبر کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسلامی مبلغ بے حد سمجھ دار اور دور اندیش ہیں:

The Mahometan missionaries are very judicious (p. 409).

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام (*The Preaching of Islam*) میں اس کے مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ دور اول کے مسلمانوں نے ہر جگہ مکمل مذہبی رواداری کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے باوجود کبھی غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی جھگڑے نہیں کھڑے کیے۔ اور یہ بہت بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر دور قدیم کی آباد دنیا کا بہت بڑا حصہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گیا۔

اسلام کی یہ دعوتی قوت آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے، بشرطیکہ موجودہ مسلمان وہ تمام قومی نزاعات ختم کر دیں جو وہ ہر ملک میں اپنے غیر مسلم ہمسایوں سے چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ قومی نزاعات جن کو غلطی سے "جہاد" کا نام دیدیا گیا ہے، اسلام کی دعوتی قوت کے ظہور میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ جس دن یہ نزاعات ختم ہوں گے، اسی دن اسلام کا دعوتی سیلاب موجزن ہو جائے گا اور اس وقت تک نہ تھمے گا جب تک وہ اپنی آخری حد کو نہ پہونچ جائے۔

ہر انسانی گروہ کا ایک نظامِ عقائد ہوتا ہے اور ایک اس کا نظامِ اقتدار۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان نظامِ اقتدار کے اعتبار سے دوسری قوموں سے پیچھے ہو گیے ہیں۔ لیکن نظامِ عقائد کے اعتبار سے آج بھی وہ تمام قوموں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مگر مسلمانوں کے قائدین ساری دنیا میں یہ کر رہے ہیں کہ وہ نظامِ اقتدار کے میدان میں دوسری قوموں سے ٹکرا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے حصہ میں شکست اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں آرہا ہے۔ اگر وہ اس بے فائدہ ٹکراؤ کو ختم کر دیں اور نظامِ عقائد کے میدان میں دوسری قوموں کو اپنا مخاطب بنائیں تو بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ان کی شکست کی تاریخ فتح کی تاریخ میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اسلام کو فکری طاقت کی حیثیت سے اٹھائیے۔ اِس کے بعد وہ فکری اعتبار سے بھی دنیا پر غالب آجائے گا اور نتیجۃً دوسرے تمام اعتبارات سے بھی۔

ایک شخص کوالیفائڈ ڈاکٹر ہو۔ مگر وہ ڈاکٹری کرنے کے بجائے داداگیری کرے۔ وہ جلسے جلوس کی دھوم مچائے تو اس کے تمام جاننے والے کہیں گے کہ تم یہ کیسی نادانی کر رہے ہو۔ تم کو پریکٹس کرکے باعزت زندگی گزارنا چاہیے، تمہارے موجودہ مشاغل تو وقت اور قوت کو برباد کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی حال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان اصلاً ایک داعی گروہ ہیں۔ ان کے پاس وہ سچائی ہے جو کسی دوسرے کے پاس نہیں۔ تجارتی اصطلاح میں، انھیں مذہب کے میدان میں ایک قسم کی اجارہ داری (Monopoly) حاصل ہے۔ تمام اہل مذاہب میں وہ تنہا گروہ ہیں جن کے پاس بے آمیز مذہبی صداقت موجود ہے۔ جن کا مذہب پورے معنوں میں تاریخی مذہب ہے۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب غیر معتبر روایات کا مجموعہ ہیں، اسلام کے سوا کسی بھی دوسرے مذہب کو تاریخ کی بنیاد حاصل نہیں۔

اس اعتبار سے مسلمانوں کے لیے اہم ترین کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے مذہب کو لے کر اٹھیں۔ لیکن موجودہ زمانہ کے مسلمان سب کچھ کر رہے ہیں، مگر اسی ایک کام سے انھیں کوئی رغبت نہیں۔ مسلم ملکوں میں ان کا حال یہ ہے کہ اپنے حکمرانوں سے سیاسی لڑائیاں کرکے انھوں نے غیر ضروری طور پر ان کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً تمام مسلم ملکوں میں اسلامی دعوت کے مواقع برباد ہو کر

رہ گیے ہیں۔ اور اس کے تمام تر ذمہ دار وہ نادان مسلم رہنما ہیں جنھوں نے اسلام کو حکمرانوں سے ٹکراؤ کا عنوان بنایا اور اسلام کو مسلم حکمرانوں کے لیے سیاسی خطرہ کی حیثیت دے کر انھیں غیر ضروری طور پر اسلامی تحریکوں کا دشمن بنادیا۔

دوسرا معاملہ ان ملکوں کا ہے جہاں مسلمان تعداد کے اعتبار سے اقلیت میں ہیں۔ یہاں کے مسلم رہنما بھی عملاً وہی کر رہے ہیں جو مسلم ملکوں کے مسلم رہنما کر رہے ہیں۔ دونوں جگہ یکساں طور پر بے فائدہ لڑائی جاری ہے اور ان لڑائیوں نے مواقع دعوت کو برباد کرکے رکھ دیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مسلم ملکوں میں اسلام کی سیاسی حیثیت کو منوانے کی لڑائی ہو رہی ہے اور دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کی قومی حیثیت کو منوانے کی۔

یہ دونوں ہی قسم کی تحریکیں بلاشبہ باطل ہیں۔ اور اس کا سب سے بڑا عملی ثبوت یہ ہے کہ افراد اور وسائل کی بے انتہا مقدار حاصل ہونے کے باوجود دونوں ہی قسم کی تحریکیں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہو کہ تم پہاڑوں اور سمندروں کو اپنی پشت پر کھڑا کردو، تب بھی ہم تم کو ناکامی کے سوا کسی اور انجام تک پہنچنے نہ دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کرنے کا صرف ایک ہی کام ہے۔ اور وہ دعوت الی اللہ ہے۔ ان کی دنیا کی کامیابی اور آخرت کی نجات دونوں اسی ایک کام سے وابستہ ہیں۔ یہی وہ کام ہے جو ابدی طور پہ خدا نے ان کے لیے مقدر کردیا ہے۔ اگر وہ اس کام کے لیے اٹھیں تو وہ خدا کی رحمتوں کا سب سے زیادہ حصہ پانے کے حقدار ٹھہریں گے۔ اور اگر وہ اس کام کے لیے نہ اٹھیں تو شدید اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائیں گے، اسلام کے نام پر ان کے موجودہ ہنگامے ان کو خدا کی پکڑ سے بچانے والے نہیں بن سکتے۔

میدانِ عمل

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کا پرانا قاری ہوں اور اس کو پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے ایک معاملہ میں آپ سے اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ آپ مسلمانوں کو پسپائی کا سبق دیتے ہیں۔ انھوں نے چند "مفکرین اسلام" کا نام لےکر کہا کہ ان کو دیکھئے، وہ ہمیشہ اقدام کی باتیں کرتے ہیں۔ مسلمان پیغمبر اعظم کی امت ہیں، وہ پسپائی کے پیغام کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد انھوں نے فخر کے ساتھ فارسی کا مشہور مقولہ دہرایا:

کیش مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں

میں نے کہا کہ میرے اور مذکورہ مفکرین کے درمیان یہ فرق نہیں ہے کہ میں پسپائی کی بات کرتا ہوں، اور وہ لوگ اقدام کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی اقدام کی بات کرتے ہیں۔ جو فرق ہے وہ اس معاملہ میں ہے کہ اس اقدام کا میدان کیا ہو۔ وہ لوگ جنگ اور ٹکراؤ کے میدان میں اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں اور میں دعوت اور تبلیغ کے میدان میں اقدام کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ بالفاظ دیگر، دوسرے لوگ شمشیری اقدام کے مبلغ ہیں اور میں نظریاتی اقدام کا مبلغ ہوں۔ میرا اور ان کا فرق میدانِ اقدام کے بارہ میں ہے نہ کہ نفسِ اقدام کے بارہ میں۔

اقدام کسی اندھادھند کارروائی کا نام نہیں، نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خواہ مخواہ کسی چٹان پر سر پٹک کر اپنی جان دے دے۔ اقدام ایک منصوبہ بند عمل کا نام ہے۔ ایک حقیقی اقدام کے لئے وسیع علم اور زبردست ذہانت درکار ہے۔ اقدام ہمیشہ کسی فریق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اس کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ پیشگی جائزہ لےکر معلوم کیا جائے کہ حالات کی موافقت کس کے ساتھ ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ فریق ثانی کے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کریں:

To contest on another man's ground.

میدان مقابلہ اگر فریق ثانی کے حق میں ہو تو ایسی حالت میں فریق ثانی سے ٹکراؤ چھیڑنا اپنے آپ کو جان بوجھ کر شکست کی طرف لے جانا ہے۔ جب ایسا ہو تو فریق اول کو چاہئے کہ وہ حکیمانہ تدبیر سے مقابلہ کو اس میدان میں لے آئے جہاں وہ فریق ثانی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن رکھتا ہو

To bring one's enemy to fight on the ground of one's own choice.

موجودہ زمانہ میں سید احمد شہید بریلوی سے لے کر اب تک، مسلمانوں نے بے شمار چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں اور تقریباً ہر بار انھیں یک طرفہ ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام برائے اقدام کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ وہ فریق ثانی کے اپنے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کو خود اپنے موافق میدان میں لایا جائے اور پھر اس سے مقابلہ کیا جائے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک مثال دوں گا۔

ہندستان کے مسلم لیڈر عام طور پر اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کے لئے انھوں نے برابر کی قربانیاں دیں۔ مگر جب ہندستان آزاد ہوا تو انھیں اس میں برابر کا حصہ نہیں ملا۔ ان سے ہر جگہ "امتیاز" کا سلوک کیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ شکایت بے معنی ہے۔ یہ مسلم لیڈروں کے فکری افلاس کو بتاتا ہے۔ انھوں نے اصل معاملہ کو نہ ماضی میں جانا، اور نہ آج وہ اس کو جانتے ہیں۔

مسلم رہنما اس بات کو نہیں جانتے کہ اصل مسئلہ آزادی کے لئے قربانی دینے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب آزادی آئے گی تو اس کی شکل کیا ہوگی۔ دور جدید میں یہی ہونا تھا کہ آزادی جمہوریت کے روپ میں آئے۔ مگر مسلم رہنماؤں کا ذہن ماضی میں اتنا زیادہ اٹکا ہوا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آزادی جب آئے گی تو وہ "مغل دور" کی واپسی کے ہم معنی ہوگی۔

اس بات کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی آپس میں دوست تھے۔ ایک بار دونوں نے طے کیا کہ وہ آپس میں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان سارس لایا اور کچھ سامان لومڑی، اور دونوں نے مل کر کھیر پکائی۔ جب کھیر تیار ہوگئی اور وہ وقت آیا کہ اس کو کھایا جائے تو لومڑی نے ایک ہوشیاری کی۔ کھیر کو رکھنے کے لئے وہ ایک تشت لے آئی۔ کھیر جب تشت میں رکھی گئی تو وہ زیادہ تر لومڑی کے حصہ میں آگئی۔ لومڑی نے خوب سیر ہوکر کھایا۔ دوسری طرف سارس اپنی لمبی چونچ ادھر ادھر مارتا رہا مگر کھیر کی بہت کم مقدار اس کے حصہ میں آسکی۔ وہ کھیر پکانے میں شریک تھا، مگر وہ کھیر کھانے میں شریک نہ ہوسکا۔

اب سارس نے سوچا کہ لومڑی نے تو مجھ کو بیوقوف بنا دیا۔ اس نے سوچ کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ہم لوگ پھر ایک مرتبہ مل کر کھیر پکائیں۔ لومڑی راضی ہو گئی۔ دونوں سامان لائے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب جب کھیر کو برتن میں رکھنے کا مرحلہ آیا تو سارس نے فوراً ایک صراحی پیش کر دی۔ چنانچہ کھیر سب کی سب صراحی کے اندر رکھ دی گئی۔ اب سارس نے اپنی لمبی چونچ صراحی کے اندر ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اس بار معاملہ الٹا ہوا۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھالی، لومڑی کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ اصل مسئلہ مشترکہ کھیر پکانے کا نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ کھیر تیار ہو کر کس قسم کے برتن میں رکھی جائے گی۔ اگر وہ تشت میں رکھی جانے والی ہو تو وہ لومڑی کے حصہ میں چلی جائے گی اور اگر وہ صراحی میں رکھی جائے تو وہ سارس کو ملے گی، آدمی کی عقلمندی یہ ہے کہ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کرے۔

یہ فرق کیوں

انیسویں صدی کے نصف اول میں انگریز ایک طرف سیاسی اعتبار سے ہندستان میں غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ دوسری طرف عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر رہی تھیں۔ ہمارے علماء ان دونوں خطرات کے مقابلہ کے لئے اٹھے اور اس کے لئے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ مگر دونوں محاذوں کا انجام ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ سیاسی محاذ پر بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ دوسری طرف مشنری محاذ پر نسبتاً کمتر قربانی کے باوجود انھیں مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔

دونوں محاذوں کے اس فرق کی علامت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۸ - ۱۲۳۳ھ) ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے زمانہ میں یورپ سے پادری فنڈر (Funder) آیا اور اس نے ہندستان کے مسلمانوں میں نہایت طاقت کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے، ان میں ایک ممتاز نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا تھا۔ انھوں نے "اظہار الحق" اور دوسری کتابیں لکھیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد سے فنڈر سے مناظرہ کیا۔ آگرہ کے مشہور مناظرہ (۱۰ - ۱۱ اپریل ۱۸۵۴) میں انھوں نے پادری فنڈر کو ایسی شکست دی کہ اس

کے بعد وہ ہندستان سے بھاگ کھڑا ہوا اور قسطنطنیہ (ترکی) میں جا کر پناہ لی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ۱۸۵۷ میں شاملی کے میدان میں علماء نے انگریزی فوج کا مسلح مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی شریک تھے۔ اس وقت ہمارے علماء کے پاس روایتی قسم کے دستی ہتھیار تھے، اور انگریزی فوج کے پاس جدید قسم کے دور مار ہتھیار۔ اس مقابلہ میں علماء کی جماعت کو، زبردست قربانی کے باوجود، مکمل شکست ہوئی۔ اس کے بعد علماء کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور ان کو پھانسی پر چڑھایا جانے لگا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ہندستان سے مکہ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مہیب جنگلوں اور خطرناک راستوں پر پیدل چلتے ہوئے اور ناقابل بیان تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہوئے سورت کی بندرگاہ پر پہنچے۔ وہاں سے سمندری جہاز پر سوار ہو کر جدہ چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں مقیم رہے (معارف مئی ۱۹۸۸)

ان دونوں واقعات کو تقابلی طور پر دیکھئے۔ ایک جگہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مقابلہ میں انگریز پادری فنڈر میدان چھوڑ کر بھاگا تھا، دوسری جگہ "پادری فنڈر" کے مقابلہ میں خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اس فرق کی وجہ میدانِ مقابلہ کا فرق ہے۔ آگرہ میں دونوں کے درمیان مقابلہ مناظرہ (فکری اور نظریاتی میدان میں) ہوا تھا۔ فکری اور نظریاتی میدان میں اسلام ممتاز طور پر ہر ایک کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے۔ اس لئے فریق ثانی کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کے برعکس شاملی میں جو مقابلہ ہوا وہ فوج اور ہتھیار کے میدان میں تھا۔ اس میدان میں ہمارے علماء فریق ثانی کے مقابلہ میں فیصلہ کن طور پر پسماندہ تھے۔ ہمارے علماء کے پاس زیادہ تر دستی ہتھیار تھے، جب کہ فریق ثانی دور مار ہتھیاروں سے مسلح تھا، یہی فرق تھا جس کی بنا پر یہاں علماء کو مکمل ناکامی ہوئی۔

میں کہوں گا کہ آپ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم میدان مقابلہ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم فریق ثانی کو اس میدان میں لانا چاہتے ہیں جہاں وہ ناموافق پوزیشن میں ہو اور ہم موافق پوزیشن میں۔ ہمارے اور دوسرے لوگوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس میدان میں متحرک کرنا چاہتے ہیں جہاں ان کا حریف بھاگے۔ اور دوسرے لوگ مسلمانوں کو وہاں ٹکرانا چاہتے ہیں جہاں بالآخر خود ان کو بھاگنا پڑے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا واقعہ، علامتی طور پر ، ہماری پوری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہی ہوا۔ اور اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ مسلمان فریق ثانی سے اس کے موافق میدان میں ٹکراؤ کرتے ہیں اور ہر بار شدید ترین شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔

دین کا استحکام

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کی تکمیل کر دی اور قیامت تک کے لئے اسلام کو مقبول دین کی حیثیت سے پسند کر لیا (المائدہ ۳) اس اعلان کے ساتھ مزید ارشاد ہوا ہے:

الیومَ یئسَ الذین کفروا مِن دینکم آج انکار کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے
فَلا تخشَوھم واخشَوْنِ (المائدہ ۳) مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔

قرآن کی یہ آیت ذی الحجہ ۹ھ میں اتری۔ اس کے اترنے کے تقریباً ڈھائی مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ اس آیت میں الیوم (آج) کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دو مذہبی دوروں کے درمیان حد فاصل ہے۔ قرآن کے بعد مذہب کی دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ پہلے اگر "تخشوھم" کا دور تھا، تو اب "اخشونی" کا دور ہے۔ پہلے اگر غلبہ کفر کا دور تھا، تو اب غلبۂ دین کا دور ہے۔ قرآن کی تکمیل نے اب خدا کے دین کو آخری طور پر مستحکم کر دیا ہے۔ اس آیت سے صراحتہً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اب تشویش اور اندیشہ کی چیز یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر خشیت الٰہی (خدا کا خوف) باقی نہ رہے۔ خارجی دشمنوں کی طاقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، اہل ایمان کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرتی۔

دین کے غلبہ و استحکام سے مراد اس کا سیاسی غلبہ و استحکام نہیں۔ سیاسی غلبہ اس دنیا میں کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ اگر ایک مقام پر پایا جاتا ہے تو دوسرے مقام پر نہیں پایا جاتا۔ اس لئے یہاں غلبہ سے وہ غلبہ مراد لینا ہو گا جو ہر وقت اور ہر جگہ پوری طرح حاصل رہے۔ جس میں کبھی انقطاع ممکن نہ ہو۔ اس قسم کا جاری اور مستمر غلبہ صرف فکر اور نظریہ سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں غلبہ سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یہ قرآن اور دین کامل کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو ہر حال میں حاصل رہے گی۔ حتی کہ کسی مقام پر کوئی ایک شخص حامل قرآن ہو تو وہ بھی اس سے

خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق میں ایسے حالات پیدا کر دئے گئے کہ وہ قیامت تک اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے۔ قرآن کے ذریعہ دنیا میں ایسا انقلاب لایا گیا جس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے مذہبی جبر کا ماحول ختم ہوگیا اور آدمی کو آزادانہ طور پر اظہار خیال کا حق حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اس انقلاب کے نتیجہ میں علمی ترقیوں کا دروازہ کھلا جس نے دین خداوندی کی صداقت کو خود انسانی علم کے معیار پر مبرہن اور مدلل کر دیا۔ جب یہ سب ہوجائے تو اس کے بعد دین الٰہی کی طاقت بے پناہ ہوجاتی ہے۔ اب خدا کا دین ایک محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ اور جب خدا کا دین محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کرلے تو اس کی طاقت اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی اس کو زیر نہ کرسکے۔

سید احمد شہید بریلوی

اس سلسلہ میں ایک مثال سید احمد شہید بریلوی اور ان کے ساتھیوں کی ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے ربع ثانی میں پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ اس میں انھیں مکمل شکست ہوئی۔ ۶ مئی ۱۹۳۱ کو بالاکوٹ میں سید صاحب اور ان کے اکثر ساتھیوں کو سکھ فوج نے ہلاک کر دیا۔ زبردست جانی اور مالی نقصان کے باوجود اس جنگ کا مطلق کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ البتہ یہ نقصان ہوا کہ مغل دور میں گرو گووند سنگھ، گرو ارجن سنگھ اور گرو تیغ بہادر سنگھ کے قتل سے سکھوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

سید احمد شہید بریلوی کا اقدام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ناقابل فہم حد تک غیر دانشمندانہ تھا۔ اس کی سلطنت تبت سے لے کر درہ خیبر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں کی فوجی طاقت میں ناقابل عبور حد تک فرق پایا جارہا تھا۔ سید صاحب کے پاس غیر تربیت یافتہ مریدین کی ایک بھیڑ تھی جو کہ صرف روایتی ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھی، بلکہ وہ زیادہ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ حتیٰ کہ اس کے پاس توپیں بھی موجود تھیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اس واقعہ سے بے خبر تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نہایت مدبر حکمراں ہے۔ فرانس کے ایک سیاح وکٹر جاکو ماں (Victor Jacquemont) نے اس کو چھوٹا

نپولین (Bonaparte in miniature) لکھا ہے۔ اسی طرح دوسرے مورخوں اور سیاحوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تدبر اور حکمرانی کی صلاحیت کا غیر معمولی الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس کے اسی تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے فوج کی تنظیم جدید کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ۱۸۲۰ء میں اس نے اپنی فوج کو یورپ کے معیار پر منظم کرنا شروع کیا۔ اس نے یورپ کے ۵۰ فوجی افسروں کو اپنی فوج کی تربیت پر مقرر کیا، ان میں اکثریت ان فوجی افسروں کی تھی جو نپولین بونا پارٹ کی فوج میں کام کر چکے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ کی اس فوج نے ۱۸۳۱ میں سرحدی قبائل کی ایک شورش کو کامیابی کے ساتھ کچل دیا جو ایک جنونی مسلمان سید احمد بریلوی، کے نعرۂ جہاد کے تحت ابھری تھی:

In 1831 it successfully quelled a rising of the Frontier tribesmen roused to a holy war (Jihad) by the Muslim fanatic Sayyed Ahmad (15/507).

سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے اوپر شمشیری قوت کو استعمال کیا۔ مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ زبردست نقصان اور قربانی کے باوجود وہ ایک فی صد کے درجہ میں بھی کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ دوسری طرف انھیں سکھوں کو اسلام کی دعوتی طاقت مسلسل مسخر کرتی رہی ہے۔

گرو نانک اسلام کی تعلیمات سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے توحید اور رسالت محمدی کے عقیدہ کو اپنی مذہبی کتاب (گرو گرنتھ صاحب) میں شامل کیا۔ امرتسر کے سورن مندر کی بنیاد مسلمان بزرگ میاں میر سے رکھوائی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں کچھ علماء گئے تو اس نے تخت سے اتر کر اپنی لمبی داڑھی سے ان کے جوتے صاف کئے۔ اس کے علاوہ بہت سے سکھ ہیں جنھوں نے باقاعدہ کلمۂ توحید کا اقرار کر کے اسلام قبول کر لیا۔ انھیں میں سے ایک مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ - ۱۹۴۴) تھے۔ وہ سندھ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بعد کو انھوں نے اسلامی کتابیں پڑھیں اور اسلام سے متاثر ہو کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ وغیرہ۔

حدیبیہ کی مثال

روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے بعد کے دور میں تابعین سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو، مگر ہم لوگ واقعہ حدیبیہ کو فتح قرار دیتے تھے (عن البراء قال: تعدّون الفتح

فتح مكة ۔ ونحن نعدُّ الفتحَ يومَ الحديبية ، سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۳۲۴)

فتح مکہ (۸ھ) کھلا ہوا فتح کا واقعہ تھا۔ جب کہ حدیبیہ بظاہر شکست اور پسپائی کا واقعہ تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیا۔ آپ کو اپنے تمام ساتھیوں سمیت عمرہ ادا کئے بغیر راستہ ہی سے واپس آجانا پڑا۔ اس کے باوجود صحابہ کرام کے نزدیک فتح کا اصل واقعہ وہ تھا جو حدیبیہ میں پیش آیا نہ کہ وہ جب کہ مکہ میں فاتحانہ داخلہ ہوا۔

اصحاب رسول کا یہ نقطہ نظر بتاتا ہے کہ پسپائی بھی بہت بڑا اقدام ہے۔ بظاہر ایک شکست کے واقعہ میں فتح کا راز چھپا ہوتا ہے۔ واقعہ کا یہ پہلو بے حد اہم ہے، اور اس بنا پر حدیبیہ کے واقعہ کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ یکم ذی قعدہ ۶ھ کی تاریخ تھی اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا عمرہ کریں۔ قریش پچھلے ۶ سال سے مسلمانوں کے لئے زیارتِ کعبہ کا راستہ بند کئے ہوئے تھے۔ اس مدت میں کوئی مسلمان نہ حج کرسکتا تھا اور نہ عمرہ۔ اس لئے جب انھوں نے سنا کہ ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آرہا ہے کہ وہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کرے تو وہ سخت غضبناک ہوگئے۔ ذی قعدہ کا مہینہ اگرچہ حرام مہینوں میں سے تھا۔ یہ مہینہ سیکڑوں سال سے کعبہ کی زیارت اور حج کے لئے محترم سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو یہ حق نہ تھا کہ باہر سے آنے والے کسی شخص کو زیارت کعبہ سے روکے۔ مگر قریش نے جاہلی عصبیت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ وہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دن کی مسافت طے کر کے عُسفان کے مقام پر پہنچے۔ یہاں آپ کی ملاقات بُسر بن سفیان الکعبی سے ہوئی جو کہ مکہ کی طرف سے آرہا تھا۔ اس نے بتایا کہ قریش کو آپ کے اس سفر کی خبر ہوگئی ہے۔ وہ مکہ سے نکل کر ذی طوی میں جمع ہوگئے ہیں۔ انھوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی ہیں (یعنی سخت غضب ناک ہیں) انھوں نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ ہرگز آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اور انھوں نے خالد بن ولید کو ۲۰۰ گھوڑ سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف روانہ کیا ہے تاکہ آپ سے مڈبھیڑ کریں (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث

صفحہ ۳۵۶)

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے اور اپنے لوگوں کو جہاد و قتال کی راہ میں لگا دیتے۔ مگر آپ نے اس کے بالکل برعکس عمل فرمایا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں کون شخص ہے جو ہم کو خالد کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے چلا کر آگے لے جائے (مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلىٰ طَرِيقٍ غَيرِ طَرِيقِهِم الَّتِي هُمْ بِهَا، صفحہ ۳۵۷)

عبد اللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ کام میں کروں گا۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے قافلہ کو لے کر روانہ ہوا۔ اس نے اس معروف راستہ کو چھوڑ دیا جس پر خالد بن ولید بڑھے ہوئے آ رہے تھے۔ اس کے بجائے وہ ایک اور سمت سے روانہ ہوئے۔ باقاعدہ راستہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سفر سخت دشواریوں کے ساتھ طے ہوا۔ حتیٰ کہ اس پر مشقت سفر پر بعض مسلمانوں کی زبان سے کلمۂ شکایت نکل گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: کہو کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کی طرف توبہ کرتے ہیں (قولوا نستغفر الله ونتوب اليه، ۳۵۷)

جس موقع پر یہ استغفار اور توبہ کرائی گئی اس کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ــــــ جب تم کو اپنے آپ پر مصیبت اٹھا کر ٹکراؤ سے بچنے کا حکم دیا گیا تو تم نے شکایت کا لفظ کیوں اپنی زبان سے نکالا۔ تم کو کامل رضامندی کے ساتھ اس خدائی منصوبہ پر چلنا چاہئے تھا۔ اب جب کہ اس معاملہ میں تم سے بے صبری کا اظہار ہوا ہے تو استغفار اور توبہ کے ذریعہ اس کی تلافی کرو۔

اصل یہ ہے کہ قریش کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر جنگ چھیڑنا چاہتے تھے مگر آپ نے ہر قیمت پر جنگ سے اعراض کیا۔ خالد بن ولید سواروں کا دستہ لے کر آپ کی طرف بڑھے تو آپ نے راستہ بدل دیا۔ خراش بن امیہ کو آپ نے سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ وہاں قریش نے ان کے اونٹ کو مار ڈالا۔ وہ خراش کو بھی قتل کر دینا چاہتے تھے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ کر واپس آگئے۔ قیام حدیبیہ کے زمانہ میں ایک بار مکہ کے پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور صحابہ کے پڑاؤ پر پتھر مارنا اور تیر برسانا

شروع کیا۔ انھوں نے آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ یہ بذات خود یہ معنی رکھتا تھا کہ آپ مشتعل ہوکر آمادۂ جنگ ہو جائیں۔ آخری مرحلہ میں جب معاہدۂ حدیبیہ کی شرطیں مقرر کی جانے لگیں تو انھوں نے یک طرفہ شرائط پر اصرار کیا جو تمام مسلمانوں کے لئے سخت اشتعال انگیز اور ناقابلِ برداشت تھا وغیرہ۔ مگر آپ برابر ٹکراؤ سے اعراض کرتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ پہنچ کر رک گئے۔ اس مقام کا موجودہ نام شُمیسی ہے اور مکہ سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہیں پر قریش کے نمائندوں سے گفتگو ہوئی اور وہ صلح طے پائی جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

حدیبیہ کے پورے واقعہ پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان ایک بلا اعلان مقابلہ جاری تھا۔ قریش کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کو میدان جنگ میں لے آئیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ہر ظلم کو سہتے ہوئے اور ان کی ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ قریش کو صلح کے میدان میں لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ردعمل اور جوابی کارروائی کا انداز اختیار فرماتے تو قریش کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا اور مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یک طرفہ صبر اور اعراض اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قریش کا خونی منصوبہ کامیاب نہ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصالحانہ منصوبہ کامیاب ہو جائے۔

یہ دراصل وہی تدبیر تھی جس کو جنگ کی اصطلاح میں (Ground of one's own choice) کہا جاتا ہے۔ یعنی حریف کو مقابلہ کے لئے اپنے موافق میدان میں لے آنا۔ اس وقت قریش کے لئے مقابلہ کا موافق میدان جنگ تھا کیوں کہ قریش جنگی طاقت میں واضح طور پر مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ دوسری طرف فکری اور نظریاتی میدان میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ قریش کی بت پرستی کے مقابلہ میں اسلام کی توحید ہر اعتبار سے فائق حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کے اور قریش کے درمیان مقابلہ کا میدان جنگ نہ بنے بلکہ آپ کا اور قریش کا مقابلہ فکری اور نظریاتی میدان میں منتقل ہو جائے۔

تاہم اس مقصد کو حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ

اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ حتی کہ قریش کی جارحیت کو بھی خاموشی کے ساتھ برداشت کریں۔ اور دوسری چیز یہ کہ قریش کی ہر شرط کو یک طرفہ طور پر منظور کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حدیبیہ میں آپ کے اور قریش کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اس میں تمام شرطیں یک طرفہ طور پر قریش کے حق میں تھیں۔ اس کے باوجود آپ نے ان تمام شرطوں کو اس لئے منظور کر لیا کہ اس کی رو سے قریش اگلے دس سال کے لئے اس بات کے پابند ہو جاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف براہ راست یا بالواسطہ جنگ نہیں کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کا معاہدۂ صلح کر کے مدینہ کے لئے واپس ہوئے تو راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی جس کی پہلی آیت یہ تھی : انا فتحنا لك فتحا مبينا (ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی) یعنی فریق ثانی مقابلہ کو اپنے موافق میدان (جنگ) کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس معاہدہ کے بعد فریق ثانی کے ساتھ تمہارا مقابلہ اس میدان (دعوت) میں آگیا جو واضح طور پر تمہارے موافق ہے۔

بعد کے حالات نے کامل طور پر اس اندازہ کی تصدیق کر دی۔ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ کے بعد مسلمانوں اور دیگر قبائل کے درمیان آزادانہ اختلاط شروع ہو گیا۔ توحید کی دعوت بلا روک ٹوک ہر طرف پھیلنے لگی۔ توحید کا پیغام جہاں بھی پہنچا اس نے شرک اور بت پرستی کے ذہن کو ہارنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے تقریباً بیس سال میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے اس سے بہت زیادہ لوگ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں مسلمان ہو گئے۔ اب اسلام کی عددی طاقت اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ قریش کے اندر مقابلہ کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ وہی قریش جنھوں نے ٦ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں صرف عمرہ کی غرض سے داخل ہونے پر پابندی لگا دی تھی، ٨ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف فاتحانہ کوچ کیا تو قریش کے سردار نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمدؐ سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔

صلح حدیبیہ، ایک لفظ میں، فریق ثانی سے مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر دعوت کے میدان میں لانا ہے۔ یہ اسلام کی حکمتِ بالغہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور اس مثال کا سب سے اعلیٰ نمونہ وہ ہے جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے عمل سے قائم فرمایا۔

وسیع تر میدان

ظاہری طور پر دیکھنے میں حدیبیہ کا واقعہ میدان مقابلہ سے واپسی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ چھوٹے مقابلہ سے ہٹ کر بڑے مقابلہ کی طرف جانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”حدیبیہ“ محدود میدان مقابلہ کو چھوڑ کر زیادہ وسیع میدان مقابلہ کی طرف اقدام تھا۔ اس اعتبار سے وہ بلاشبہ تدبیری حکمت (Strategy) کی ایک شاہکار مثال ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بے مشن آدمی نہ تھے۔ بلکہ آپ کا ایک عظیم الشان مشن تھا۔ اور صاحبِ مشن آدمی کے لئے پسپائی کا کوئی سوال نہیں۔ آپ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کو یہ پیغام دیتے تھے کہ وہ شرک کے بجائے توحید کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ مخلوق پرستی کے بجائے خالق پرستی، بے اصول زندگی کے بجائے بااصول زندگی، دنیا پسندی کے بجائے آخرت پسندی، مصنوعی طریقوں کے بجائے فطری طریقوں کو اختیار کرنے کے علم بردار تھے۔ آپ کے یہ افکار دنیا کے تمام افکار سے زیادہ طاقتور تھے۔ مگر مسلسل جنگی حالات نے آپ کے افکار کی اس طاقت کو ظاہر ہونے سے روک رکھا تھا۔

اس معاملہ کو ایک عام مثال کے ذریعہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک سائنسداں اور ایک نیگرو باکسر کا مقابلہ اگر باکنگ کے اکھاڑے میں ہو رہا ہو تو وہاں یقینی طور پر باکسر کا پلہ بھاری رہے گا لیکن اگر سائنس داں کسی حکمت سے مقابلہ کے میدان کو بدل دے اور باکسر کو باکنگ کے اکھاڑے سے نکال کر سائنٹفک بحث کی میز پر لے آئے تو یقینی طور پر صورت حال بدل جائے گی۔ پہلے اگر باکسر کا پلہ بھاری تھا تو اب سائنس داں کی جیت یقینی ہو جائے گی۔

قدیم عرب میں ہجرت کے بعد یہ صورت حال تھی کہ قریش کی ہٹ دھرمی نے ”جنگ“ کو مقابلہ کا میدان بنا دیا تھا۔ صلح حدیبیہ کی صورت میں جب دونوں فریقوں کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ (No-war pact) ہوا تو اس کے بعد مقابلہ کا میدان بدل گیا۔ اب میدانِ جنگ کے بجائے میدانِ افکار مقابلہ کا مقام قرار پایا۔ اس دوسرے میدان میں اہل اسلام واضح طور پر اپنے فریق کے مقابلہ میں فائق حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے نئے میدان میں آتے ہی اسلام کی فکری اور نظریاتی فتح کا سیلاب پھٹ پڑا۔ لوگ جوق در جوق مذہب توحید کے دائرے میں داخل ہو گئے۔

میز کی سطح پر آتے ہی "باکسر" کے مقابلہ میں "سائنس داں" کی جیت یقینی ہوگئی۔

حدیبیہ کے وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف جا رہے تھے تو آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سے بھی کم آدمی تھے۔ اس کے دو برس بعد آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف سفر کیا تو آپ کے ہمراہ دس ہزار آدمی تھے۔ چنانچہ جب آپ مکہ کے قریب پہنچے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ انسانوں کا سیلاب دیکھا تو مکہ کے سرداروں نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ گھروں میں بیٹھ جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمد سے لڑنے کی طاقت نہیں —— مکہ خون بہائے بغیر فتح ہوگیا اور اسی کے ساتھ ساری عرب قوم بھی۔

یہ مکمل طور پر ایک غیر خونی انقلاب تھا۔ مگر اس غیر خونی انقلاب کو وجود میں لانے کے لئے اس کے قائد کو خود خون ہونا پڑا۔ اس کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شرائط پر راضی ہوئے جو بظاہر انتہائی طور پر یک طرفہ شرائط تھیں۔ آپ کو آگے جانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ آپ کو فتح حاصل کرنے کے لئے شکست پر راضی ہونا پڑا۔ حتی کہ آپ کو اپنی حیثیت اصلی (رسول اللہ) کا لفظ کاغذ سے حذف کرنا پڑا تاکہ وہ دوبارہ زیادہ کامل طور پر عالمی نقشہ پر لکھا جائے۔

ضروری شرط

حریف سے اپنے موافق میدان میں مقابلہ کرنا، اس کے اوپر فتح حاصل کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ یہ تدبیر حریف کے مقابلہ میں کامیابی کو یقینی بنا دیتی ہے۔ مگر اس تدبیر کو استعمال کرنے کی ایک ضروری شرط ہے۔ لوگ چونکہ اس شرط کو پورا نہیں کر پاتے، اس لئے وہ اس کے فائدے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

یہ شرط، ایک لفظ میں، اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچانا ہے۔ جب بھی کسی سے مقابلہ پیش آتا ہے تو اس کی طرف سے طرح طرح کی مخالفانہ کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ اشتعال انگیز الفاظ سے لے کر عملی نقصانات تک ہر قسم کے تلخ تجربات سامنے آتے ہیں۔ اس وقت اگر آدمی بھڑک اٹھے تو وہ وقتی جوش کے ساتھ حریف سے وہاں ٹکرا جائے گا جہاں وہ کھڑا ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہو اور ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر مقابلہ کا منصوبہ بنائے تو وہ کوشش کرے گا کہ حریف کو اپنے موافق میدان میں لائے۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جان و مال کی بے پناہ قربانی کے باوجود ہر بار اپنے حریف سے

شکست کھارہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حریف کی طرف سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً بھڑک کر اس سے لڑ جاتے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ردعمل کے تحت کی جانے والی لڑائی کا انجام ہمیشہ شکست ہو، اور ردعمل سے اوپر اٹھ کر کئے جانے والے مقابلہ کا انجام ہمیشہ فتح کی صورت میں نکلے۔

جامد گروہ، توسیعی گروہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں حدیبیہ کا معاہدہ کرکے مدینہ کے لئے واپس ہوئے۔ ابھی آپ راستہ ہی میں تھے کہ یہ آیت اتری: انا فتحنا لك فتحا مبینا (الفتح ۱) یعنی ہم نے تم کو تمہارے مخالفوں کے اوپر کھلی فتح دے دی۔ حدیبیہ کی صلح بظاہر فریق ثانی کی شرطوں پر کی گئی تھی، اس لئے جب یہ آیت اتری تو آپ کے اصحاب نے طرح طرح کے سوالات کئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:

قال رجل من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ	اصحاب رسول میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا
علیہ وسلم ای رسول اللہ اوفتح ھو	کے رسول، کیا وہ فتح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
قال صلی اللہ علیہ وسلم اِی والذی	وسلم نے فرمایا، ہاں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ
نفس محمد بیدہ انہ لفتح	میں محمد کی جان ہے، بے شک وہ فتح ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، ۱۸۳)

متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ انھوں نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو مگر ہم لوگ حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے (صفحہ ۱۸۳) اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ نے اہل اسلام کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور اہل شرک محض جامد گروہ بن کر رہ گئے۔ حدیبیہ کے معاہدہ سے پہلے دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ اور مڈبھیڑ کی فضا تھی۔ اب تک دونوں کی ملاقات صرف میدان مقابلہ میں ہوتی تھی، صلح کے بعد میدانِ دعوت میں دونوں کی ملاقات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ شرک جہاں تھا وہیں رہا۔ مگر اسلام ایسی پوزیشن میں آگیا جہاں سے وہ لوگوں کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ جامد گروہ ہو اور دوسرا گروہ توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کر لے

تو اس کے فوراً بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہ کہ جامد گروہ گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ اور توسیعی گروہ مسلسل بڑھنے لگے گا۔ اور جہاں اس قسم کا عمل شروع ہو جائے وہاں بالآخر جو نتیجہ نکلے گا وہ وہی ہوگا جو عرب میں ہوا ——— شرک کو ماننے والے دھیرے دھیرے اسلام میں داخل ہو گئے۔ چند سال بعد ہی دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جہاں دو متقابل گروہ تھے وہاں اب صرف ایک گروہ باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ اہلِ اسلام کا گروہ ہے۔

پہاڑ کے اوپر سے پانی کا ایک چشمہ جاری ہوا۔ وہ آگے کی طرف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس کے راستہ میں ایک چٹان آگئی۔ اب چشمہ کیا کرے گا۔ وہ فوراً دائیں یا بائیں مڑ کر اپنا راستہ بنا لے گا۔ چٹان ایک جامد چیز ہے، وہ جہاں ہے وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اب اگر چشمہ صرف اس سے ٹکراتا رہے تو اس کا سفر رک جائے گا، اس کے بعد چشمہ کا معاملہ بھی جمود کا معاملہ بن جائے گا۔ جس طرح چٹان کا معاملہ جمود کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چشمہ ٹکراؤ پر قائم رہنے کے بجائے اعراض کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ وہ چٹان کو جمود کی دنیا میں چھوڑ کر اپنے لئے توسیع کی دنیا حاصل کر لیتا ہے۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے، وہ ایک پھیلنے والی اور بڑھنے والی حقیقت ہے۔ وہ ایک توسیعی پروگرام ہے۔ اس کے مقابلہ میں غیر اسلام ایک جامد چیز ہے۔ وہ پھیلنے اور آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کے ٹکراؤ کے وقت اگر اسلام یہ کہے کہ وہ وہیں ٹھہر کر مقابلہ شروع کر دے تو وہ بھی اسی طرح جامد بن جائے گا جس طرح غیر اسلام جامد ہے۔ وہ اپنی توسیعی حیثیت کو کھو دے گا جو اس کی اصل حیثیت اور اس کی اصل طاقت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت میں اعراض (Avoidance) کے اصول کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں مسلسل اسی اصول اعراض پر عمل فرمایا ہے۔ مکہ کے ابتدائی ۱۳ سال میں مشرکین کے مسلسل ظلم کے باوجود آپ نے ان سے ٹکراؤ نہیں کیا، یہ یہی اعراض تھا۔ حالات زیادہ سخت ہو گئے تو آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے، یہ بھی اعراض تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر زیارت کعبہ میں رکاوٹ ڈالی گئی تو آپ اصرار کئے بغیر درمیان سے واپس آگئے، یہ بھی اعراض تھا۔

اسی طرح ٹکراؤ کے موقع پر آپ نے آخری امکان کی حد تک اعراض کیا ہے۔ کیوں کہ اعراض نہ کرنا گویا اپنے آپ کو فریق ثانی کی طرح جامد گروہ بنا لینے کے ہم معنی تھا، جب کہ اعراض کرکے آپ

نے اپنے کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کرنے ہی کا دوسرا نام غلبہ اور کامیابی ہے۔

تاریخ کا تجربہ

اسلام دین کامل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام میں اگر ایک طرف نظری طور پر تمام ضروری باتیں بتا دی گئی ہیں، تو اسی کے ساتھ اسلام کی تاریخ میں ہر قسم کی واضح مثالیں بھی قائم کر دی گئی ہیں، تاکہ لوگوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک مثال وہ ہے جو شمشیر کی طاقت اور دعوت کی طاقت کے فرق سے تعلق رکھتی ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی ذات اسلام کی تاریخ میں "شمشیر" کی طاقت کا نشان ہے۔ انھوں نے مغرب کی عیسائی طاقتوں کو حطین (شمالی فلسطین) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ اور دو سو سالہ صلیبی جنگ کا خاتمہ کیا۔ وہ ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ کو دوبارہ یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ جو ۸۸ سال سے عیسائیوں کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کا انتقال ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو ہوا۔ اس جنگی ہیرو کے انتقال کے صرف ۲۵ سال بعد تاریخ دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ چنگیز خاں کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ ۱۲۱۸ء میں وہ ۲۰ ہزار وحشی قبائل کو لے کر مسلم سلطنت (خوارزم) پر حملہ کر دے۔ چنگیز خاں اگرچہ جلد ہی گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ مگر اس کے جانشین تاتاریوں کی پیش قدمی مسلم دنیا میں بلا روک ٹوک جاری رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک پوری مسلم دنیا کو تہس نہس کر ڈالا۔

تاتاریوں کا یہ غلبہ اتنا شدید اور اتنا ہمہ گیر تھا کہ مسلم دنیا میں یہ کہا جانے لگا کہ: اذا قیل لک انّ التتر انھزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس کو نہ ماننا) تاتاریوں کے اس دہشت خیز طوفان کو کس چیز نے ختم کیا، اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ پچھلے صلیبی حملہ سے اگر مسلم دنیا نے شمشیر کی طاقت کے ذریعہ نجات پائی تھی تو تاتاریوں کے شدید تر حملہ سے مسلمانوں نے دعوت کی طاقت کے ذریعہ فتح حاصل کی۔

تاتاریوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت باقی نہیں رہی تھی، اس لئے زیادہ تر مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاریوں کے درمیان دعوت کا خاموش اور پرامن

کام شروع کردیا۔ تاتاریوں کے پاس اپنی کوئی طاقت ور تہذیب موجود نہ تھی، اس لئے وہ خود بخود مسلم تہذیب سے متاثر ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ مختلف طریقوں سے انھیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کا پیغام پہنچنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی شروع ہوگئی۔ چنگیز خاں کے جن تاتاری جانشینوں نے ۱۳ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اسلام کی سیاسی قوت کو تاراج کیا تھا، انھوں نے اسی صدی کے خاتمہ تک اسلام کی فکری قوت سے مفتوح ہوکر بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرلیا۔

پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے :

> The religion of the Moslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

یہاں مزید یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صلیبیوں کا حملہ جس پر صلاح الدین ایوبی نے فتح پائی، وہ صرف اپنے مقدس مقام (یروشلم) پر قبضہ کرنے کے لئے تھا، جب کہ تاتاری جن پر دعوت کے ذریعہ فتح حاصل ہوئی، وہ پوری مسلم دنیا کو تاراج کرنے کے لئے اٹھے تھے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوچکے تھے۔

مغل حکمراں بابر اسی چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ وہ ۱۵۲۶ء میں دہلی میں داخل ہوا۔ یہ اسی کی نسل تھی جو ۱۸۵۷ تک موجودہ ہندستان (بھارت) سے بہت زیادہ بڑے ملک پر اسلام کی خادم بنی رہی اسلام کے لئے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں جن کی تفصیل یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔

اسی زمانہ میں وہ ترکستانی قبائل اٹھے جن کو سلجوقی ترک یا ترکان غز (Oguz Turkmen) کہا جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے ایران اور اس کے ملحق علاقوں میں زبردست تباہی پھیلائی۔ ان سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت موجود نہ تھی۔ کیوں کہ چنگیز خاں اور اس کی نسل (تاتاری) پہلے ہی اس کو آخری حد تک توڑ چکے تھے۔

مغل تاتاریوں کی طرح، ترکان غز کے سلسلہ میں دعوت کی خاموش اور پرامن طاقت ہی مسلمانوں کے کام آئی۔ تاریخ اگرچہ اس کی تفصیل نہیں بتاتی کہ ترکان غز کے قبائل پر دعوتی کام کس طرح

کیا گیا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اسلام کی دعوتی طاقت ہی نے آخر کار انھیں مسخر کیا۔ ان کا مسئلہ صرف اس طرح ختم ہوا کہ وہ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دینی بھائی بن گئے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے مذکورہ بالا دونوں واقعات کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھتے ہیں :

> In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant, spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet, — the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,—and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p.2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیرؤوں کی گردن پر رکھ دئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔

اسلام کی تاریخ میں ایک ممتاز نام عثمانی ترکوں کا آتا ہے۔ یہ انھیں ترکان غز کی اولاد تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ انھوں نے ترکی میں اس عظیم خلافت کی بنیاد ڈالی جو چھ سو سال تک مسلسل قائم رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد وہ صرف ۱۹۲۲ء میں ختم ہوگی :

> Turkish Osman, who is regarded as the founder of the empire that spanned six centuries and came to an end only in 1922.

Encyclopaedia Britannica, Vol. 13, p.771.

یہی عثمانی ترک تھے جنھوں نے ترکی کی وہ عظیم خلافت قائم کی جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ یہ خلافت پہلی جنگ عظیم تک پوری طاقت کے ساتھ اسلام کی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ مدت چھ سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔

گویا صلاح الدین ایوبی کی شمشیری طاقت صرف ۲۵ سال کے لئے اسلام کی پاسبان بنی تھی، مگر اسلام کی دعوتی طاقت چھ سو سال تک اسلام کی عالمی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ واقعہ قیامت تک کے لئے اس بات کی نشانی ہے کہ تلوار کے مقابلہ میں دعوت کی طاقت بے شمار گنا حد تک

زیادہ ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ "تلوار" کی عظمت کے قصیدے پڑھیں اور دعوت کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیں، ان سے زیادہ نادان بلاشبہ اس آسمان کے نیچے اور کوئی نہیں۔

قومی سیاست

اسلام ایک قائم شدہ مذہب اور تاریخی طور پر ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ جب کوئی دین یہ حیثیت حاصل کرلے تو وہ اپنے آپ پھیلنے لگتا ہے۔ چنانچہ دور اوّل کے بعد ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک اسلام اپنے آپ پھیلتا رہا ہے۔

اسلام کے پھیلاؤ میں پہلی بار رکاوٹ موجودہ نیشنلزم کے دور میں پیدا ہوئی۔ قدیم زمانہ میں ایک فوج کا دوسری فوج سے ٹکراؤ پیش آتا تھا۔ عام انسانی آبادی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے ٹکراتی ہے۔ اس طرح ٹکراؤ سے بننے والی دوری اور منافرت پوری کی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے اعتبار سے جو سب سے بڑا جرم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں اپنی ملی جدوجہد کے لیے "قومی سیاست" کا انداز اختیار کرلیا۔ اس طرح اسلام کی لمبی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قومیں اسلام سے متنفر ہوگئیں۔

مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ قومی سیاست کا انداز مکمل طور پر چھوڑ دیں، تاکہ قومی سطح پر پیدا ہونے والی ضد اور نفرت کی فضا ختم ہو اور اسلام کی اشاعتِ عام کا دروازہ کھلے۔ قومی سیاست کا ترک ہماری ملّی جدوجہد کا پہلا زینہ ہے، اس کے بغیر ملی جدوجہد سیکڑوں سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں۔

حکمتِ دعوت

لکل اُمّۃ جعلنا منسکاً ھم ناسکوہ فلا ینازِعنّك فی الامر وادع الی ربك انك لعلی ھدًی مستقیم وان جادلوك فقل اللہ اعلم بما تعملون۔ اللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ فیما کنتم فیہ تختلفون۔

(الحج ، ۶۷ - ۶۹)

ہر امت کے لیے ہم نے ایک طریقہ ٹھہرا دیا تو وہ اسی طرح عمل کرتے ہیں۔ پس وہ تم سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ بیشک تم سیدھی راہ پر ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلہ میں یہ روایت آئی ہے کہ وہ اس وقت اتری جب کہ مشرکوں (بدیل بن ورقا، بشر بن سفیان، یزید بن خنیس) نے اہل ایمان سے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے کہ جس جانور کو تم نے مارا اس کو تم کھاتے ہو اور جس جانور کو خدا نے مارا اس کو تم نہیں کھاتے، یعنی مردار کو (نزلت حین قال المشرکون للمسلمین مالکم تاکلون ما قتلتم ولا تاکلون ما قتلہ اللہ یعنی المیتۃ، تفسیر النسفی، الجزء الثالث، صفحہ ۱۱۰)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب عرب میں تشریف لائے تو عرب کے لوگ معروف معنوں میں بے دین نہ تھے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے نام پر ایک ڈھانچہ اختیار کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات اس مذہبی ڈھانچہ سے ٹکراتی تھیں۔ (مثلاً ان کے مروجہ مذہب میں مردار جائز تھا، جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کو حرام بتاتے تھے) اس طرح کے اختلافات کی بنا پر وہ آپ سے بدکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بزرگوں کے راستہ پر چلنے والا کہتے تھے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کا کہنا تھا کہ انھوں نے بزرگوں سے ہٹ کر نیا راستہ نکالا ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی کہ آپ ان ظواہر میں نہ الجھیں۔ جو لوگ اس قسم کی چیزوں کو لے کر بحث کرنے آئیں۔ ان سے اعراض کرتے ہوئے اصل صراطِ مستقیم (دعوت الی اللہ) پر قائم رہیں۔ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے مدعو کے سامنے ہمیشہ اساسی تعلیمات

رکھے۔ وہ ظاہری امور اور فروعی اختلافات میں اس سے نہ اُلجھے۔

آیت میں فَلَا یُنَازِعُنَّكَ فِی الْاَمْرِ کا فقرہ ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اس امر میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں۔ یہاں خطاب کا رُخ بظاہر فریق ثانی کی طرف ہے۔ مگر یہ ایک اسلوب ہے۔ ورنہ یہاں اصل مخاطب خود فریق اول ہے۔ یعنی ظاہر کلام کے اعتبار سے مدعو سے کہا جا رہا ہے کہ وہ جھگڑا نہ کریں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم ان سے جھگڑا نہ کرو۔ عربی میں اگر یہ کہا جائے کہ لَا یَضْرِبَنَّكَ زَیْدٌ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ زید کو منع کیا گیا کہ وہ تم کو نہ مارے۔ بلکہ خود مخاطب سے کہا گیا کہ تم یک طرفہ احتیاط کے ذریعہ اس کی کوشش کرو کہ زید تم کو مارنے نہ پائے:

قال الزجاج معنی قوله (لاینازعنك) لاتنازعهم انت۔ کمایقال لایخاصمنّك فلان۔ ای لاتخاصمه۔ وهذا جائزٌ فیمایکون بین اثنین۔ وذالك لان المنازعة و المخاصمة لاتتم الاّ باثنین فاذا ترك احدهما ذهبت المخاصمة۔

(التفسیر المظہری، المجلد السادس، صفحہ ۳۴۶)

زجاج نے کہا کہ لَا یُنَازِعُنَّكَ کا مطلب یہ ہے کہ تم خود ان سے نزاع نہ کرو۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فلاں آدمی تم سے مخاصمت نہ کرے، یعنی تم اس سے مخاصمت کی نوبت نہ آنے دو۔ یہ اس وقت کے لیے ہے جب کہ نزاع دو آدمیوں کے درمیان ہو۔ اس لیے کہ نزاع اور جھگڑا دو آدمیوں کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پس جب دونوں میں سے ایک شخص نزاع چھوڑ دے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

اس قرآنی حکم کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص خدا کے دین کی دعوت دینا چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ دعوت کے ساتھ نزاع کو جمع نہ کرے۔

داعی اور مدعو کے درمیان اگر نزاع کی فضا ہو تو مدعو کبھی کھلے ذہن کے ساتھ داعی کی بات نہیں سنے گا۔ اس لیے داعی کو یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کرکے اپنے اور مدعو کے درمیان معتدل فضا کو باقی رکھے تاکہ مدعو اس کی باتوں پر ہمدردانہ غور کر سکے۔

ہر نزاع ختم ہوسکتی ہے، بشرطیکہ ایک فریق اس کو بلا شرط ختم کر دے۔

اعراض کا اصول

اس سلسلہ میں اسلام کی ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کو اعراض کہا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ (۶ ھ) کے سفر میں تھے۔ آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار اصحاب تھے۔ آپ برابر دشمن کے بارہ میں خبر لیتے رہتے تھے۔ بُسر بن سفیان الکعبی نے خبر دی کہ خالد بن الولید ایک فوج لے کر بڑھ رہے ہیں تاکہ آپ سے ٹکراؤ کریں۔ یہ خبر سن کر آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو ہم کو ایسے راستہ سے لے چلے جو اس کے علاوہ ہے جس سے وہ لوگ آرہے ہیں (مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلٰى طَرِيْقٍ غَيْرِ طَرِيْقِهِمُ الَّتِيْ هُمْ بِهَا ، ۳/۳۵۷)

اس وقت قبیلہ اسلم کا ایک شخص آگے بڑھا جو راستوں سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول یہ کام میں کروں گا۔ چنانچہ اس نے متعاد راستہ کو چھوڑ دیا اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو لے کر ایک پتھریلے اور دشوار گزار راستہ سے روانہ ہوا۔ خالد کا لشکر معروف راستہ سے آپ کی طرف آرہا تھا۔ آپ غیر معروف راستہ سے چل کر آگے پہنچ گئے۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا۔ اس کو ایک لفظ میں اصول اعراض (Principle of avoidance) کہا جا سکتا ہے۔ آپ کا اصول یہ تھا کہ ٹکراؤ سے آخری حد تک اعراض کیا جائے۔ جب فریق ثانی کی جارحیت کی بنا پر کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہے تو بشرط تیاری اور بقدر ضرورت مقابلہ کیا جائے۔

بدر کا مقابلہ اسی طرح پیش آیا۔ مکہ کے زمانۂ قیام میں آپ کے مخالفین آپ کے جانی دشمن ہو گئے اور یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو قتل کر ڈالیں۔ اس وقت آپ ان سے لڑے نہیں بلکہ اعراض کے اصول پر عمل کرتے ہوئے آپ نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا اور مکہ سے نکل کر مدینہ چلے گئے۔ ہجرت دراصل اعراض ہی کی ایک صورت ہے۔ تاہم آپ کے مخالفین کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ منظم لشکر لے کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اس وقت آپ نے بدر کے مقام پر ان کا مقابلہ کیا۔

احد کی جنگ کا معاملہ بھی یہی تھا۔ یہ جنگ عین مدینہ کی سرحد پر ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ سے تین سو میل کا فاصلہ طے کرکے مدینہ آئے اور یک طرفہ طور پر آپ کے اوپر جارحانہ حملہ کیا۔ اس وقت آپ نے اپنے اصحاب کو لے کر ان کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح حنین کی جنگ بھی سراسر یکطرفہ

تھی۔ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ خاموشی سے طائف جا رہے تھے۔ راستہ میں اچانک قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے آپ کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی۔ اس طرح وہ واقعہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ حنین کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ جنگ صرف تین مواقع پر کی ہے (بدر، احد، حنین) اور تینوں کی حقیقت یہی تھی۔

غزوۂ احزاب کا واقعہ اعراض کے طریقہ کی ایک نہایت سبق آموز مثال پیش کرتا ہے۔ ذو القعدہ ۵ھ میں قریش نے دوسرے قبائل کو لے کر دس ہزار کی جمعیت بنائی اور زبردست تیاری کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصولِ اعراض کے تحت برابر دشمن کی خبر بس لیا کرتے تھے تاکہ بروقت بچاؤ کی کارروائی کر سکیں۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ دشمن کی فوج مدینہ کی طرف بڑھ رہی ہے تو آپ نے مدینہ کے شمال مغرب میں، جو مدینہ کا کھلا ہوا حصہ تھا، خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔ چھ دن شب و روز کی محنت سے خندق تیار ہوئی۔ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ بہ نفس نفیس اس کام میں شریک ہو گئے۔ یہ خندق لمبائی میں تقریباً پانچ ہزار ہاتھ تھی۔ گہرائی اور چوڑائی کم و بیش دس دس ہاتھ تھی۔

اس طرح خندق کی صورت میں آپ نے اپنے اور دشمن کے درمیان ایک آڑ قائم کر دی۔ چنانچہ دشمن کی فوج گھوڑے اور اونٹ پر سوار ہو کر جب مدینہ کے پاس پہنچی تو خندق دیکھ کر آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ اس کے دوسری طرف رک گئی۔ انھوں نے خندق کے دوسری طرف سے تیر اور پتھر پھینکے جس کے نتیجہ میں چند مسلمان شہید ہو گئے۔ پھر بھی آپ نے دونوں گروہوں کے درمیان باقاعدہ مڈبھیڑ کی نوبت نہ آنے دی۔

خندق کے نتیجہ میں دشمن کا اقدام رک گیا۔ تاہم ان کے جارحانہ حوصلے ختم نہیں ہوئے۔ وہ خندق کے دوسری طرف پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے کہ ایک نئی صورت حال سامنے آگئی۔ اس وقت مدینہ کے اندر یہود کا ایک بڑا قبیلہ آباد تھا جس کو بنو قریظہ کہا جاتا تھا۔ بنو قریظہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ مگر اس نازک موقع پر وہ غداری پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے قریش کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ قریش کسی نہ کسی طرح خندق پار کر کے مدینہ میں گھس آئیں، اور وہ اندر سے ان کے اوپر حملہ کر دیں۔ مسلمان اس دو طرفہ حملہ کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور زبردست

شکست سے دوچار ہوں گے۔

یہ ایک نہایت نازک صورت حال تھی جس کا نقشہ قرآن (الاحزاب ۱۰) میں ملتا ہے۔ تاہم اب بھی آپ کی نگاہ اعراض پر تھی نہ کہ ٹکراؤ پر۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک نومسلم آپ کے پاس آئے وہ ایک معروف آدمی تھے اور ان کا نام نُعیم بن مسعود تھا۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ مگر لوگ ابھی میرے اسلام سے باخبر نہیں۔ اس وقت میرے کرنے کا کوئی کام ہو تو آپ مجھے اس کا حکم دیں۔ آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَنْتَ فِيْنَا رَجُلٌ وَاحِدٌ ۔ فَخَذِّلْ عَنَّا اِنْ اسْتَطَعْتَ ۔ فَاِنَّ الْحَرْبَ خُدْعَةٌ

تم ہمارے درمیان ایک ہی آدمی ہو۔ پس تم سے ہوسکے تو ایسی تدبیر کرو کہ وہ ہمارے خلاف ایک دوسرے کی مدد چھوڑ دیں۔ کیوں کہ جنگ دھوکا ہے۔

(صفحہ، ۳/۲۴۷)

جب خندق کی آڑ قائم کرنے کے باوجود جنگ کا خطرہ ختم نہیں ہوا تب بھی آپ نے جنگ کا منصوبہ نہیں بنایا بلکہ جنگ سے بچنے کے لئے آپ "خدعہ" تک گئے۔ تلوار استعمال کرنے کے بجائے آپ نے تدبیر کا حربہ استعمال فرمایا۔ آپ کا "خدعہ" جنگ سے بچنے کے لئے تھا نہ کہ جنگ میں کودنے کے لئے۔

آپ کی مذکورہ ہدایت کے بعد نُعیم بن مسعود خاموشی کے ساتھ سرگرم ہوگئے۔ انھوں نے جو کچھ کیا وہ کافی تفصیل کے ساتھ کتابوں میں آیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نعیم بن مسعود پہلے بنو قریظہ کے پاس گئے۔ انھوں نے ان سے کہا کہ دیکھو، قریش اور غطفان باہر کے لوگ ہیں۔ جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی۔ اگر شکست ہوئی تو یہ لوگ تو اپنے وطن واپس چلے جائیں گے اور تم یہاں مسلمانوں کے درمیان ان کے رحم وکرم پر ہوگے۔ اس لئے تم اس جنگ میں اس وقت تک شرکت نہ کرو جب تک تم قریش کے کچھ آدمی بطور ضمانت اپنے پاس نہ رکھ لو۔ بنو قریظہ نے کہا کہ تم نے بہت اچھی رائے دی۔

نعیم بن مسعود اس کے بعد قریش کے پاس گئے۔ انھوں نے ان سے دوسری بات کہی۔ ان سے انھوں نے کہا کہ مجھے ایک سخت خبر ملی ہے۔ تمہاری خیرخواہی کے لئے میں نے چاہا کہ وہ خبر تمہیں پہنچا دوں۔ وہ خبر یہ ہے کہ بنو قریظہ محمدؐ سے قطع تعلق کرنے پر نادم ہوئے ہیں اور دوبارہ ان سے تعلق جوڑنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے انھوں نے یہ پیش کش کی ہے کہ وہ قریش کے کچھ افراد

کو محمد کے حوالے کر دیں گے تاکہ وہ انھیں قتل کر سکیں۔ تمہاری بھلائی کے لئے میں نے یہ خبر تمہیں پہنچادی ہے۔ اب تم لوگ اپنی تدبیر سوچ لو۔

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق، شوال ۵ھ میں سنیچر کی رات کو قریش کے بعض افراد خفیہ طور پر بنو قریظہ کی بستی میں گئے اور ان سے جنگ کا عملی نقشہ طے کرنے کے لئے کہا تو بنو قریظہ نے جواب دیا کہ یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ تم یہ یقین دلاؤ کہ تم ہم کو مدینہ میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑو گے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ تم اپنے کچھ آدمی ہمارے پاس ضمانت کے طور پر رکھ دو۔ اس کے بعد ہم ضرور تمہارے ساتھ مل کر محمدؐ کے خلاف لڑیں گے۔

قریش اور غطفان کے سرداروں کو جب بنو قریظہ کی یہ شرط معلوم ہوئی تو ان کو یقین ہو گیا کہ نُعیم بن مسعود نے انھیں جو خبر دی تھی وہ صحیح تھی۔ دوسری طرف جب قریش اور غطفان اس شرط پر راضی نہیں ہوئے تو بنو قریظہ کو نُعیم بن مسعود کا مشورہ بالکل درست معلوم ہوا۔ اس طرح دونوں فریقوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ اور اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا (خَذَّلَ اللّٰہُ بینھم ، ۲۵۰) اس کے بعد قریش اور یہود کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ مزید یہ واقعہ ہوا کہ اللہ نے تیز آندھی بھیج دی۔ دشمن کے خیمے اکھڑنے لگے۔ وہ لوگ مایوسی اور گھبراہٹ کے عالم میں ۲۰ دن کے بعد واپس چلے گئے ______ رسول اللہ کی تدبیر بھی جنگ کو روکنے کے لئے تھی، اور اللہ تعالیٰ نے آندھی کی شکل میں جو مدد بھیجی وہ بھی اسی لئے تھی کہ دونوں فریقوں میں جنگ نہ ہونے پائے۔

غزوۂ خندق کا واقعہ واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جنگ اور ٹکراؤ سے آخری حد تک اعراض کیا جائے۔ حتی کہ جنگ کو ٹالنے کے لئے اگر خُدعہ کا طریقہ اختیار کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ خدعہ کے ذریعہ جنگ کو ٹالنا اس سے بہتر ہے کہ خدعہ نہ کر کے جنگ کا خطرہ مول لیا جائے۔ خُدعہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو اردو میں حیلہ اور انگریزی میں (Trick) کہتے ہیں۔

اس معاملہ کی آخری حد یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کو جنگ اور مڈبھیڑ پسند نہیں۔ یہ ثابت ہے کہ غزوۂ خندق کے آخری مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے تیز آندھی بھیجی تاکہ دشمن کی صفیں منتشر ہو جائیں اور وہ گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ آندھی کے بجائے فرشتے بھی بھیج سکتے تھے جو رسول اور

اصحاب رسول کی طرف سے ان کے دشمنوں سے لڑیں۔ جیساکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کے موقع پر کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا معاملہ بار بار نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ جنگی مدد کے لئے فرشتے صرف ایک بار، خاص مصلحت کے تحت، غزوۂ بدر میں اترے تھے۔ اس کے بعد وہ نہیں اترے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ فرشتے جنگ بدر کے سوا کسی اور موقع پر نہیں لڑے۔ (قال لم تقاتل الملائکۃ الا یوم بدر) دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ فرشتوں نے جنگ بدر کے سوا کسی اور موقع پر تلوار نہیں ماری (لم تضرب الملائکۃ فی یوم سوی یوم بدر) تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۰۲

فرشتوں کی شرکت کے اعتبار سے جنگ بدر کی حیثیت عموم کی نہیں، بلکہ استثناء کی ہے۔ عمومی طور پر اللہ کو یہی پسند ہے کہ جنگ سے اعراض کیا جائے۔ مگر بدر کے موقع پر مخصوص اسباب کے تحت فرشتوں کی مدد بھیج کر اہل اسلام کو اہل کفر سے ٹکرایا گیا۔ تاہم اس قسم کا واقعہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں صرف ایک بار ہوا۔ اس کے بعد پھر اسے دہرایا نہیں گیا۔ گویا خدا کے منصوبہ میں جنگ ایک بار کے لئے تھی اور اعراض کی تدبیر ہر بار کے لئے۔

اعراض کے اصول کو مجرد طور پر دیکھئے تو اس کی معنویت پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے گی۔ مگر جب اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بقیہ زندگی سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کی بے پناہ معنویت فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعراض کا اصول وہ اہم تدبیر ہے جس کو ایک بامقصد انسان اپنے مقصد پر مسلسل قائم رہنے کے لئے ہمیشہ اختیار کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک اہم ترین مقصد تھا جس میں آپ رات دن مصروف رہتے تھے۔ یہ مقصد تھا: اللہ کے بندوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچانا، اللہ کے بندوں کو اللہ کی رحمت کے سایہ میں لے آنا۔ اس عظیم مقصد کا تقاضا تھا کہ آپ ہر اس مشغولیت سے دور رہیں جو آپ کو دعوت الی اللہ کے راستہ سے ہٹا دینے والا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ ٹکراؤ سے بچنے کی کوشش کرتے رہے کیوں کہ ٹکراؤ کی فضا دعوت کی فضا کی قاتل ہے۔ ٹکراؤ پیش آنے کے بعد مدعو اچانک حریف اور رقیب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور حریف اور رقیب کے اوپر معتدل انداز میں دعوت کا کام نہیں کیا جا سکتا۔

داعی کا اخلاق

داعی کے دل میں اپنے مدعو کے لئے بے پناہ شفقت ہوتی ہے۔ وہ مدعو کی ہدایت کا حریص بن جاتا ہے۔ یہ چیز اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مدعو کے ساتھ یک طرفہ حسن سلوک کرے۔ داعی کے اخلاق کو ایک شخص نے ایک جملہ میں اس طرح بیان کیا ہے —— خدا تجارت کو اپنا مبلغ بناتا ہے :

God is making commerce his missionary

یہ الفاظ داعی کے اخلاق کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کر رہے ہیں۔ داعی کا اخلاق وہی ہوتا ہے جو تاجر کا اخلاق ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ داعی کا اخلاق خدائی محبت کے جذبہ سے ابلتا ہے اور تاجر کا اخلاق مادی فائدے کے جذبہ سے۔ تاجر آخری حد تک اپنے گاہک کی رعایت کرتا ہے۔ وہ گاہک کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتا ہے، تاکہ گاہک سے اس کا سودا ہو سکے، تاکہ گاہک کے ساتھ اس کا معاملہ بگڑنے نہ پائے۔

اسی طرح داعی بھی اپنے مدعو کی آخری حد تک رعایت کرتا ہے۔ وہ مدعو کی زیادتیوں کو نظر انداز کرتا ہے تاکہ وہ اس سے متوحش نہ ہو۔ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا کا ہونا لازمی طور پر ضروری ہے۔ اور داعی یک طرفہ طور پر یہ ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ اس فضا کو ڈسٹرب نہ ہونے دے گا۔

داعیانہ اخلاق کا یہ تصور حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور اسی طرح اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی۔

مسیحی تعلیم

یہاں ہم حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک وعظ کے چند الفاظ نقل کرتے ہیں۔ متی کی انجیل میں آپ کا ایک وعظ ان الفاظ میں آیا ہے :

" تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بے گار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تجھ سے قرض چاہے اس سے منہ نہ موڑ۔ تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت

لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو کیوں کہ وہ اپنے سورج کو بدوں اور نیکوں دونوں پر چمکاتا ہے۔ اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینھ برساتا ہے۔ کیوں کہ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لیے کیا اجر ہے۔ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے۔ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا نہیں کرتے۔ پس چاہیے کہ تم کامل ہو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے (متّی ۵ : ۳۸-۴۸)

حضرت مسیح کی اس تعلیم کی گہرائی کو جو لوگ نہیں سمجھتے وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ اس کو انفعالی کردار (Passive character) کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی انفعالیت قابل عمل نہیں۔ اس قسم کی انفعالیت کے ساتھ موجودہ دنیا میں رہنا ممکن نہیں۔

مگر یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ حضرت مسیح نے اپنے ان الفاظ میں داعی کا اخلاق بتایا ہے نہ کہ عام اخلاق۔ داعی کو اپنی بات دوسروں تک پہونچانی ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات کو دوسروں کے دل میں اتار دینا چاہتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کے اندر فکری انقلاب لانا چاہتا ہے۔ یہ بات اس وقت ممکن ہے جب کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا ہو نہ کہ جھگڑے اور مقابلے کی فضا۔

یہ معتدل فضا دو طرفہ بنیاد پر کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ داعی اگر یہ چاہے کہ دوسرے لوگ ٹھنڈے ہوں تو وہ بھی ٹھنڈا رہے گا اور اگر دوسرے لوگ گرم ہو جائیں تو وہ بھی گرم ہو جائے گا تو ایسی حالت میں کبھی دونوں فریقوں کے درمیان سننے اور سنانے کی فضا قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ داعی کو یکطرفہ طور پر یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔ وہ مدعو کے رویہ سے اوپر اٹھ کر یہ کوشش کرتا ہے کہ دونوں کے درمیان معتدل فضا قائم رہے۔

داعی اور مدعو کے درمیان جھگڑا اکثر کسی نہ کسی مادی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ حضرت مسیح کے وعظ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب داعی اور مدعو کے درمیان کوئی مادی جھگڑا پیدا ہو تو داعی کو چاہیے کہ یک طرفہ طور پر مادی نقصان کو برداشت کرے تاکہ دعوت کی راہ میں کوئی غیر متعلق رکاوٹ حائل نہ ہونے پائے۔ مدعو اگر داعی سے اس کا "کرتا" چھینے تو داعی کو چاہیے کہ وہ کہے کہ تم کرتے کے ساتھ میرا "چغہ" بھی لے لو۔ البتہ میرے پیغام کو سنو۔

داعی کا مقام

داعی کی حیثیت اور اس کا مقام سمجھنے کے لئے ایک حدیث کا مطالعہ مناسب ہوگا:

عن ابی ذرّ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ: انی اریٰ مالا ترون و اسمع مالا تسمعون اطّتِ السماء وحُقّ لـها ان تئطّ۔ ما فیها موضع اربع اصابع الّا و ملك واضع جبهته ساجداً للہ تعالیٰ۔ واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرا وما تلذذتم بالنساء علی الفرش۔ ولخرجتم الی الصعدات تجأرون الی اللہ تعالیٰ۔

وفی روایة انّ اباذر قال، لو ددت انی کنت شجرة تعضد (ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان میں چرچراہٹ ہو رہی ہے اور اس کے لئے حق ہے کہ اس میں چرچراہٹ ہو۔ آسمان میں کوئی چار انگل جگہ بھی نہیں مگر یہ کہ وہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہوئے اللہ کو سجدہ کر رہا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ اور بستروں پر تمہارے لئے عورتوں میں لذت نہ رہ جاتی۔ اور تم خدا کو پکارتے ہوئے میدانوں کی طرف نکل جاتے۔ ایک روایت کے مطابق، حضرت ابوذر نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد کہا: میری تمنا ہے کہ میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

اس حدیث میں پیغمبر کا جو حال بتایا گیا ہے وہی داعی کا حال ہوتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ پیغمبر اس کیفیت میں آخری کمال کے درجہ پر ہوتا ہے اور عام داعی اپنی اپنی استعداد کے درجہ پر۔

خدا کا داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کی معرفت اتنی بڑھی ہوئی ہو کہ غیب اس کے لئے شہود کا درجہ حاصل کر لے۔ جو اپنے تصور کی آنکھ سے ان چیزوں کو آج ہی دیکھ لے جن کو موت کے بعد ہر آدمی اپنی پیشانی کی آنکھ سے دیکھے گا۔

لوگ عالم ظاہر میں الجھے ہوتے ہیں پھر وہ عالم غیب کی خبر دینے والے کیسے بن سکتے ہیں۔ لوگ خدا سے دور ہیں پھر کیسے ممکن ہے کہ ان کی زبان سے معانی کا وہ چشمہ جاری ہو جو خدا سے قریب ہونے کے بعد ہی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

یہی موجودہ زمانہ میں ہمارے مسئلہ کا آغاز ہے اور یہی ہمارے مسئلہ کا اختتام بھی۔ لوگوں کو مندروں اور گرجاؤں کی گھنٹیاں اس لئے سنائی دیتی ہیں کہ ابھی صور اسرافیل کی چنگھاڑ سے ان کے کان کے پردے نہیں پھٹے۔ سڑک پر انسانوں کا جلوس ان کو اس لئے دکھائی دیتا ہے کہ فرشتوں کی فوج نے ابھی ان کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا۔ معاشی اور سیاسی امتیاز کی شکایت لوگ اس لئے کر رہے ہیں کہ قیامت کے اس ہولناک دن سے ابھی تک وہ باخبر نہیں ہوئے جب کہ خوراک کا ایک دانہ نہیں ہوگا جس کو لوگ کھائیں اور پانی کا ایک قطرہ نہیں ہوگا جس سے لوگ اپنے حلق کو ٹھنڈا کریں۔

لوگ انسان کے چھیڑے ہوئے مسائل میں گم ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کے چھیڑے ہوئے مسائل کی خبر نہیں۔ لوگ الفاظ کا کمال دکھا رہے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ ابھی تک معانی کی گہرائیوں سے آشنا نہیں ہوئے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں کیوں کہ بڑے بڑے معاملات کو ابھی تک انھوں نے جانا ہی نہیں۔ آہ وہ انسان جو جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے۔ حالانکہ وہ ابھی تک یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا۔

داعی بننے کے لئے پیغمبر کے مقام پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس عظیم مقصد کے لئے اٹھنا ہے جس کے لئے فرشتے اترے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ یہ کوئی قومی لیڈری نہیں، یہ انسان کی سطح پر خدا کی نمائندگی ہے۔

داعی بننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ذاتی تقاضوں کو بھول جائے۔ وہ قومی خواہشات کو نظر انداز کر دے۔ وہ ہر دوسرے جھگڑے اور مطالبے سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا لے۔ وہ انسانوں کا خیر خواہ بنے، خواہ لوگ اس کو گالیاں دیتے ہوں۔ وہ قوموں کی ہدایت کے لئے تڑپے، خواہ قوموں نے اس کے اوپر ظلم کا آرہ چلا رکھا ہو۔ اس کو دوسروں کے لئے سراپا رحم بننا پڑتا ہے تاکہ خدا اس کے لئے سراپا رحم بن جائے۔

دعوت کی لازمی شرط صبر ہے۔ دنیا میں داعی اور مدعو کے درمیان طرح طرح کے مادی جھگڑے ہوتے ہیں۔ مگر داعی کو بلا شرط تمام مادی جھگڑوں کو ختم کرنا پڑتا ہے تاکہ مدعو اس کے دینی پیغام کو سنے۔ اس کو یک طرفہ طور پر تمام نقصانات پر راضی ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا بن سکے۔ خلاصہ یہ کہ اس کو دنیا کی آگ میں جلنا پڑتا ہے تاکہ خدا اس کو آخرت کی آگ میں جلنے سے بچا لے۔

اسلام کی تعلیم

عام خیال کے برعکس، اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم بھی حضرت مسیح کی تعلیم سے مختلف نہیں ہے۔ داعی کا جو اخلاق حضرت مسیح نے بتایا ہے وہی خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تلقین فرمایا ہے۔

مثال کے طور پر صہیب بن سنان ایک رومی باشندہ تھے۔ وہ مکہ میں کاریگری کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کام کے ذریعے کچھ سونا کمایا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا تو وہ بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔ ان کی ہجرت پیغمبر اسلام کی ہجرت کے بعد ہوئی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت صہیب مکہ سے مدینہ جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ گھر سے نکلے تو قریش کے لوگوں نے ان کو گھیر لیا۔ انھوں نے کہا کہ تم نے ہمارے یہاں رہ کر سونا کمایا ہے ہم اس سونا کو لے کر تمہیں مدینہ نہیں جانے دیں گے۔ اس مسئلہ پر دونوں کے درمیان بحث ہوئی۔ آخر میں حضرت صہیب نے کہا کہ اگر میں اپنا سونا تمہیں دے دوں تو کیا تم مجھ کو چھوڑ دوگے کہ میں مدینہ جاکر پیغمبر اسلام کے ساتھ مل جاؤں۔ قریش کے لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ اس پر انھوں نے اپنا سونا نکال کر انھیں دے دیا اور آگے روانہ ہوگیے۔

حضرت صہیب مدینہ پہونچ کر پیغمبر اسلام سے ملے اور وہ قصہ سنایا جو قریش کے ساتھ پیش آیا تھا۔ پیغمبر اسلام نے جب یہ سنا کہ حضرت صہیب دشمنوں کے مطالبے پر انھیں سونا دے کر یہاں آئے ہیں تاکہ اسلام کے قافلہ کے ساتھ مل سکیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فرمایا: اے ابو یحیٰ، تمہاری تجارت کامیاب رہی (ربح البيع يا ابا يحيى) ابو یحیٰ حضرت صہیب کی کنیت تھی۔

پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو داعیانہ اخلاق کی اس نوعیت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک نمایاں واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے وہ ساتھی جو مہاجرین کہے جاتے ہیں وہ اپنے مکان اور جائداد کو مکہ میں چھوڑ کر مدینہ چلے گیے تھے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ ہجرت کے آٹھ سال بعد مکہ فتح ہوا۔ مگر فتح کے باوجود پیغمبر اسلام نے اپنے ساتھیوں کو یہ اجازت نہ دی کہ وہ اپنے چھوڑے ہوئے مکانوں اور جائدادوں پر دوبارہ قبضہ کریں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مکانات اور جائدادیں اس وقت خالی پڑی ہوئی نہ تھیں بلکہ ان پر مکہ کے ان لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ حتی کہ بعض مکانات کو ان نئے قبضہ کرنے والوں نے کسی اور شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ پیغمبر اسلام یہ چاہتے تھے کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور ان کو اسلام کے دائرہ میں لایا جائے۔ ایسی حالت میں اگر لوگ اپنے سابقہ مکانوں اور جائدادوں پر قبضہ کرنے لگتے تو دونوں فریقوں کے درمیان زبردست مادی جھگڑے کھڑے ہو جاتے۔ ان مادی جھگڑوں کی وجہ سے ان کے اوپر دعوت کا کام ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔ یہی دعوتی حکمت تھی جس کی بنا پر پیغمبر اسلام نے اپنے ساتھیوں (مہاجرین) کو یہ اجازت نہ دی کہ وہ مکہ کے غیر مسلموں سے اپنی سابقہ مکانوں اور جائدادوں کو واپس لینے کا مسئلہ کھڑا کریں۔

قرآن میں داعیانہ اخلاق کے تمام بنیادی اصول نہایت واضح طور پر بیان کیے گیے ہیں۔ ان بنیادی اصولوں کا یہاں ہم اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔

صبر کا طریقہ

اس سلسلے میں قرآن کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ یہ ہے:

اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی برابر نہیں۔ تم بدی کو اچھے برتاؤ سے دفع کرو۔ پھر تم دیکھوگے کہ تم میں اور جس شخص میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا ہے جیسے کوئی قریبی دوست، اور یہ بات انھیں لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام انھیں کو ملتا ہے جو بڑے نصیب والے ہیں اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگو، بے شک وہ سننے والا، جاننے والا ہے، حم السجدہ ۳۶-۳۳

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے پیغام کا داعی بننے کے لیے صالح ہونا بہت ضروری ہے۔ یہاں صالح کا مفہوم وہی ہے جس کے لیے ہم اپنی زبان میں موافق کا لفظ بولتے ہیں۔ آدمی جس چیز کا داعی ہے۔ اسی کے مطابق اس کا اخلاق و کردار بھی ہونا چاہیے۔ اسی کو عمل صالح کہتے ہیں۔

داعی حقیقۃً وہ ہے جو اپنی دعوت کے حق میں اتنا زیادہ سنجیدہ ہو کہ وہی اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز بن جائے۔ اس کی نظر میں دعوت کی اہمیت اتنی زیادہ ہو کہ ہر دوسری چیز اس کے

لیے ثانوی بن کر رہ جائے۔ ایسا آدمی جب دعوت کے میدان میں آتا ہے تو اس سے اسی کردار کا ظہور ہوتا ہے جس کا قرآن کی مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

داعی سے جو عمل صالح مطلوب ہے اس کا ایک لازمی پہلو یہ ہے کہ مدعو کی طرف سے اس کو برائی کا تجربہ ہو تب بھی داعی اس کے حق میں بھلائی کرے۔ مدعو سے چوٹ کھا کر بھی اس کے حق میں اس کے دل سے دعا نکلے۔ داعی کو یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو حسن سلوک کا پابند بنانا چاہیئے۔ یہ یک طرفہ حسن اخلاق بلاشبہ بہت عالی حوصلگی کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑا صبر اور برداشت درکار ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اسی یک طرفہ حسن اخلاق میں داعی کی تمام کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

خدا نے انسان کی جو فطرت بنائی ہے وہ یک طرفہ حسن سلوک کے آگے مسخر ہو جاتی ہے۔ یک طرفہ حسن سلوک داعی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس لیے جب بھی داعی اپنے اندر انتقام اور جوابی اخلاق کا جذبہ ابھرتا ہوا پائے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے۔ شیطان داعی سے اس کا ہتھیار چھین لینا چاہتا ہے۔ کیوں کہ شیطان کو معلوم ہے کہ داعی نے جیسے ہی جوابی اخلاقیات کا مظاہرہ کیا، وہ اپنے مدعو کو کھو دے گا۔ وہ دنیا میں بھی ناکام ہو جائے گا اور آخرت میں بھی۔

لوگوں کے ساتھ خیر خواہی

خدا کے تمام پیغمبر خدا کے داعی تھے۔ ان پیغمبروں کے بارے میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ سب کے سب اپنی مخاطب قوم کے خیر خواہ تھے۔ مثلاً قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں مختلف پیغمبروں کا ذکر ہے۔ وہاں ہر ایک کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارا ناصح ہوں (ابلغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین، الاعراف ۶۸)

"ناصح" کے معنی عربی زبان میں خیر خواہ کے ہوتے ہیں۔ داعی اپنے مدعو (مخاطب گروہ) کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ یہ خیر خواہی داعی کی شخصیت کی اصل ہے۔ اسی سے تمام داعیانہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کر رہا ہے، مخاطب کے فائدے کے لیے کر رہا ہے نہ کہ اپنے ذاتی فائدہ کے لیے۔

خیر خواہی کا جذبہ آدمی کو دوسرے کے بارہ میں سوچنے والا بناتا ہے۔ جس شخص کے آپ خیر خواہ ہوں۔ آپ لازماً اس کی اصلاح و ہدایت کے حریص ہو جاتے ہیں۔ آپ کا یہ جذبہ آپ کو مجبور کرتا

ہے کہ آپ اس کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ آپ اپنی تنہائیوں میں اس کے لیے دعا کرتے ہیں۔ آپ اس سے جو بات کہتے ہیں حکمت کے ساتھ کہتے ہیں۔ آپ اس کے مزاج کی پوری رعایت کرتے ہیں۔ آپ اس کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کرتے ہیں۔ آپ آخری حد تک یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ پیش نہ آئے تاکہ آپ کے اور اس کے درمیان کہنے سننے کا ماحول بگڑنے نہ پائے۔

اعراض

داعی کی ایک اہم صفت قرآن میں اعراض بتائی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جاہلوں سے اعراض کرو (واعرض عن الجاهلين ، الاعراف)

اعراض وہ عمل ہے جو داعی کو کرنا ہے۔ اعراض کا مطالبہ داعی سے کیا گیا ہے، مدعو سے اس کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ گویا یہ وہ عمل ہے جو داعی کو یک طرفہ طور پر کرنا ہے۔

اعراض کے وہی معنی ہیں جس کو انگریزی میں اوائڈ کرنا کہا جاتا ہے۔ یعنی فریق ثانی کی بات کا اثر لیے بغیر اس کو نظر انداز کر دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل فضا کو باقی رکھنے کی ذمہ داری یک طرفہ طور پر داعی کو قبول کرنا ہے۔ مدعو کا رویہ خواہ جو بھی ہو، داعی کو بہر حال اپنے مثبت رویہ پر قائم رہنا ہے۔ داعی کو ردعمل کی نفسیات سے آخری حد تک بچنا ہے۔ داعی کو مدعو کے لیے اپنی خیر خواہانہ روش کو نہیں چھوڑنا ہے، خواہ مدعو بظاہر اس کا بدخواہ کیوں نہ ہو جائے۔

ایک مثال

موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین میں سے ایک مولانا محمّد الیاس صاحب (۱۹۴۴-۱۸۸۶) ہیں ان کے اندر خالص دعوت کا مزاج تھا۔ ان کا ایک واقعہ دعوتی اخلاق کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحب نے بیسویں صدی کے ربع اول میں میوات میں تبلیغ کا کام شروع کیا۔ میوات کے لوگ اس وقت جاہل اور ان گھڑ تھے۔ مولانا الیاس صاحب وہاں گیے۔ ایک روز وہ ایک میواتی کو کلمہ اور نماز کی اہمیت بتا رہے تھے۔ اس گفتگو کے دوران وہ میواتی کسی بات پر بگڑ گیا اور مولانا الیاس صاحب کو زور سے دھکا دے دیا۔ مولانا الیاس صاحب زمین پر گر پڑے۔ تاہم وہ میواتی کی بدسلوکی پر غصہ نہیں ہوئے۔ وہ خاموشی سے دوبارہ اٹھے اور اپنے کپڑے کی گرد جھاڑتے

ہوئے میواتی سے کہا :

اچھا ، تم تو اپنا کام کر چکے ، اب میری بات سنو

مولانا الیاس صاحب نے میواتی کے ظلم کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا۔ انھوں نے میواتی سے جھگڑنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ اور دوبارہ معتدل انداز میں اپنی تبلیغی گفتگو شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میواتی کا دل نرم پڑ گیا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ان کی بات سنی اور پھر اپنی اصلاح کر کے مولانا الیاس صاحب کا ساتھی بن گیا۔

داعیانہ اخلاق ، ایک لفظ میں ، یک طرفہ حسنِ اخلاق کا دوسرا نام ہے۔ جن لوگوں کے اندر یک طرفہ حسنِ اخلاق کا حوصلہ ہو وہی دعوت حق کا کام کریں گے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے کیے سے یہ کام ہو سکتا ہے۔

باب چهارم

تعمیرِ ملّت

ہماری اس وقت کی گفتگو کا موضوع تعمیر ہے۔ اس سلسلہ میں جاننے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں تخریب کے درمیان تعمیر کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کوئی شخص یا کوئی قوم تنہا نہیں ہے۔ ہر شخص اور ہر قوم جو اس دنیا میں ہے وہ دوسرے اشخاص اور دوسری قوموں کے درمیان ہے۔ اس صورت حال نے موجودہ دنیا کو مقابلہ کی دنیا بنا دیا ہے۔ یہاں بار بار ایک کو دوسرے سے جھٹکا لگتا ہے۔ یہاں ہر گروہ دوسرے گروہ کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

مقابلہ کا یہ نظام خدائے ذوالجلال نے بنایا ہے۔ یہ نظام خود خالق کائنات کا قائم کردہ ہے۔ اس لیے یہ یقینی ہے کہ ہم اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اس کو جانیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ اس دنیا میں بہر حال ایسا ہوگا کہ جو مچھلی چھوٹی ہوگی اس کو بڑی مچھلی نگلنے کی کوشش کرے گی۔ اب چھوٹی مچھلی کے لیے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اتنا بڑھالے کہ وہ بڑی مچھلی کے منہ میں نہ آسکے۔

زندگی کی اسی خاص نوعیت کی بنا پر اس دنیا میں کامیابی کو صبر کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے قرآن و حدیث میں بہت زیادہ صبر کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ) خدا کی مدد انہیں لوگوں کو ملتی ہے جو صبر کریں۔ (اِعْلَمْ أَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ)

یہ صبر کوئی بزدلی کا فعل نہیں۔ صبر اعلیٰ ترین مثبت عمل ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت حال سامنے آئے تو آدمی ردعمل کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو۔ وہ اچانک بھڑک کر کوئی اقدام نہ کرے۔ حالات کتنے ہی زیادہ ناموافق ہوں وہ اپنے کو تھامے۔ وہ حالات میں گھر کر سوچنے کے بجائے حالات سے الگ ہو کر سوچے۔ اس طرح غیر متاثر ذہن کے تحت جو عمل کیا جائے اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں

صبر والا عمل ہے۔ اور جو عمل اس کے خلاف ہو اس کا نام عجلت والا عمل ۔

ایک تاریخی واقعہ

ایران حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں فتح ہوا۔ اس وقت ایران کی مسلم افواج کے سپہ سالار سعد بن ابی وقاصؓ تھے۔ ابتدائی جنگ میں ایرانیوں کا کافی نقصان ہوا۔ انہوں نے لڑائی کو اپنے حق میں غیر مفید سمجھتے ہوئے گفت و شنید کی پیش کش کی۔ حضرت سعد اس وقت قادسیہ کے میدان میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے مختلف منتخب افراد کو ایرانی سپہ سالار رستم اور ایران کے بادشاہ یزدگرد کے دربار میں بھیجا۔ مسلمانوں کے یہ نمائندے نعمان بن مقرن فرات بن حیان، حنظلہ بن ربیع، عطارد بن حاجب، اشعث بن قیس، مغیرہ بن شعبہ عمرو بن معدیکرب وغیرہ تھے۔ (البدایہ والنہایہ)

البدایہ والنہایہ میں ان سفارتوں کی کافی لمبی تفصیل درج ہے۔ آخری مرحلہ میں یہ واقعہ ہوا کہ حضرت مغیرہ اور ان کے ساتھی شہنشاہ یزدگرد کے دربار میں آئے۔ یہ دربار ایران کے قدیم شہر مداین میں تھا۔ وہاں کے زرق برق ماحول سے وہ مطلق متاثر نہیں ہوئے اور بادشاہ اور اس کے درباریوں کے سامنے انتہائی بے خوفی کے ساتھ تقریر کی۔ اس پر یزدگرد برہم ہوگیا۔ اس نے کہا کہ تم فقیر ہو کر شہنشاہِ وقت کے سامنے ایسی باتیں کر رہے ہو۔ اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ ایلچی قتل نہ کئے جائیں تو میں ضرور تم کو قتل کر دیتا۔ تم لوگ واپس جا کر اپنے امیر کو بتادو کہ میں سپہ سالار رستم کی سرکردگی میں ایسا لشکر بھیجنے والا ہوں جو تم سب کو قادسیہ کے خندق میں دفن کر دے گا۔

اس کے بعد یزدگرد نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ ایک ٹوکری میں مٹی بھر کر لاؤ۔ جب مٹی کی ٹوکری لائی گئی تو اس نے مسلمانوں کے وفد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ تم میں سب سے زیادہ شریف کون ہے۔ وفد کے افراد چپ رہے۔ اس کے بعد عاصم بن عمرو آگے بڑھے اور کہا کہ میں سب سے زیادہ شریف ہوں۔ یزدگرد نے اسلامی وفد کے دیگر ارکان سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔ یزدگرد نے حکم دیا کہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے سر پر رکھ دی جائے اور ان کو دربار سے نکال کر بھگا دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ مدائن کے باہر چلے جائیں۔

چنانچہ مٹی کی ٹوکری عاصم بن عمرو کے سر پر رکھ دی گئی۔ وہ اس کو لے کر مدائن کے شاہی محل سے نکلے اور اونٹنی پر سوار ہو کر تیزی سے قادسیہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں حضرت

سعد بن ابی وقاص مقیم تھے۔ وہاں پہونچ کر حضرت سعد کو ساری روداد سنائی گئی اور مٹی کی ٹوکری ان کے سامنے رکھ دی گئی۔ حضرت سعد اس واقعہ پر ذرا بھی برہم نہیں ہوئے۔ انہوں نے اس سے اچھا فال لیا اور فرمایا:

ابشروا فقد واللہ اعطانا اللہ اقالید ملکھم۔

خوش ہوجاؤ کیوں کہ خدا کی قسم اللہ نے ہمیں ان کے اقتدار کی کنجیاں دے دیں۔

یہی وہ بلند نظری تھی جس نے عربوں کو اس قابل بنایا کہ اپنے وقت کے انتہائی ناقابل لحاظ گروہ ہونے کے باوجود وہ اس زمانہ کی عظیم ترین سلطنتوں کے فاتح بنے۔ وہ لوگ جن کو تاریخ کا معمول سمجھ لیا گیا تھا انہوں نے اپنے عمل سے ایک نئی تاریخ پیدا کی۔

دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں ہر دن کے ساتھ رات ہوتی ہے اور ہر پھول کے ساتھ کانٹا۔ کوئی بھی شخص موجودہ دنیا میں ناخوش گواریوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا راز صرف یہ ہے کہ آدمی ناموافق حالات کے اندر موافق پہلو دریافت کرسکے۔ وہ ناخوش گوار واقعات سے یقین اور حوصلہ کی غذا لے۔ اس کے سر پر ذلت کی ٹوکری رکھی جائے مگر اس کو نظر آئے کہ رکھنے والوں نے اس کے سر پر عزت کا تاج رکھ دیا ہے۔ اس بلند کرداری کا ثبوت وہی لوگ دے سکتے ہیں جو صبر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔

مشہور ماہر نفسیات الفرڈ ایڈلر (۱۸۷۰ - ۱۹۳۷) کی پوری عمر نفسیاتِ انسانی کے مطالعہ وتحقیق میں گزری۔ عمر بھر کے مطالعہ کے بعد اس نے اپنی اس دریافت کا اعلان کیا کہ انسان کی خصوصیات میں سے ایک انتہائی حیرت ناک خصوصیت اس کی یہ طاقت ہے کہ وہ اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرسکے:

Their power to turn a minus into a plus.

یہ نادر خصوصیت ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ وہی افراد اس دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں جو اپنی اس صلاحیت کو استعمال کریں۔ اور جب اس صلاحیت کو استعمال کرنے والا ایک گروہ پیدا ہوجائے تو وہی تاریخ ساز گروہ ہوتا ہے۔ وہ انسانی تاریخ میں ایک دور کو ختم کرکے دوسرا دور لے آتا ہے۔ صحابہ کرام اس فطری صلاحیت کو استعمال کرنے میں ممتاز ترین مقام رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے عمل سے ممتاز ترین تاریخ پیدا کی۔

موجودہ حالات سے مسلمانوں نے ابھی تک صرف منفی سبق لیا ہے چنانچہ وہ احساس

مظلومی (Persecution complex) کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں لیکن اگر وہ معاملہ کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو ان مشکل حالات کو وہ اپنے لیے مثبت غذا بنا سکتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی صلاحیت کو استعمال کرکے وہ اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرسکتے ہیں۔ وہ اپنے ناموافق حالات کو اپنے لیے موافق حالات پیدا کرنے کا زینہ بنا سکتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے یقینی طور پر ایسا ہونا ممکن ہے۔ شرط صرف بلند نظری کی ہے۔ ایسا بننے کے لیے انھیں مٹی کی ٹوکری کو عزت کے تاج کے روپ میں دیکھنا ہے۔ دوسروں کے خلاف چیخ پکار کے بجائے اپنے چھپے ہوئے امکانات کو دریافت کرنا ہے۔ جن حالات کی ذمہ داری وہ دوسروں کے اوپر ڈالنے کے عادی ہوگئے ہیں ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لینا ہے۔ جس دن ایسا ہوگا اسی دن اس ملک میں ان کی ایک نئی اور شاندار تر تاریخ کا آغاز ہو جائے گا۔

صبر کی اہمیت

اس دنیا میں ہماری کامیابی یقینی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس حقیقت کو جان لیں کہ اس دنیا میں کامیابی کی منزل ناکامیوں سے گزر کر آتی ہے۔ یہاں تعمیر کا نقشہ تخریب کے ڈھانچہ میں بنتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے صبر کی بے حد اہمیت ہے۔ صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ مخالفانہ حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو۔ وہ ناخوش گوار تجربات کی بنا پر جھنجھلاہٹ کا شکار نہ ہو۔ وہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والے زخموں کو سہہ سکے۔

یہ جماؤ اور یہ سہار گویا اس بات کا وقفہ ہے کہ آدمی تھم کر سوچے۔ وہ وقتی ابال دکھانے کے بجائے دور تک سوچ کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔ وہ دوسروں کی تردید میں اپنی قوت ضائع نہ کرے بلکہ اپنی ساری طاقت اپنے کو مستحکم بنانے میں لگا دے۔

صبر اسی چیز کا مذہبی نام ہے جس کو موجودہ زمانہ میں منصوبہ بند عمل یا سوچی سمجھی کارروائی کہتے ہیں۔ منصوبہ بند عمل یا سوچا سمجھا اقدام وہی شخص کر سکتا ہے جو ناموافق حالات کو دیکھ کر بے برداشت نہ ہوتا ہو۔ جو اشتعال انگیز حالات میں ٹھنڈے ذہن کے ساتھ فیصلے لے سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ کامیابی صبر کے اُس پار ہے۔ اور ناکامی یہ ہے کہ آدمی کامیابی کو صبر کے اِس پار تلاش کرنے لگے۔ یہی دنیا کا قانون ہے۔

ایک کسان کھیتی کرتا ہے۔ تو وہ کیا کرتا ہے۔ وہ اپنا دانہ زمین میں دفن کرتا ہے۔ ایک تاجر تجارت شروع کرتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے۔ وہ اپنا سرمایہ دکان میں لگا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسان اور تاجر دونوں اپنا اثاثہ کھو دیتے ہیں۔ جو ان کے پاس ہے اس کو وہ فنا کر دیتے ہیں کیوں۔ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں پانے کے لیے کھونا پڑتا ہے۔ جہاں لینے کے لیے دینا پڑتا ہے۔ اسی بات کو انگریزی زبان میں اس طرح کہا گیا ہے :

In giving that we receive.

یعنی ہم دیتے ہیں تبھی ہم پاتے ہیں۔

خدا کی دنیا میں کھیتی اس کا نام ہے کہ بیج کو دفن کرکے فصل کی امید رکھی جائے۔ یہاں تجارت یہ ہے کہ اپنے سرمایہ کو مٹا کر نفع پانے کا انتظار کیا جائے۔ اس دنیا میں کانٹوں کے درمیان پھول کی دریافت کرنی پڑتی ہے۔ جو لوگ اس دنیا میں کانٹوں کے بغیر پھول حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ کبھی بھی پھول کو نہ پائیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے بے پھول ہو کر رہ جائیں۔

مزید نادانی یہ ہے کہ اس معاملہ میں اکثر لوگ ایک تضاد کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا ذاتی معاملہ ہو تو وہ اس حقیقت کو بہ آسانی جان لیتے ہیں۔ مگر اسی حقیقت کو وہ اس وقت بھول جاتے ہیں جب کہ وہ ملّی معاملات پر گفتگو کر رہے ہوں۔

اس دنیا میں جو شخص بھی زندگی بناتا ہے وہ اسی اصول پر اپنی زندگی بناتا ہے۔ مگر یہی لوگ جو اپنی ذاتی زندگی میں دے کر پانا چاہتے ہیں۔ ملّی زندگی کے معاملہ میں وہ یہ نعرہ لگا رہے ہیں کہ انھیں دیئے بغیر ملنا چاہیے۔ ذاتی تعمیر کے معاملہ میں ہر آدمی حقیقتِ واقعہ سے مطابقت کر رہا ہے اور ملّی تعمیر کے معاملہ میں حقیقت واقعہ سے ٹکراؤ۔ اپنی ذات کے معاملہ میں ہر آدمی حقیقت پسند ہے اور ملّت کے معاملہ میں ہر آدمی جذباتیت پسند۔

لوگ اپنی ذات کے معاملہ میں سنجیدہ ہیں اس لیے جب اپنی ذات کا معاملہ ہو تو فوراً وہ حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ مگر ملّت کے معاملہ میں لوگ سنجیدہ نہیں اس لیے جب ملّت کا موضوع ہو تو وہ حقیقت پسندی کو کھو دیتے ہیں۔ یہاں وہی لوگ غیر حقیقت پسندانہ باتیں کرنے لگتے ہیں جو اس سے پہلے مکمل طور پر حقیقت پسند بنے ہوئے تھے۔

بلند نظری

انگریزی کی ایک مثل ہے — طوفان کی بڑی چڑیا :

The big bird of the storm

یہ مثل سرد ملکوں میں آنے والے طوفان سے بنی ہے۔ یہ طوفان جب اٹھتے ہیں تو تمام چڑیاں ان کی زد میں آجاتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں بھی اور بڑی چڑیاں بھی۔ مگر عملاً یہ ہوتا ہے کہ بڑی چڑیاں بچ جاتی ہیں اور چھوٹی چڑیاں طوفان میں پھنس کر ہلاک ہوجاتی ہیں۔

چھوٹی چڑیوں اور بڑی چڑیوں میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بڑی چڑیاں قوی بازو والی ہوتی ہیں۔ وہ طوفان آتے ہی اس سے بچنے کے لیے اوپر کی طرف اڑتی ہیں۔ چونکہ طوفان کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس کا اثر زمین کی سطح سے ایک خاص اونچائی تک ہوتا ہے۔ اس لیے قوی بازو والی چڑیاں اڑکر اس حد سے اوپر نکل جاتی ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو بچا لیتی ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹی چڑیاں کمزور ہوتی ہیں۔ ان کے بازو اتنے قوی نہیں ہوتے۔ اس بنا پر ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اڑکر طوفان کی حد سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ وہ طوفان میں گھر کر ہلاک ہوجاتی ہیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ طرح طرح کے ناخوش گوار حالات پیش آتے ہیں۔ ایک شخص یا قوم کو دوسرے شخص یا قوم سے مختلف قسم کی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ کو اپنی زد میں لے لیتا ہے۔

اب دو صورتیں ہیں۔ جو لوگ حالات سے باہر آکر نہ سوچ سکیں، جو لوگ قریبی تجربات سے اوپر اٹھ کر اپنا منصوبہ نہ بنا سکیں وہ گویا طوفان کی چھوٹی چڑیا ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ دوسروں کے اٹھائے ہوئے طوفان میں گھر کر ہلاک ہوجائیں — وہ مقابلہ کی اس دنیا میں زندگی کے حق سے محروم رہیں۔

دوسری قسم ان انسانوں کی ہے جو گویا طوفان کی بڑی چڑیا ثابت ہوتے ہیں۔ وہ حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتے ہیں۔ وہ وقتی ناخوش گواریوں سے بلند ہوکر زندگی کے وسیع تر

دائروں کو دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی سوچ متاثر سوچ (Conditioned thinking) نہیں ہوتی بلکہ غیر متاثر سوچ ہوتی ہے۔ وہ رد عمل کی نفسیات سے محفوظ رہ کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔

ماضی اور حال

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ طوفان کی چھوٹی چڑیا ثابت ہوئے، وہ طوفان کی بڑی چڑیا ثابت نہ ہو سکے۔ یہی ان کے تمام مسائل کا آغاز ہے، اور یہی ان کے تمام مسائل کا اختتام بھی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے صرف دو قسم کی باتیں لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں۔ ماضی کے بارے میں فخر اور حال کے بارے میں شکایت۔ حالاں کہ نہ وہ ماضی بے سبب تھا اور نہ یہ حال بے سبب ہے۔ مسلمانوں نے ماضی سے فخر کی غذا لی اور حال سے شکایت کی غذا۔ مگر یہ دونوں ہی یکساں طور پر غلط ہیں۔ لینے کی اصل چیز سبق ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے آج کا مسلمان مکمل طور پر محروم ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اصل سبب پر غور کریں۔ وہ ماضی پر فخر کرنے کے بجائے یہ سوچیں کہ اس پُر فخر ماضی کی تعمیر ہوئی تو کس طرح ہوئی، وہ بنا تو کس طرح بنا۔ اسی طرح حال کے بارے میں انھیں اپنی سوچ کو بدلنا چاہیے۔ دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے انہیں یہ سوچنا چاہیے کہ موجودہ زمانہ میں یہ کیسے ممکن ہوا کہ دوسرے لوگ ان پر غالب آجائیں۔ اور ان پر وہ کچھ کرنے لگیں جس کو مسلمان ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوچنے کی بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان جو پہلے دوسروں کے مقابلہ میں غالب حیثیت رکھتے تھے وہ دوسروں کے مقابلہ میں مغلوب کیسے ہو گیے۔

مسلمان اگر غیر جانب داری کے ساتھ سوچیں تو وہ پائیں گے کہ ماضی اور حال دونوں کا واضح سبب موجود ہے اور اس سبب کا سرا خود مسلمانوں کے اندر ہے نہ کہ ان کے باہر۔ یہ سبب ایک لفظ میں یہ ہے کہ ہمارے اسلاف نے پانے کی قیمت ادا کی اس لیے انھوں نے پایا۔ اس کے برعکس ہم نے پانے کی قیمت ادا نہیں کی اس لیے ہم حقائق کی اس دنیا میں

پانے سے محروم رہے۔

ہمارے اسلاف نے صبر کا ثبوت دیا تھا، ہم بے صبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو دنیا والوں کے لیے نفع بخش ثابت کیا تھا، ہم دنیا والوں کے لیے صرف بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ ان پر طوفان آئے تو وہ طوفان کی بڑی چڑیا ثابت ہوئے، اس کے برعکس ہمارے اوپر طوفان آئے تو ہم نے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں کیا کہ ہم طوفان کی چھوٹی چڑیا ہیں۔ اور قدرت کا یہ قانون ہے کہ جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو طوفان کی چھوٹی چڑیا ثابت کرے اس کے لیے ہلاکت کے سوا کوئی اور انجام اسباب کی اس دنیا میں مقدر نہیں۔

ہار میں جیت

یہ دنیا خدا نے بنائی ہے۔ اور اس کے بنائے ہوئے قانون ہی پر اس دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ اس قانون کے معاملہ میں پیغمبر اور پیغمبر کے اصحاب کا استثنار بھی ممکن نہ ہو سکا پھر ہمارا استثنار کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے مکہ میں یک طرفہ طور پر ظالموں کے ظلم کو سہا۔ انہوں نے ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے زیادہ مجبور کیا تو وہ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گیے۔ اس معاملہ میں ان کا صبر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مکہ میں چھوڑی ہوئی جائدادوں کو فتح مکہ کے بعد بھی واپس نہیں لیا گیا۔ مکہ پر اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ان کو غاصبوں سے واپس لینے کا مسئلہ نہیں کھڑا کیا گیا۔

دشمنوں کے ہر قسم کے مظالم کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یکطرفہ شرائط پر صلح کر لی جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر دشمنوں نے جن جن شرائط پر اصرار کیا وہ سب آپ مانتے چلے گیے۔

حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا جانے لگا اور آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ لکھا گیا تو دشمنوں نے کہا کہ ہم اس لفظ کو پسند نہیں کرتے اس لیے آپ صرف محمد بن عبد اللہ

لکھیے ، محمد رسول اللہ مت لکھیے ۔ آپ نے ان کی ضد کو مان لیا اور رسول اللہ کا لفظ صلح نامہ سے مٹا دیا ۔ بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ ہر آدمی کا ایک مسلّمہ حق تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مطابق عمرہ کرنے جا رہے تھے مگر دشمنوں نے کہا کہ ہم آپ کو عمرہ نہیں کرنے دیں گے ۔ آپ نے ان کی اس ضد کو بھی مان لیا اور اپنے اصحاب سمیت عمرہ کیے بغیر واپس چلے گیے ۔ صلح حدیبیہ کی تمام دفعات بظاہر شکست کی دفعات تھیں مگر آپ نے ان سب دفعات کو مان لیا اور ان پر اپنی تصدیق کی مہر لگا دی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ خدا نخواستہ اسلام کو ہمیشہ کے لیے ذلّت اور شکست کے گڑھے میں ڈال دیں ۔ آپ نے ایسا اس لیے کیا کہ اسلام کو ہمیشہ کے لیے ذلّت اور شکست کے گڑھے سے نکالیں ۔ یک طرفہ شرائط پر یہ صلح اس لیے کی گئی تاکہ حالات معتدل ہوں اور تعمیری کام کے لیے پُرسکون مواقع مل سکیں ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ صلح کے بعد زبردست تعمیری کام شروع ہوگیا ۔ آپ کے صبر اور آپ کی عالی ہمتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ صرف چند سال میں پورا عرب مسخّر ہوگیا ، دشمنوں نے کاغذ پر ہار کے الفاظ لکھوائے تھے مگر تاریخ میں وہ جیت کے الفاظ بن کر لکھے گیے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تاریخ میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے ۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں دشمن کے ظلم کو سہنا پڑتا ہے تاکہ ہمیشہ کے لیے دشمن کے ظلم سے نجات حاصل ہو ۔ اس دنیا میں دشمن کی شرطوں کو ماننا پڑتا ہے تاکہ دشمن سے اپنی شرطوں کو منوایا جا سکے ۔ اس دنیا میں رسول اللہ کا لفظ اپنے ہاتھ سے مٹانا پڑتا ہے تاکہ وہ زیادہ شان کے ساتھ دوبارہ صفحۂ تاریخ پر لکھا جائے ۔ اس دنیا میں اپنے جائز حق سے دستبردار ہونا پڑتا ہے تاکہ مزید اضافہ کے ساتھ اپنا حق وصول کیا جا سکے ۔ اس دنیا میں اپنے آپ کو شکست پر راضی کرنا پڑتا ہے تاکہ ازسرِنو فتح کا دروازہ کھل سکے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن حقیقتوں کی خبر دی ہے ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرے اللہ اس کو بلند کرتا ہے (مَنْ تَوَاضَعَ رَفَعَهُ اللّٰهُ) جب اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے تو وہ لوگ کیسے اوپر اٹھائے جا سکتے ہیں جو جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں ۔

حصّہ دوم

قرآن میں تمام حقیقتوں کی تفصیل (الانعام ۱۱۴) بیان کی گئی ہے ۔ اسی طرح قرآن میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز کیا ہے ۔ یہ راز ہے نفع بخشی ۔ یعنی دوسروں کے لیے نفع بخش بننا۔ اس دنیا میں اسی شخص یا قوم کو باعزت جگہ ملتی ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے ۔ جو شخص یا قوم نفع بخشی کا ثبوت نہ دے اس کو دنیا اسی طرح رد کر دیتی ہے جس طرح دودھ سے مکھی نکال کر پھینک دی جائے ۔

زندگی کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں ملتا ہے :

انزل من السماء ماءً فسالت اودية	اللہ نے آسمان سے پانی اتارا ۔ پھر نالے اپنی مقدار
بقدرها فاحتمل السيل زبداً رابيًا	کے موافق بہہ نکلے ۔ پھر سیلاب خس وخاشاک کو
ومما يوقدون عليه في النار ابتغاء	بہالایا جو پانی کے اوپر ہے ۔ اور جن چیزوں کو
حليةٍ او متاعٍ زبدٌ مثله ۔ كذالك	آگ میں زیور اور سامان کے لیے تپاتے ہیں ان
يضرب الله الحق والباطل	کے اوپر ایسا ہی میل کچیل آجاتا ہے ۔ اللہ اسی
فاما الزبد فيذهب جُفاءً	طرح صحیح اور غلط کو بیان کرتا ہے پس جو میل کچیل
واما ما ينفع الناس فيمكث	تھا وہ پھینک دیا جاتا ہے ۔ اور جو چیز لوگوں
في الارض ۔ كذالك يضرب الله	کے لیے کارآمد ہے وہ زمین میں رہ جاتی ہے ۔ اللہ
الامثال (الرعد ۱۷)	اسی طرح بیان کرتا ہے مثالیں ۔

اس آیت میں ایک مادی تمثیل کے ذریعہ انسانی زندگی کا اصول بتایا گیا ہے ۔ مادی دنیا میں یہ واقعہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ سیلاب میں یا تپانے کے وقت مفید چیز (پانی یا دھات) اپنی جگہ رہ جاتی ہے اور جھاگ اور میل بے قیمت چیز کی طرح دور ہو جاتے ہیں ۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کا ہے ۔ یہاں بھی اس شخص یا گروہ کو مقام ملتا ہے جو اپنے آپ کو مفید ثابت کرے ۔ جو شخص یا گروہ اپنی افادیت کھو دے اس کو تاریخ اپنے کوڑا خانہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے ۔

پوری تاریخ اس قرآنی بیان کی تائید کرتی ہے ۔ اسپین میں مسلمان ۹۲ھ میں داخل ہوئے اور ۸۹۷ھ میں اسپین سے مسلم حکومت کا خاتمہ ہوا ۔ اس خاتمہ کی اصل وجہ

خود مسلمانوں کا باہمی اختلاف تھا جو اپنی آخری مکروہ شکل تک جا پہونچا تھا۔ تاہم سلطنت کے خاتمہ اور مقامی عیسائیوں کی شدید نفرت کے باوجود اسپین سے مسلمانوں کو نکالنے میں پوری ایک صدی لگ گئی۔ اسپین سے مسلم سلطنت کا خاتمہ نویں صدی ہجری کے آخر میں ہوا۔ مگر مسلمانوں کا آخری قافلہ اسپین سے دسویں صدی ہجری کے آخر میں نکل سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان "ماہرین" پورے اسپین کی صنعت، تجارت اور زراعت پر چھائے ہوئے تھے وہی وہاں کی تعلیم گاہیں، دوا خانے اور سماجی خدمت کے ادارے چلا رہے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں اسپینی باشندوں کی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں نے اسپین میں جو رصدگاہیں چھوڑیں ان کو استعمال کرنا انھیں نہ آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجبورًا ان رصدگاہوں کو گرجا کے گھنٹہ گھر میں تبدیل کر دیا۔

یہی معاملہ بیسویں صدی میں مغرب کی استعماری طاقتوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان استعماری قوموں کو ایشیا اور افریقہ کے حریت پسندوں نے بے پناہ قربانی کے بعد اپنے ملکوں سے نکالا۔ مگر جب سیاسی انخلار کا عمل ہو چکا تو معلوم ہوا کہ اپنے علمی اور تمدنی اداروں کو چلانے کے لیے ان کے پاس افراد نہیں ہیں۔ چنانچہ ہر آزاد شدہ ملک میں دوبارہ انہیں مغربی ملکوں سے ماہرین اور فنی اساتذہ درآمد کیے جانے لگے۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ سیاسی آزادی بالآخر ٹکنکل محکومی میں تبدیل ہو گئی۔ آج مغربی ممالک ان ملکوں میں اقتصادی اور سائنسی طور پر چھائے ہوئے ہیں جس طرح اس سے پہلے وہ یہاں سیاسی طور پر چھائے ہوئے تھے۔

ہندستان میں جس طرح مسلمان اقلیت میں ہیں اسی طرح عیسائی بھی یہاں اقلیت میں ہیں۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ اکثریتی فرقہ کو جو شکایات ہو سکتی ہیں وہ سب عیسائی فرقہ کی بابت بھی موجود ہیں۔ اس کے باوجود عیسائیوں کو اس ملک میں وہ مشکلات پیش نہیں آرہی ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہی ہیں؛

عیسائیت ایک تبلیغی مذہب ہے اور نہایت منظم طور پر اپنی تبلیغی مہم میں مشغول ہے۔
عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نجات صرف عیسائیت میں ہے، کسی اور مذہب میں نہیں۔
عیسائی اپنے علٰحدہ تشخص کو قائم رکھنا انتہائی ضروری سمجھتے ہیں۔
عیسائیوں کی ہم مذہب قوم نے باہر سے آکر ہندستان پر حملہ کیا اور وسیع پیمانہ پر

اس کا منظم استحصال کیا ۔

عیسائیوں کے ہم عقیدہ حکمرانوں نے ملک کو تقسیم کرنے میں تقسیم پسندوں کا ساتھ دیا ۔

عیسائیوں کی مذہبی وفاداری کا مرکز ہندستان سے باہر واقع ہے ۔

عیسائی مشنریوں پر یہ الزام ہے کہ وہ استعماری طاقتوں کے اگلے دستہ کا کام کرتی ہیں ۔

اس کے باوجود ہندستان میں عیسائیوں کے تمام مفادات پوری طرح محفوظ ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک کے لیے نفع بخش گروہ بنے ہوئے ہیں ۔ وہ اس ملک میں دینے والے ہیں نہ کہ صرف لینے والے ۔

عیسائیوں کی تعداد ہندستان میں دو کرور سے کچھ زیادہ ہے ۔ وہ آبادی کا تقریباً دو فی صد حصہ ہیں ۔ جب کہ مسلمان کم از کم بارہ فی صد حصہ ہیں ۔ مگر دونوں فرقوں میں یہ زبردست فرق ہے کہ عیسائیوں نے اس ملک میں اسپتال ، تعلیم گاہیں اور رفاہی ادارے اتنی بڑی مقدار میں قائم کر رکھے ہیں جو ان کی اپنی آبادی کی ضرورت سے بہت زیادہ ہیں ۔ سرکاری ملازمین اور حکام کی بہت بڑی تعداد عیسائی اداروں کی تعلیم یافتہ ہے ۔ عیسائیوں کے قائم کیے ہوئے اسپتال اس ملک کے بہترین اسپتال سمجھے جاتے ہیں ۔ معذوروں حتیٰ کہ کوڑھیوں تک کی خدمت کے لیے انہوں نے بے شمار ادارے قائم کر رکھے ہیں ۔ وغیرہ ۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس ملک میں صرف احتجاج اور مطالبہ کرنے والے گروہ بنے ہوئے ہیں ۔ ان کے پاس خود اپنی قومی ضرورت کے بقدر بھی تعلیم گاہیں اور اسپتال اور رفاہی ادارے نہیں ہیں ۔ کجاکہ وہ ان میدانوں میں دوسرے فرقوں کے خادم بن سکیں ۔

یہ صورت حال قانونِ قدرت کے سراسر خلاف ہے ۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو جس تعصب یا امتیاز کی شکایت ہے وہ خدائی قانون کی بنا پر ہے نہ کہ کسی ظالم کے ظلم کی بنا پر ۔

اس دنیا کا خالق خدا ہے ۔ یہاں وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے کہ ہو ۔ خدا نے پیاس بجھانے کے لیے پانی بنایا ہے اور گاڑی چلانے کے لیے پٹرول ۔ اب آپ کی کامیابی اسی میں ہے کہ آپ پانی کو اپنی پیاس بجھانے کے لیے استعمال کریں ۔ اور جب گاڑی چلانا ہو تو پٹرول کے ذریعہ گاڑی چلائیں ۔ اگر آپ اس کے برعکس عمل کریں یعنی پٹرول سے پیاس بجھانا چاہیں اور پانی سے گاڑی چلانے کی کوشش کریں تو یقینی طور پر آپ ناکام رہیں گے ۔

اس دنیا کو خدا نے مقابلہ کی دنیا بنایا ہے ۔ یہاں ہر ایک کو آزادی ہے ۔ اور ہر ایک

اپنی اپنی محنت اور قابلیت سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ مقابلہ کا اصول خود خدا کا مقرر کیا ہوا ہے، اس کو آپ ختم نہیں کر سکتے۔ آپ کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مقابلہ کے میدان میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے کر اپنی جگہ حاصل کریں۔ اگر آپ چاہیں کہ دنیا کا نظام مقابلہ کے بجائے مطالبہ کی بنیاد پر چلنے لگے تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مطالبہ اور احتجاج کی بنیاد پر جینا چاہتے ہوں تو آپ کو خدا کی دنیا کے سوا کوئی دوسری دنیا بنانی پڑے گی۔ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان گاہ بنایا ہے۔ یہاں ہر شخص کو عمل کی آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ مختلف اشخاص اور مختلف قوموں کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے مقابلہ اور مسابقت کی یہ فضا کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ خواہ دنیا میں اسلامی حکومت ہو یا غیر اسلامی حکومت۔

اب سوچنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے حالات میں گھر کر سوچنا اور دوسرا ہے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا۔ چونکہ یہ دنیا کبھی ناموافق اسباب سے خالی نہیں ہو سکتی اس لیے جو لوگ حالات میں گھر کر سوچیں ان کی سوچ ہمیشہ شکایتی سوچ رہے گی۔ ان کا فکر ردعمل کی نفسیات کے تحت بنے گا۔ اپنی قوتوں کو بروئے کار لانے کے بجائے وہ بے فائدہ طور پر دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے اور بطور خود یہ سمجھیں گے کہ وہ کوئی کام کر رہے ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ حالات سے اوپر اٹھ کر سوچیں ان کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگتی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قانونِ قدرت کے مطابق ہو رہا ہے نہ کہ ظلم اور تعصب کی بنا پر ہو رہا ہے۔ یہ چیز انہیں حقیقت پسند بنا دیتی ہے۔ ان کی سوچ مطابق واقعہ سوچ بن جاتی ہے۔ وہ حالات کو مان کر اس کے ڈھانچے میں اپنی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے خلاف چیخ پکار کرنے کے بجائے اپنی محنت سے اپنے آپ کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان ”تعصب“ کی اصطلاحوں میں سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لیے ان کی پوری سوچ ایسی ہو گئی ہے جیسے کہ کوئی بند کوٹھری میں سوچے۔ اگر وہ ”حقیقت پسندی“ کی اصطلاح میں سوچنے لگیں تو اچانک وہ محسوس کریں گے کہ وہ ایک کھلی فضا میں پہونچ گئے ہیں پہلی صورت میں ان کو راہیں بند نظر آتی ہیں۔ مگر دوسری صورت میں انہیں ہر طرف راہیں کھلی ہوئی نظر آنے لگیں گی۔

ایک مثال لیجئے ۔ مسلمانوں کو شکایت ہے کہ اردو زبان کے ساتھ اس ملک میں تعصب کیا جاتا ہے ۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اردو کا مسئلہ خود اردو کی اپنی کمی کا مسئلہ ہے نہ کہ کسی خارجی تعصب کا مسئلہ ۔ اور وہ یہ کہ اردو زبان موجودہ زمانے میں اپنی اہمیت منوانے میں ناکام رہی ہے یہی وجہ ہے کہ جو مسلم لیڈر اردو زبان کا جھنڈا اٹھاتے ہیں وہ خود بھی اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں تعلیم دلانا ضروری سمجھتے ہیں ۔

ستمبر ۱۹۵۹ء سے پہلے روسی زبان امریکہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی ۔ مگر اسی مہینہ جب یہ خبر چھپی کہ روس کا راکٹ (لیونک نمبر ۲) سات ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا میں سفر کرکے ۳۴ گھنٹہ میں چاند پر پہونچ گیا تو اچانک روسی زبان نے علمی دنیا میں زبردست اہمیت حاصل کرلی ۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ روس خلائی ٹکنالوجی میں امریکہ سے آگے نکل گیا ہے ۔ امریکہ کے ماہرین شدت سے محسوس کرنے لگے کہ خلائی ٹکنالوجی میں ان کا مطالعہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک وہ اس موضوع پر روسی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں نہ پڑھ لیں ۔ چنانچہ امریکہ میں ایک نیا ذہن شدت سے ابھر آیا ۔ روسی زبان کے تمام سائنسی جرنل امریکہ میں منگائے جانے لگے اور شروع سے آخر تک ان کا انگریزی ترجمہ کرکے انہیں امریکہ میں شائع کیا جانے لگا ۔ آج روسی زبان کی تمام اہم سائنسی کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہوکر یورپ اور امریکہ کی لائبریریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں ۔ روسی زبان نے یہ اہمیت احتجاج اور مطالبہ کے ذریعہ حاصل نہیں کی بلکہ استحقاق کا ثبوت دے کر حاصل کی ہے ۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں جاپانی زبان کا ہوا ہے ۔ بیسویں صدی کے نصف تک مغربی ملکوں میں جاپانی زبان کی کوئی اہمیت نہ تھی ۔ مگر آج جاپانی زبان میں چھپنے والی سائنسی کتابیں انگریزی زبان میں ترجمہ ہوکر زبردست مقبولیت حاصل کر رہی ہیں ۔ اس کی وجہ الکٹرانکس میں جاپان کی ترقی ہے ۔ جدید مغربی علماء یہ محسوس کر رہے ہیں کہ الکٹرانکس میں ان کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس موضوع پر جاپان میں ہونے والی تحقیقات کو نہ پڑھ لیں ۔ جاپانی زبان نے اپنی اہمیت ثابت کرکے مغربی دنیا میں وہ مقام حاصل کرلیا جو اس سے پہلے اس کو حاصل نہ تھا ۔

اردو کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ذخیرہ میں یا تو شعر و شاعری ہے یا خطیبانہ انداز میں لکھی ہوئی کتابیں ۔ اور موجودہ سائنسی دور میں شاعری اور خطابت دونوں ہی اپنا وزن کھوچکے

ہیں۔ کوئی بھی شعبۂ فن ایسا نہیں ہے جس میں اردو نے اعلیٰ معیار کی کتابیں تخلیق کی ہوں اور لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ اردو کتابیں پڑھے بغیر ان موضوعات پر ان کا مطالعہ مکمل نہ ہوگا۔ فلسفہ، سائنس تاریخ، سماجیات، ٹکنالوجی، کسی بھی فن پر اردو زبان میں ایسی کتابیں موجود نہیں جن کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہو۔ ایسے علمی افلاس کی حالت میں اردو کو اس کے وارثین بھی اہمیت نہیں دے سکتے کجا کہ ہم دوسروں سے یہ امید رکھیں کہ وہ اس کو اہمیت دیں گے۔

قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق اس دنیا میں زندگی کا راز نفع بخشی ہے۔ یہاں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اہلیت کا ثبوت دے کر زندگی ملتی ہے نہ کہ مطالبہ اور چیخ پکار کے ذریعہ۔ دنیا کا یہ نظام خود اس خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے دنیا کو تخلیق کیا ہے۔ جو لوگ خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا پر راضی نہ ہوں انہیں اپنی مرضی کے مطابق کوئی دوسری دنیا بنانی چاہیے۔ خدا کی دنیا میں خدا کی مرضی پر چل کر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے نہ کہ اپنی مرضی پر چل کر۔

تاریخ کا سبق

مسلمانوں کے پچھلے دور کو سنہرا دور (Golden period) کہا جاتا ہے۔ مسلمان اپنے اس دور پر فخر کرتے ہیں۔ ان کے شاعر اور خطیب اس کا پرجوش الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے مصنف اس پر شاندار کتابیں تصنیف کرتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ شاندار دور وجود میں آیا تو کس طرح وجود میں آیا۔

یہ طریقہ سراسر جاہلی طریقہ ہے کہ واقعات سے فخر کی غذا لی جائے۔ واقعات کے مطالعہ کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اس سے سبق کی غذا لی جائے۔ جب آپ ایک واقعہ کو حقیقت سے لنک (link) کریں تو اسی کے نتیجہ کا نام سبق ہے۔ اور جب آپ واقعہ کو حقیقت سے لنک نہ کرسکیں تو وہ واقعہ آپ کے لیے صرف جھوٹا فخر بن کر رہ جائے گا، وہ آپ کی روح کے لیے تعمیری غذا نہیں بنے گا۔

آپ اپنی تاریخ کا مطالعہ حقیقت کی روشنی میں کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ سنہرا دور مطالبات کی مہم کے ذریعے وجود میں نہیں آیا۔ حقوق طلبی کی سیاست نے اس کو پیدا نہیں کیا۔ یہ دور نفع بخشی کی صلاحیت کا ثبوت دے کر وجود میں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کامیاب ترین دور وہی تھا جو نفع بخشی کے اعتبار سے کامیاب ترین دور تھا۔ یہی نفع بخشی کی صلاحیت تھی جس نے مسلمانوں کو دنیا میں عروج کے اعلیٰ مقام پر پہونچا دیا۔

آج امریکہ اور روس اور انگلینڈ تہذیب جدید کے مراکز سمجھے جاتے ہیں مگر آپ جانتے ہیں

کہ یہ وہ مقامات نہیں ہیں جہاں تہذیب جدید کی بنیاد پڑی ہو۔ یا جہاں سے علم کا احیاء شروع ہوا ہو۔

علم اور تہذیب کا آغاز جن یورپی علاقوں سے ہوا وہ اسپین اور سسلی اور اٹلی ہیں۔ یورپ کے انہیں ساحلی علاقوں میں ابتداءً علم کا احیاء ہوا اور تہذیب جدید کی بنیاد پڑی۔ یہاں سے پھر وہ دوسرے مغربی ملکوں میں پہونچا۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں علم اور تہذیب مسلمانوں کے ذریعہ پہونچے۔ مسلم عہد سے پہلے یورپ کا براعظم تاریکی کا براعظم بنا ہوا تھا۔ یہ مسلمان تھے جنہوں نے یورپ میں علم کی روشنی پہونچائی۔ مسلمان ابتداءً جب یورپ میں داخل ہوئے تو وہ افریقہ کی طرف سے سمندر پار کرکے وہاں داخل ہوئے۔ وہ مراکش کے راستے سے سمندر پار کرکے اسپین پہونچے۔ اسی طرح وہ تیونس کے راستے سے میڈیٹرینین کو پار کرکے سسلی اور اٹلی میں داخل ہوئے۔ مسلمانوں نے ان یورپی علاقوں میں علم اور تہذیب کی بنیاد رکھی اور پھر یہ علم اور تہذیب پہلے مغربی یورپ میں اور بعد کو امریکہ تک پہونچے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان ہی وہ گروہ تھے جو مغرب میں علم اور تہذیب داخل کرنے کا سبب بنے۔

گویا جس زمانہ میں مسلمانوں کو عروج ہوا اس زمانہ میں ان کی نفع بخشی اتنی زیادہ بڑھی ہوئی تھی کہ وہ جس زمین پر اپنا قدم رکھتے تھے وہاں علم اور تہذیب کا چشمہ پھوٹ پڑتا تھا۔ وہاں کی تاریک تاریخ روشن تاریخ میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا کہیں جانا ایسا ہی تھا جیسے پانی کا کسی خشک زمین میں جانا۔

لندن کے برٹش میوزیم میں ایک سونے کا سکّہ رکھا ہوا ہے۔ یہ سکہ ۷۷۴ء میں ڈھالا گیا تھا۔ اس سکہ پر اوفا رکس (Offa Rex) کا نام کندہ ہے۔ یہ قدیم انگلینڈ کا ایک بادشاہ تھا جس کا زمانہ حکومت (۷۵۷ - ۷۹۶ء) ہے۔ اس سکہ کے ایک طرف مسیحی بادشاہ کا نام کندہ ہے اور دوسری طرف کلمۂ شہادت (لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ) عربی خط میں لکھا ہوا ہے۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربس (۱۹۷۹) میں صفحہ ۳۱۶ پر اس سکہ کی تصویر چھاپی ہے۔ سکہ کے نیچے مصنف نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اینگلو سیکسن دور کا سونے کا سکّہ جس میں ۷۷۴ء کے عرب دینار کی نقل کی گئی ہے:

Anglo-Saxon gold coin imitating an Arab dinar of the year 774.

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان علم وفن میں اتنا زیادہ آگے تھے کہ ہر معاملہ میں ان کی تقلید کی جاتی تھی حتیٰ کہ کلمۂ شہادت کے معاملہ میں بھی ۔

مسلمانوں نے فن طب ابتداءً یونانیوں سے لیا ۔ مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی محنت سے اس میں اتنے زیادہ اضافے کیے کہ وہ اس زمانہ میں فن طب کے امام بن گیے ۔ ابن سینا (Avicenna) کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں یہ الفاظ درج ہیں ۔ اس کی کتاب القانون فی الطّب جوکہ طب کی تاریخ میں انتہائی مشہور کتابوں میں سے ہے :

> — the Canon of medicine, which is among the most famous books in the history of medicine (I/681).

سسلی کا بادشاہ راجر دوم (۱۰۹۵ - ۱۱۵۴ء) اپنے زمانہ کا ایک ممتاز یوروپی بادشاہ تھا ۔ اس کو یہ شوق ہوا کہ ایک عالمی نقشہ تیار کرائے جس میں اس کی سلطنت کا جائے وقوع دکھایا گیا ہو ۔ اس نقشہ کو تیار کرنے کے لیے اس وقت جو سب سے زیادہ لائق شخص سسلی کے بادشاہ کو مل سکا وہ الادریسی تھا ۔ الادریسی مراکش میں پیدا ہوا ۔ اس نے اسپین کی مسلم درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد وہ ایشیا ، افریقہ ، اور یورپ کے سفر کرتا رہا ۔ وہ اپنے زمانہ میں جغرافیہ کا سب سے بڑا عالم تھا ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے الادریسی کے بارے میں حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں :

> Al-Idrisi was a close friend and adviser to Roger II, the Norman king of Sicily, at whose court he served as official geographer. Roger II invited Al-Idrisi to Sicily to make a map of the world for him (9/198).

شاہ راجر دوم سسلی کا نارمن بادشاہ تھا ۔ الادریسی اس کا قریبی دوست اور مشیر تھا ۔ الادریسی نے سسلی کے اس بادشاہ کے دربار میں سرکاری جغرافیہ نویس کے طور پر کام کیا ۔ راجر دوم نے الادریسی کو بلایا تھا کہ وہ اس کے لیے دنیا کا ایک نقشہ تیار کرے ۔

موجودہ مسلمان

یہ قدیم زمانہ میں مسلمانوں کا حال تھا ۔ مگر آج صورت حال اس کے برعکس ہے ۔ آج مسلمان ساری دنیا میں دوسروں کے لیے بوجھ (Liability) بنے ہوئے ہیں ۔ وہ آج کی دنیا میں لوگوں کے لیے سرمایہ (Asset) کی حیثیت سے باقی نہیں رہے ہیں ۔

آج ساری دنیا میں مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ وہ علوم و فنون میں پیچھے ہیں۔ جدید دنیا کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں انہیں ستون کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ آج ایک جھگڑا فساد کرنے والی قوم ہیں۔ وہ داداگیری، اسمگلنگ، دہشت پسندی، سیاسی توڑ پھوڑ میں نام پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ان کے قائدین خیالی شاعری اور پُرجوش خطابت کا تحفہ دنیا کو پیش کر رہے ہیں۔ مسلمان آج کی دنیا میں صرف لینے والی قوم بنے ہوئے ہیں، وہ آج کی دنیا میں دینے والی قوم نہ بن سکے۔ ایسے بے فیض لوگوں کے لیے خدا کا قانون یہی ہے کہ انہیں دنیا میں کبھی عزت کا مقام نہ ملے۔

یکم جنوری ۱۹۸۶

اسلام اور سائنس

اس مختصر مقالہ میں مجھے اس سوال کی تحقیق کرنی ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں پیچھے کیوں ہوگیے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان سائنس کی تعلیم میں اس لیے پیچھے ہیں کہ ان کا مذہب سائنس کی تعلیم کا مخالف ہے، یا کم از کم اس کو پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ بات حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن میں کثیر تعداد میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں مختلف طریقوں سے اس امر پہ زور دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی چیزوں پر غور کرو۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ اسلام کے ماننے والے زمین و آسمان کی چیزوں کا مطالعہ نہ کریں جس کا دوسرا نام سائنس ہے۔ اسلام کے نزدیک کائنات کے مطالعہ کا سب سے پہلا فائدہ معرفت ہے۔ یعنی مخلوق کے اندر خالق کا مشاہدہ کرنا۔ تاہم جب لوگ کائنات کو قابل غور سمجھ کر اسے دیکھتے ہیں تو اسی سے وہ چیز بھی برآمد ہوتی ہے جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے سائنس کے شعبوں میں زبردست ترقی کی۔ حتیٰ کہ جس زمانہ میں یوروپ کی قوموں نے سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا اس وقت مسلمان سائنس کی راہ میں شاندار ترقیاں حاصل کر چکے تھے۔ برٹرینڈ رسل نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک کے دور کو ہم تاریک دور کہتے ہیں۔ یہ مغربی یوروپ کو غیر واقعی اہمیت دینا ہے۔ اسی زمانہ میں چین میں تنگ کی حکومت تھی جو کہ چینی شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ اور کئی دوسرے پہلوؤں سے بہت اہم دور ہے۔ اسی زمانہ میں ہندستان سے لے کر اسپین تک اسلام کی شاندار تہذیب چھائی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جو چیز مسیحیت کے لیے کھوئی ہوئی تھی وہ تہذیب کے لیے کھوئی ہوئی نہ تھی بلکہ اس کے برعکس تھی:

Our use of the phrase 'the Dark Ages' to cover the period, from 600 to 1000 marks our undue concentration on Western Europe. In China, this period includes the time of the Tang dynasty, the greatest age of Chinese poetry, and in many other ways a most remarkable epoch. From India to Spain, the brilliant civilization of Islam flourished. What was lost to Christendom at this time was not lost to civilization, but quite the contrary.

Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, p. 395

زمانہ سے آگے

قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے طب اور سائنس کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ تعجب خیز حد تک عظیم ہیں۔ الرازی (۸۶۵ – ۹۳۲) اور ابن سینا (۹۸۰ – ۱۰۳۷) اپنے وقت کے سب سے بڑے ماہرین طب تھے جن کا کوئی ثانی اس وقت کی دنیا میں موجود نہ تھا۔ ابن سینا کی کتاب القانون فی الطب علم طب پر ایک بنیادی کتاب ہے۔ وہ دنیا کے اکثر طبی اداروں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ فرانس میں وہ ۱۶۵۰ء تک داخل نصاب تھی:

Al-Qanun became a classic and was used at many medical schools, at Montpellier, France, as late as 1650. (11/828).

مسلمانوں کے یہ کارنامے عام طور پر مشہور اور معلوم ہیں۔ ان پر بے شمار کتابیں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک سوال ہے۔ اور یہ سوال اس کی توجیہہ کے بارہ میں ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

The greatest contribution of Arabian medicine was in Chemistry and in the knowledge and preparation of medicines; many drugs now in use are of Arab origin, as also are such processes as distillation and sublimation. Often the chemistry of that time was mainly a search for the philosopher's stone, which supposedly would turn all common metals to gold. Astronomers were astrologers and chemists were alchemists. It is, therefore, surprising that, despite all this, the physicians of the Muslim empire did make a noteworthy contribution to medical progress (11/828).

طب عربی کی سب سے بڑی خدمت کیمسٹری اور دواؤں کے علم اور ان کی تیاری کے بارے میں تھی اکثر دوائیں جو آج استعمال ہوتی ہیں ان کی اصل عرب ہی ہے۔ اسی طرح تقطیر اور تصعید جیسے عمل بھی۔ اس زمانہ کی کیمسٹری اکثر و بیشتر پارس پتھر کی تلاش کا نام تھی، جس کے متعلق یہ

گمان کر لیا گیا تھا کہ وہ تمام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس زمانہ کے فلکیات داں محض نجومی ہوتے تھے۔ اور کیمسٹری کے علما صرف کیمیا گری کرتے تھے۔ اس لیے یہ تعجب خیز بات ہے کہ ان سب کے باوجود مسلم عہد کے اطبا نے طب کی ترقی میں قیمتی اضافے کیے۔

اسلام سائنس کا خالق

یہ باتیں وہ ہیں جن کا عام طور پر مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام بلاشبہ سائنس کے لیے نہیں آیا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سائنسی انقلاب خود اسلامی انقلاب کی ضمنی پیداوار ہے۔ اسلام اور سائنس کے اس تعلق کو بریفالٹ نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ ہماری سائنس پر عربوں کا قرضہ صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے حیران کن نظریات دیے۔ سائنس اس سے زیادہ عربوں کی مقروض ہے۔ یہ خود اپنے وجود کے لیے ان کی احسان مند ہے:

> The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we saw, pre-scientific. The Astronomy and Mathematics of the Greeks were a foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek culture. The Greeks systematized, generalized, and theorized, but the patient ways of investigation, the accumulation of positive knowledge, the minute method of science, detailed and prolonged observation and experimental inquiry were altogether alien to the Greek temperament. Only in Hellenistic Alexandria was any approach to scientific work conducted in the ancient classical world. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of Mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.
>
> Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سائنس کا خالق ہے۔ سائنس سادہ طور پر مطالعہ فطرت (Study of nature) کا نام ہے۔ انسان جب سے زمین پر آباد ہے اسی وقت سے فطرت اس کے سامنے موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت کے مطالعہ اور تسخیر میں انسان کو اتنی زیادہ دیر لگی۔ سائنس کی تمام ترقیاں پچھلے ہزار برس کے اندر ظہور میں آئی ہیں۔ جب کہ اصولاً انھیں لاکھوں سال پہلے ظاہر ہوجانا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ قدیم زمانہ میں شرک کا غلبہ ہے۔ شرک اس میں مانع تھا کہ آدمی فطرت کا مطالعہ

کرے اور اس کی قوتوں کو دریافت کر کے انھیں اپنے کام میں لائے۔

شرک کیا ہے۔ شرک نام ہے فطرت کو پوجنے کا۔ قدیم زمانہ میں یہی شرک تمام اقوام کا مذہب تھا:

> For the ancient man, Nature was not just a treasure-trove of natural resources, but a goddess, Mother Earth. And the vegetation that sprang from the earth, the animals that roamed the earth's surface, and the minerals hiding in the earth's bowels, all partook of nature's divinity, so did all natural phenomenon — springs and rivers and the sea; mountains, earthquakes and lightening and thunder.

غرض زمین سے آسمان تک جو چیز بھی انسان کو نمایاں نظر آئی اس کو اس نے اپنا خدا فرض کر لیا اسی کا نام شرک ہے اور یہ شرک اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں میں دنیا کا غالب فکر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم انسان کے لیے فطرت پرستش کا موضوع (Object of worship) بنی ہوئی تھی۔ پھر عین اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع (Object of investigation) کیسے بنتی۔ یہی اصل وجہ ہے جس کی بنا پر قدیم انسان اس طرف راغب نہ ہو سکا کہ وہ فطرت کا مطالعہ کرے۔ تمام قدیم زمانوں میں انسان فطرت کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے جھکتا رہا ہے۔ فطرت کو مقدس نظر سے دیکھنا انسان کے لیے اس میں روک بنا رہا کہ وہ فطرت کی تحقیق کرے اور اس کو اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے استعمال کرے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فطرت پرستی (شرک) کے اس دور کو سب سے پہلے جس نے ختم کیا وہ توحید (Monotheism) ہے۔ توحید کے عقیدے نے پہلی بار انسان کو یہ ذہن دیا کہ فطرت خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ وہ پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز ہے۔ اس کے آگے جھکنا نہیں ہے بلکہ اس کو تسخیر کرنا ہے تاہم جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ توحید کے نظریہ کو پہلی بار اسلام نے عملی طور پر رائج کیا تو یہ انقلاب براہ راست اسلام کا کارنامہ قرار پاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے تمام پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آئے۔ ہر دور میں خدا کے جن بندوں نے سچائی کی تبلیغ کی انھوں نے خالص توحید ہی کی تبلیغ کی۔ مگر اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ توحید کے نظریہ کو مان لیں اور توحید کی بنیاد پر انسانی معاشرہ میں وسیع انقلاب برپا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے

انسان کبھی توحید کے حقیقی ثمرات سے آشنا نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، خدا کا ہر پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آیا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ ان کے پیرو ان کے لائے ہوئے دین کی حفاظت نہ کر سکے۔ انھوں نے توحید میں شرک کی آمیزش کر دی۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح نے خالص توحید کا پیغام دیا مگر ان کے بعد ان کے پیروؤں نے خود حضرت مسیح کو خدا سمجھ لیا۔ ان کا یہ مشرکانہ عقیدہ مختلف پہلوؤں سے سائنس کی ترقی کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ مثلاً کچھ علمائے فلکیات نے نظامِ شمسی کی تحقیق کی۔ وہ اس حقیقت تک پہونچے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ مگر عیسائی علماء ایسے لوگوں کے سخت مخالف ہو گیے۔ اس کی وجہ ان کا مذکورہ مشرکانہ عقیدہ تھا۔ انھوں نے زمین کو خداوند کی جنم بھومی فرض کر رکھا تھا اس لیے ان کے لیے ناقابل فہم ہو گیا کہ جس زمین پر خدا پیدا ہوا ہو وہ زمین نظامِ شمسی کا مرکز نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت محض ایک تابع کی قرار پائے۔ اپنے مشرکانہ عقیدہ کو بچانے کے لیے انھوں نے سائنسی حقیقت کا انکار کر دیا۔

دوسری بات یہ کہ پچھلے تمام پیغمبروں کا مشن صرف اعلان کی حد تک جا سکا وہ عملی انقلاب تک نہیں پہونچا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی انسانی تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جنھوں نے توحید کو ایک زندہ عمل بنایا۔ انھوں نے اولاً عرب میں شرک (مظاہر فطرت کی پرستش) کا مکمل خاتمہ کیا اور توحید کو عملی طور پر انسانی زندگی میں رائج کیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور قدیم زمانہ کی تقریباً تمام آباد دنیا میں شرک کو مغلوب کر دیا۔ انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے تمام بُت خانوں کو کھنڈر بنا دیا اور توحید کو ایک عالمی انقلاب کی حیثیت دے دی۔

اہلِ اسلام کے ذریعہ توحید کا جو عالمی انقلاب آیا اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توہم پرستی کا دور ختم ہو۔ اب مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹا دیا گیا۔ ایک خدا انسان کا معبود قرار پایا۔ اس کے علاوہ جو تمام چیزیں ہیں وہ سب صرف مخلوق بن کر رہ گئیں۔

انسانی تاریخ میں اسلام کے ظہور سے جو عظیم تبدیلی آئی اس کا اعتراف ایک امریکی انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا:

Its advent changed the course of human history.

مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ فوراً انسان کے لیے تحقیق اور تسخیر

کا موضوع بن گیے۔ مظاہر فطرت کی تحقیق و تسخیر کا آغاز مدینہ میں ہوا۔ پھر دمشق اور بغداد اس کے مرکز بنے اس کے بعد یہ لہر سمندر پار کر کے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئی، وہاں سے وہ مزید آگے بڑھ کر اٹلی اور فرانس تک جا پہونچی۔ یہ تاریخی عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ وہ جدید سائنسی انقلاب تک پہونچ گیا۔ مغرب کا سائنسی انقلاب اس اعتبار سے اسلامی انقلاب کا انتہائی نقطہ ہے۔ وہ توحید کے انقلاب کا سکولر نتیجہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو اسلام سائنس کا بانی تھا۔ اور جس کے ماننے والے اپنے ابتدائی دور میں ساری دنیا کے لیے سائنس کے معلم بنے اسی اسلام کے ماننے والے موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں دوسروں سے پیچھے کیوں ہو گیے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی ہے۔ مسلمانوں نے ابتداءً جو سائنسی انقلاب برپا کیا تھا وہ اسپین تک پہونچنے کے بعد مغربی قوموں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس کی ترقیاں زیادہ تر اہلِ مغرب کے ہاتھوں ہوئیں۔ اس زمانہ میں بھی اگرچہ دنیا کا بڑا حصہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں تھا مگر سائنس کی ترقی کا کام صلیبی جنگوں کے بعد مغربی یوروپ کے ذریعہ انجام پاتا رہا۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں سائنس کے میدان میں جو ترقیاں کی تھیں اس کا پہلا سب سے بڑا فائدہ ان کو دو سو سالہ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵-۱۲۷۰) میں ہوا۔ اس جنگ میں تقریباً سارا یوروپ متحدہ طاقت سے مسلم دنیا پر حملہ آور ہوا تاکہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضہ سے واپس لے۔ مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ان مہموں میں کروروں جانیں اور بے پناہ دولت قربان کر دی گئی۔ اور جب یہ سب ختم ہوا تو یروشلم بدستور "بددینوں" کے قبضہ میں تھا:

> Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises. And when all was done, Jerusalem remained in the possession of the "infidels".
>
> *Pears Cyclopaedia*, (1953-1954), p. 539

صلیبی جنگوں کا خاتمہ مسلمانوں کی کامل فتح اور مسیحی یوروپ کی کامل شکست پر ہوا۔ مسلمانوں کی فتح ان کے لیے الٹی پڑی۔ اس کے برعکس عیسائیوں کو ان کی شکست کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ مسلمان اپنی سیاسی فتح پر قانع ہو کر رہ گیے۔ کامیابی کے احساس نے ان کی عملی قوتوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اس کے برعکس مسیحی یوروپ کو اپنی ناکامی کا یہ فائدہ ملا کہ اس کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ اپنی کمزوریوں کو معلوم کرکے ان کی تلافی کرے۔ چنانچہ اس کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ تبلیغ کی کہ مسلمانوں کی زبان عربی سیکھو اور ان کی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کرو۔ یہ رجحان یوروپ میں تیزی سے پھیلا۔ مسلمانوں کی اکثر کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں جو اس وقت یوروپ کی علمی زبان تھی۔ یہ عمل کئی سو سال تک جاری رہا۔ ایک طرف مسلمان اپنی سیاسی کامیابی میں گم تھے، دوسری طرف یوروپ علمی میدان میں مسلسل ترقی کر رہا تھا۔

یوروپ کا یہ علمی سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ویں صدی آگئی جب کہ یوروپ واضح طور پر مسلم دنیا سے آگے بڑھ گیا۔

مغربی یوروپ نے سائنس کو جدید ٹکنالوجی تک پہونچا دیا۔ اس نے دستکاری کی جگہ مشینی صنعت ایجاد کی۔ اس نے دستی ہتھیاروں کی جگہ دور مار ہتھیار بنالیے۔ وہ برّی طاقت سے آگے بڑھا اور ابتداءً بحری طاقت اور اس کے بعد فضائی طاقت پر قابو حاصل کر لیا۔ اس طرح مغرب بالآخر ایسی طاقت بن گیا جس کا مقابلہ مسلمان اپنے موجودہ ساز و سامان کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مغرب جدید قوتوں سے مسلح ہو کر دوبارہ جب مسلم دنیا کی طرف بڑھا تو مسلمان قومیں ان کو روکنے میں ناکام رہیں۔ مغربی قوموں نے مختصر عرصہ میں تقریبًا پوری مسلم دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لیا۔

صلیبی جنگوں کے بعد مسلمان اپنی سیاسی فتح کے جوش میں سائنس سے دور ہو گیے تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہی بات ایک اور شکل میں پیش آئی۔ مغربی قوموں کے مقابلہ میں سیاسی شکست نے موجودہ مسلمانوں کے اندر منفی رد عمل پیدا کیا۔ مغربی قوموں نے ان سے ان کا فخر (Pride) چھینا تھا۔ چنانچہ وہ مغربی قوموں سے سخت متنفر ہو کر رہ گیے۔ اپنی رد عمل کی نفسیات کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف مغربی قوموں کو برا سمجھا بلکہ مغربی قوموں کی زبان اور مغربی قوموں کے ذریعہ آنے والے علوم کو بھی وہ نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

ایک صدی کی پوری مدت اسی حال میں گزر گئی۔ مسلمان مغربی قوموں سے نفرت کرتے رہے یا ان سے ایسی لڑائیاں لڑتے رہے جو مسلمانوں کی کمتر تیاری کی وجہ سے صرف شکست پر ختم ہونے

والی تھی۔ دوسری طرف دنیا کی دوسری قومیں مغربی زبان اور مغربی علوم کو سیکھ کر تیزی سے آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ دونوں کے درمیان وہ بعید فاصلہ پیدا ہو گیا جس کی ایک مثال ہم کو ہندستان میں نظر آتی ہے۔ مسٹر کلدیپ نیر نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان تعلیم میں دو سو سال پیچھے ہیں۔ اگر اس کو گھٹایا جائے تب بھی یہ فاصلہ ایک سو سال کے بقدر ماننا ہوگا۔

مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھیں وہ سادہ معنوں میں محض علوم نہ تھے بلکہ وہ دورِ جدید میں ہر قسم کی ترقی کی بنیاد تھے۔ چنانچہ جن قوموں نے ان علوم کو سیکھا وہ دنیوی اعتبار سے دوسروں سے آگے بڑھ گئیں۔ مغربی قومیں اور ان کے مقلّدین تہذیب و تمدن میں مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ فائق ہو گیے۔ یہی وقت ہے جب کہ مسلمانوں میں سرسید (۱۸۱۷-۱۸۹۸) اور اس قسم کے دوسرے مصلحین پیدا ہوئے۔ مگر یہاں پہونچ کر مسلم مصلحین سے تیسری غلطی ہوئی۔ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو گیے۔ وہ مغربی تہذیب کی جڑوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ وہ مغرب کی طرف بڑھے۔ مگر ان کا بڑھنا مغرب کی تہذیب سے مرعوبیت کی بنا پر تھا نہ کہ مغرب کی قوت کے اصل سرچشمہ (سائنس) کو سمجھ کر اس کو اختیار کرنے کے لیے تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مصلحین کی ساری توجہ مغرب کی زبان، مغرب کے لٹریچر، مغرب کے تمدنی مظاہر پر رہی۔ یہ مغرب سے قریب ہونے والے بھی مغرب کی سائنس سے اسی طرح محروم رہے جس طرح مغرب سے دور رہنے والے اس کی سائنس سے محروم تھے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تو وہاں کی خاص چیز جو وہ اپنے ساتھ لائے وہ ایک صوفہ سیٹ تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ سائنس کی کتابیں یا کوئی مشین اپنے ساتھ لاتے تو یقیناً وہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ ہوتا۔ آخر وقت میں جب مسلمان مغربی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اس وقت بھی ان کے ذہن میں ساری اہمیت مغربی تہذیب کی تھی مغربی سائنس سے وہ بدستور دور پڑے رہے۔

سائنسی شعور

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ اگر مختصر طور پر بتائی ہو تو وہ صرف ایک ہوگی: مسلمانوں میں سائنسی شعور نہ ہونا۔

ہندستان کا زمین دار طبقہ جدید تجارت میں پیچھے کیوں ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر

تجارتی شعور موجود نہ تھا یہی واقعہ سائنس کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ ایک یا ایک سے زیادہ اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے اندر جدید دور میں سائنسی شعور پیدا نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سائنس کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور اگر توجہ دی بھی تو ادھوری شکل میں۔

اس کی ایک واضح مثال وہ فرق ہے جو مسلمانوں کے درمیان دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کی اہمیت کا شعور موجود تھا اس لیے انھوں نے اس کا پورا اہتمام کیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور موجود نہ تھا اس لیے وہ اس کا وہ اہتمام نہ کر سکے جس کے بغیر کسی قوم میں سائنسی تعلیم نہیں آسکتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم رہنماؤں کو جب جدید علوم کی طرف توجہ ہوئی تو انھوں نے کالج اور یونیورسیٹیاں تو بنائیں مگر انھوں نے جدید علوم کی ابتدائی تعلیم کا نظام قائم نہیں کیا جو کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ انھیں مسلمانوں میں دینی مدارس کی مثال اس سے بالکل مختلف نمونہ پیش کرتی ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے دینی مدرسے قائم کیے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ صرف بڑے بڑے مدرسے قائم کرکے بیٹھ جائیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کیا کہ پورے ملک میں ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کا نظام پھیلا دیا۔ آپ جس گاؤں یا جس قصبہ میں جائیں، آپ کو وہاں ابتدائی تعلیم کا مکتب ایک یا ایک سے زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا۔ یہی ابتدائی مکاتب دراصل وہ ادارے ہیں جو بڑے بڑے دینی مدرسوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ ابتدائی مکاتب نہ ہوں تو تمام بڑے بڑے دینی مدرسے سونے نظر آئیں۔

یہی بات جدید سائنس کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی ملحوظ رکھنے کی تھی۔ مسلم رہنماؤں کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک پہونچانے والے ابتدائی اسکول نہ ہوں تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کو طلبہ کہاں سے ملیں گے۔ ہندستان میں مثال کے طور پر ہندو اور عیسائی بہت بڑے پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا نظام قائم کر رہے تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس مثال سے کوئی سبق نہیں لیا۔ انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں بنانے کے لیے زبردست کوشش کی مگر ابتدائی اسکول قائم کرنے کی طرف اتنا کم دھیان دیا کہ وہ نہیں کے برابر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ مسلم کالج اور اسلامی یونیورسٹی تو ہمارے پاس موجود ہیں مگر اس کے اندر مسلم طلبہ موجود نہیں۔ کیوں کہ ان بڑے اداروں کو غذا پہونچانے والے چھوٹے ادارے نہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بچوں کو مذہبی جذبے کے تحت ہندو اور عیسائی یا گورنمنٹ کے ابتدائی اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کیا اور خود ان کے اپنے ابتدائی اسکول موجود نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اس انداز پر نہ ہو سکی کہ وہ آگے بڑھ کر سائنس کے شعبوں میں داخلہ لے سکیں۔ مسلم رہنماؤں کی اس غفلت کی وجہ جو بھی ہو، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ عملی طور پر یہ ایک بڑا سبب ہے جس نے مسلم قوم کو سائنسی تعلیم میں پیچھے کر دیا۔

بنیادی غفلت

سائنس کی تعلیم میں مسلمانوں کے پیچھے ہونے کا سبب ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ —— مسلمان انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔ انھوں نے استعماری قوموں کو اور استعماری قوموں کے ذریعہ آنے والے علوم کو ایک سمجھا۔ اول الذکر سے سیاسی اسباب کے تحت انھیں نفرت پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر سے بھی نفرت کرنے لگے۔ اگر وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے تو یقینی طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سائنسی تاریخ دوسری ہوتی۔

ہر قوم کے کچھ اپنے قومی علوم ہوتے ہیں۔ ان قومی علوم سے دوسری قوموں کو دلچسپی نہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں اگر ان قومی علوم سے دلچسپی نہ لیں تو اس سے انھیں کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ایک علم کو لے کر اٹھتی ہے لیکن حقیقۃً وہ اس کا قومی علم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہوتی ہے۔ یہ علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام قوموں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک قوم کے لیے۔ وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہوتا ہے نہ کہ کسی قوم کا انفرادی ورثہ۔

قدیم صلیبی جنگوں کے بعد یہی صورت حال مغربی قوموں کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اُس وقت مسلمان سائنسی علوم کے حامل تھے۔ اور اسی بنا پر وہ مغربی قوموں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے اس وقت مغرب کی حیثیت مفتوح کی تھی اور مسلمانوں کی حیثیت فاتح کی۔ اگرچہ عام طور پر ایسا ہوتا

ہے کہ مفتوح کے دل میں فاتح کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ فاتح کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے یہ نادانی نہیں کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے علوم کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا۔ انھوں نے مسلمانوں سے نفرت کی مگر مسلمانوں کے علوم کو انھوں نے آگے بڑھ کر لیا۔ نیز اپنی کوششوں سے اس میں اتنے اضافے کیے کہ بعد کی صدیوں میں وہ ان علوم کے امام بن گیے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ وہ دوبارہ تاریخ کو اپنے حق میں بدلنے میں کامیاب ہو گیے۔

یہی صورت موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئی۔ مغربی قومیں ان کے لیے فاتح کی حیثیت رکھتی تھیں اس لیے مغربی قوموں سے بیزاری ان کے لیے ایک فطری بات تھی۔ مگر یہاں مسلمان اس ہوش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغرب اور مغربی علوم کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھیں۔ مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھی تھیں وہ ان کے قومی علوم نہ تھے بلکہ وہ کائناتی علوم تھے۔ ان کی حیثیت قوت وطاقت کی تھی۔ دور جدید کے مسلم رہنما اگر اس راز کو بروقت جان لیتے تو وہ مغربی علوم کو مغرب سے الگ کرکے دیکھتے۔ مغربی علوم کو وہ اپنے لیے طاقت سمجھ کر حاصل کرتے۔ وہ ان کو خود اپنی چیز سمجھتے نہ کہ غیر کی چیز۔ مگر یہاں دور جدید کے مسلم رہنما اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ انھوں نے بیک وقت مغرب سے بھی نفرت کی اور مغربی علوم سے بھی۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے دور جدید میں مسلمانوں کو سائنس میں پیچھے کر دیا۔ مسلم رہنماؤں نے ایک لمحہ کی غلطی کی تھی مگر اس کا نتیجہ مسلم قوم کو صدیوں کی شکل میں بھگتنا پڑا:

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت شعور کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مسلمانوں نے جب صلیبی جنگوں میں مغربی اقوام پر فتح حاصل کی تو وہ فتح کے جوش میں مبتلا ہو گیے۔ اس جوش نے انھیں سائنس کی تحقیق سے غافل کر دیا۔ اس کے بعد موجودہ زمانہ میں یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ مسلمان مغربی قوموں کے مقابلہ میں مفتوح ہوئے تو ان کے اندر مغربی اقوام کے خلاف نفرت جاگ اٹھی۔ وہ نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر مغربی سائنس کی طرف سے بے رغبت ہو گیے۔ مسلمان اپنی بے شعوری کے نتیجہ میں فاتح کی حیثیت سے بھی نقصان میں رہے اور مفتوح کی حیثیت سے بھی۔

حصّہ دوم

جدید انسان ایک عجیب مشکل (Dilemma) سے دوچار ہے۔ اس کے پاس ٹکنالوجی ہے مگر اس کے پاس فلسفہ حیات نہیں۔ اس کے پاس جسمانی سفر کے لیے مشین ہے مگر اس کے پاس روحانی سفر کے لیے عقیدہ نہیں۔ یہی جدید انسان کا اصل مسئلہ ہے۔ برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم بجلی کے بارہ میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔ صرف یہ کہ اس کو ہم کس طرح اپنے لیے کارآمد بنائیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بے فائدہ مابعد الطبیعیات میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہے:

> What do we want to know about electricity? Only how to make it work for us. To want to know more is to plunge into useless metaphysics.
>
> *The Impact of Science on Society*, p. 93

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے دوسرے بے شمار لوگوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ صرف "بجلی کیا ہے" کے سوال کو لینا چاہتے ہیں اور "بجلی کیوں ہے" کے سوال کو نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر انسانی فطرت اس تفریق پر راضی نہیں۔ انسان اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ بجلی کو عملاً استعمال کرنے کے ساتھ اس کی حقیقت کو بھی جاننا چاہے۔ یہ ایک ایسا لازمی سوال ہے جس سے اپنے آپ کو خالی کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

نظریاتی سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر بھی بجلی ہمارے کارخانوں کو چلاتی ہے اور ہمارے شہروں کو روشن کر رہی ہے۔ مگر انسانی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ یہیں ٹھہر جائے۔ وہ بجلی کو استعمال کرے مگر بجلی کی حقیقت کو جاننا نہ چاہے۔ آدمی عین اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ "بجلی کیا ہے" کے سوال کے ساتھ "بجلی کیوں ہے" کے سوال پر بھی غور کرے۔

اسی دوسری چیز کا نام عقیدہ ہے اور انسان عقیدہ (Faith) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جدید انسان کی اصل کمزوری یہی ہے کہ اس نے عقیدہ کو کھو دیا ہے۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ آج صحیح اور سچا عقیدہ صرف اسلام ہے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ آج کے انسان کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسلام ہے۔

سائنسی معیار

دور جدید کا مذہب اسلام ہے ۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے معیار پر پورا اتر سکے ۔ اس لیے اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جس کو دور جدید کا مذہب کہنا باعتبار حقیقت درست ہو ۔ موجودہ دور سائنسی دور ہے ۔ موجودہ دور میں انسان ہر چیز کو سائنسی معیار پر جانچتا ہے ۔ جو چیز سائنسی معیار پر پوری اترے اس کو وہ مان لیتا ہے اور جو چیز سائنسی معیار پر پوری نہ اترے اس کو وہ رد کر دیتا ہے ۔

ابتداءً ہر مذہب سچا مذہب تھا ۔ مگر بعد کو ہونے والی انسانی ملاوٹوں کے نتیجہ میں مذاہب اس قابل نہ رہے کہ وہ سائنس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں ۔ جب کہ اسلام ایک محفوظ دین ہے ۔ اور اس بنا پر وہ سائنسی معیار پر صد فی صد پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں بلا مقابلہ کامیابی کی پوزیشن میں ہے ، بشرطیکہ اسے جدید انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے ۔

سائنسی معیار کیا ہے اور غیر سائنسی معیار کیا ، اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ سی مثال لیجیے ۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ حقیقت وہ ہے جو مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہو نہ کہ وہ جس کو محض قدیم سندوں کی بنا پر مان لیا جائے ۔ مگر یہ مکمل طور پر ایک جدید تصور ہے جو سترھویں صدی سے پہلے بمشکل اپنا وجود رکھتا تھا ۔ ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں ۔ اگرچہ اس کی شادی دو بار ہوئی تھی ، اس کو کبھی یہ خیال نہ آسکا کہ اس بیان کی تصدیق اپنی بیویوں کے منہ کو دیکھ کر کرے :

> To modern educated people, it seems obvious that matters of fact are to be ascertained by observation, not by consulting ancient authorities. But this is an entirely modern conception, which hardly existed before the seventeenth century. Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives' mouths.
>
> B. Russell, *The Impact of Science on Society* p. 17

مذکورہ مثال کے مطابق سائنسی معیار واقعاتی معیار ہے ۔ اور غیر سائنسی معیار قیاسی معیار ۔ ارسطو نے محض قیاس کی بنیاد پر یہ مان لیا کہ عورت کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں ۔ اس نے عورت کو

کم تر درجہ کی مخلوق فرض کیا۔ اس لیے اس نے قیاس کیا کہ عورت جب کم تر درجہ کی مخلوق ہے تو اس کے منھ میں دانت بھی نسبتاً کم ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس برٹرینڈ رسل کا ذہن دور جدید میں بنا ہے جو ہر چیز کا واقعاتی تجزیہ چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ قیاس کی بنیاد پر مت مانو بلکہ عورت اور مرد دونوں کا منہ کھول کر ان کے دانت کو گنو اور پھر دیکھو کہ دونوں کے دانت برابر ہیں یا ایک دوسرے سے کم ہیں۔

قدیم زمانہ قیاسی معیار پر باتوں کو ماننے کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدیم زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ جو مذہب بھی رائج ہو اس کو قیاسی مفروضات کی بنا پر درست مان لیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں آدمی کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس سے متعلق تمام حقائق کا تجزیہ کرکے وہ اس کی معقولیت کو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر جان چکا ہو۔

یہ وہ معیار ہے جس کو منطبق کرنے کے بعد دوسرے تمام مذاہب اپنے آپ رد ہو جاتے ہیں اس کے بعد صرف اسلام باقی رہتا ہے جو سائنسی معیار پر پورا اترے۔

مذہب توحید

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے اس میں مکمل وحدت ہے۔ پوری کائنات یکساں قسم کے قانون کے تحت نظر آتی ہے۔

ایک برطانی سائنس داں پروفیسر آئن راکس برگ (Ian Roxburg) کائنات کیوں اس قدر یکساں ہے (Why is the universe so uniform?) کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزا میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کیے گیے ہیں وہ تحکمی اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لیے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ پروفیسر آئن راکس برگ کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"
>
> *Sunday Times* (London) December 4, 1977

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ کائناتِ وحدت ہے۔ ایسی کائنات میں صرف توحید کا تصور فٹ بیٹھتا ہے۔ شرک کا تصور سائنسی کائنات کے ساتھ کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

اب مختلف مذاہب کو دیکھیے تو تمام مذاہب مشرکانہ عقائد پر مبنی نظر آتے ہیں۔ پارسی کائنات میں دو خدا مانتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا کی تعداد تین ہے، ہندو ازم میں خداؤں کی تعداد کم سے کم ۳۳ اور زیادہ سے زیادہ ۳۳ کرور بتائی گئی ہے۔ افریقہ کے قبائلی مذاہب میں ہر چیز خدا ہے، صرف ایک انسان ہے جو اس خدائی میں شامل نہیں، وغیرہ۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نہایت واضح اور قطعی طور پر اس بات کا مبلغ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ یہاں ایک اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جدید سائنسی دنیا میں جو مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے وہ صرف اسلام ہے جو خالص توحید کا مذہب ہے۔ دوسرے تمام مذاہب جدید سائنسی دنیا میں غیر مطابق ہو کر رہ گیے ہیں کیوں کہ وہ شرک کی تعلیم دیتے ہیں اور شرک کا اصول جدید سائنس کی دریافت کردہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

مشرکانہ مذاہب

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مشرکانہ مذاہب ہیں۔ مشرکانہ مذاہب میں فطرت کے مظاہر کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور ان کو مقدس سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ شرک دراصل مظاہر فطرت کی پرستش ہی کا دوسرا نام ہے۔

موجودہ زمانہ میں فطرت کے ان مظاہر کی نہایت تفصیلی تحقیق کی گئی ہے۔ اور ان کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ معلومات ان مظاہر فطرت کی خدائی کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندو ازم میں چاند کو دیوتا بتایا جاتا ہے۔ ہندو عقیدہ رکھنے والے لوگ

قدیم ترین زمانہ سے چاند کو پوجتے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں چاند کی علمی تحقیق کی گئی۔ دوربینوں سے اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ چاند کی مٹی کو زمین پر لاکر لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ حتی کہ ستمبر ۱۹۵۹ میں روس کا راکٹ چاند پر اتر گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۶۹ میں امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اس طرح آخری طور پر معلوم ہو گیا کہ چاند کوئی دیوتائی چیز نہیں ہے۔ وہ محض ریت اور پتھر کا ایک مجموعہ ہے۔

اب ظاہر ہے کہ وہ دین آج کے انسان کا دین قرار پائے گا جو سورج اور چاند کو دیوتا بتا کر اسے پوجنے کے لیے کہتا ہے یا وہ دین جو انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ سورج اور چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ تم اس خدا کی پرستش کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے (لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للّٰہ الذی خلقھن، حم السجدہ ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی دور میں چاند کی معبودانہ حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ آج کا ایک شخص جو چاند کے بارے میں جدید سائنسی نقطۂ نظر پر یقین رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ ان مذاہب پر یقین نہیں رکھ سکتا جو چاند کو دیوتا بتاتے ہیں۔ مگر اسلام کے ساتھ یہ مشکل نہیں۔ کیوں کہ اسلام چاند کو اور اسی طرح دوسرے اجرام سماوی کو مخلوق بتاتا ہے نہ کہ خالق اور معبود۔

مذہبی سادگی

اسلام کی ایک خصوصیت اس کی فطری سادگی ہے جو جدید سائنسی ذہن کے عین مطابق ہے۔ جدید انسان کا ذہن نیچر کے مطالعہ سے بنا ہے۔ اس لیے نیچر میں جو سادگی ہے وہی سادگی جدید ذہن کے لیے بھی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ جدید ذہن کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس میں فطری سادگی ہو۔ جو مذہب فطری سادگی سے خالی ہو وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب فطری سادگی سے محروم ہو چکے ہیں، نظریاتی سادگی سے بھی اور عملی سادگی سے بھی۔

موجودہ مسیحیت جس فلسفیانہ عقیدہ پر قائم ہے وہ تثلیث ہے یعنی تین میں ایک، ایک میں تین۔ ریاضیاتی طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ایک بھی ہو اور اسی کے ساتھ تین بھی۔ اس سلسلہ میں ایک دل چسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر سے

پوچھا گیا کہ تثلیث (Trinity) کا مطلب کیا ہے۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

If you ask me I don't know, if you don't ask I know.

یہودیت ایک اور اعتبار سے غیر سادگی کا منظر پیش کرتی ہے۔ موجودہ بائبل میں عبادت اور قربانی کے مراسم (Rituals) اتنے زیادہ بتائے گیے ہیں کہ عام انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام مراسم کی پابندی کرتے ہوئے عبادت اور قربانی کر سکے۔

بائبل کے باب کے باب اس قسم کے جزئی مراسم کی تفصیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں :

احبار (Leviticus)
گنتی (Numbers)

اس کے مقابلہ میں اسلام کی عبادت ظاہری رسمیات سے بالکل خالی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی عبادت ایک انتہائی سادہ عمل کا نام ہے۔ سر ایڈورڈ ڈینی سن راس (E. Denison Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ کی سادگی غالباً اسلام کی اشاعت میں زیادہ بڑا عامل تھی بمقابلہ غازیوں کی تلوار کے :

The simplicity of Islamic creed was probably a more potent factor in the spread of Islam than the sword of Ghazis.
Introduction of George Sale's translation of the Quran p. VII

اسلام کی یہ سادگی جس نے قدیم زمانہ میں بے شمار انسانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اس کی وہی سادگی مزید اضافہ کے ساتھ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہے۔ جدید انسان کا فطرت پسند ذہن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اپنی حقیقی تسکین نہیں پا سکتا۔

درمیانی واسطہ نہیں

جدید انسان کا ایک خاص ذوق یہ ہے کہ وہ حقیقتوں سے براہِ راست طور پر مربوط ہونا چاہتا ہے۔ موجودہ سائنسی دنیا میں وہ تمام چیزوں سے براہِ راست ربط قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیے بالکل فطری بات ہے کہ وہ خدا سے بھی براہِ راست مربوط ہونا چاہے۔ آج کا انسان میکروکاسمک

ورلڈ (ستاروں اور سیاروں کی دنیا) کو اپنی دوربینوں کے ذریعہ براہِ راست دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ مائکرو کاسمک ورلڈ (بیکٹیریا اور مالیکیول کی دنیا) کو اپنی خورد بینوں کے ذریعہ براہِ راست دیکھ رہا ہے۔ ان تجربات سے اس کا جو ذہن بنتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ حقائق کا براہ راست تجربہ کرے۔

اس اعتبار سے بھی اسلام ہی واحد مذہب ہے جو جدید ذہن کو اپیل کرنے والا ہے۔ دیگر تمام مذاہب میں خدا اور انسان کے درمیان واسطے مقرر ہو گیے ہیں۔ کسی مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا واسطہ کسی مذہب میں روحوں کا واسطہ، کسی مذہب میں خدا کے بیٹے اور خدا کے فرشتوں کا واسطہ، وغیرہ۔

جدید انسان خدا سے براہِ راست مربوط ہونا چاہتا ہے لیکن دیگر مذاہب اس کو صرف بالواسطہ انداز سے مربوط ہونے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو خدا سے براہِ راست مربوط ہونے کا طریقہ بتا رہا ہے۔ اسلام کے نزدیک بندے اور خدا کے درمیان ربط قائم ہونے کے لیے کسی تیسرے واسطہ کی ضرورت نہیں۔ آدمی جس وقت چاہے خدا کی طرف متوجہ ہو اور وہ اپنے آپ کو خدا کے ربط (Contact) میں پائے گا۔

وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

اور جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔

تاریخی معیار

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آئے ان میں سے دو پیغمبر حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ تھے۔ ان دونوں پیغمبروں کا تعلق مصر کی تاریخ سے ہے۔ اس بنا پر جب بھی ان دونوں پیغمبروں کا ذکر آتا ہے تو قدرتی طور پر مصر کی تاریخ بھی اس سے وابستہ ہو جاتی ہے۔

ان دونوں پیغمبروں کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔ بائبل جب حضرت یوسفؑ کا ذکر کرتی ہے تو ان کے زمانہ کے بادشاہ کا نام وہ فرعون (Pharoah) بتاتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں جہاں موسیٰؑ کا ذکر ہے وہاں بھی ان کے ہم عصر بادشاہ کا نام فرعون بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا

اورحضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا۔

یہ بات جدید تحقیقات سے غلط ثابت ہوئی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو چرواہے بادشاہ (Hyksos kings) کہا جاتا ہے یہ لوگ اصلاً مصری نہ تھے بلکہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ باہر سے آکر مصر میں اسی طرح حکمران بن گیے جس طرح انگریز ہندستان میں ایک عرصہ تک حکمراں رہے۔ چرواہے بادشاہوں کا یہ خاندان دوہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر کے اقتدار پر قابض رہا۔ حضرت یوسف کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک یہ خاندان مصر پر حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ ان کو مصر سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مصری خاندان کی حکومت قائم ہوئی یہی مصری خاندان ہے جس کے بادشاہوں نے سب سے پہلے فرعون (Pharoah) کا لقب اختیار کیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بائبل کا بیان جدید تاریخی تحقیقات سے ٹکرا رہا ہے، بائبل حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ دونوں پیغمبروں کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کہتی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فرعون صرف حضرت موسیٰ کے ہم عصر بادشاہ کا لقب تھا نہ کہ حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل جدید تاریخی معیار کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایک شخص بائبل کو مانے تو اس کو تاریخ کو رد کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ تاریخ کی تحقیق کو ملنے تو اس کی نظر میں بائبل ناقابل اعتبار قرار پائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید انسان مجبور ہے کہ وہ بائبل کو نہ مانے، الّا یہ کہ وہ اپنے سائنسی ذہن سے دست بردار ہو جائے۔

مگر قرآن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں حضرت یوسف کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر ہے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر۔ مگر قرآن انتہائی بامعنی طور پر دونوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس نے حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی حکمراں یا ذی اقتدار کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن جب حضرت موسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہاں وہ ان کے ہم عصر بادشاہ کو واضح طور پر فرعون کہتا ہے۔ گویا قرآن کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا تھا اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا۔

اس طرح قرآن مکمل طور پر یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جدید علم کا سامنا کرسکے۔ کیوں کہ جدید علمی تحقیقات اور قرآن کا بیان دونوں کامل طور پر ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ یہاں آدمی کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ قرآن کو ماننے کے لیے جدید علم کو چھوڑنے پر مجبور ہو۔ یا جدید علم کو ماننا اس کے لیے صرف اس وقت ممکن ہو جب کہ وہ قرآن سے دست بردار ہو جائے۔

اسلام کی برتری

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے مسلم ممالک کا سفر کیا۔ بالآخر ایک پاکستانی مسلمان سے شادی کرلی اور اب وہ پاکستان میں مقیم ہیں۔ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام مغرب کے مقابلہ میں (Islam Versus The West) اس کتاب میں وہ اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں میں نے ایک مضمون لیا جو "یہودیت اسلام میں" کہا جاتا تھا۔ میرا ربی پروفیسر اپنے طلبہ کو، جو سب کے سب یہودی ہوتے تھے، اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسلام کا ماخذ یہودیت ہے ہماری نصابی کتاب میں قرآن کی ایک ایک آیت کو لے کر دکھایا گیا تھا کہ کس طرح وہ یہودی ذرائع علم پر مبنی ہے۔ پروفیسر کے لکچر کے ساتھ ہم کو ایسے فلم اور سلائڈ بھی دکھائے جاتے تھے جن میں صہیونیت اور یہودی ریاست کی تعریف ہوتی۔ اگرچہ پروفیسر کا حقیقی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اسلام پر یہودیت کی برتری ثابت کرے مگر میرے اوپر اس کا اثر بالکل الٹا پڑا۔

جیسے جیسے میں نے قدیم عہدنامہ اور قرآن کا گہرا مطالعہ کیا، دونوں کا تضاد مجھ پر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ ایک معنی میں قدیم عہدنامہ صرف یہودیوں کی تاریخ تھی جو خدا کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ایک عرب پیغمبر پر اترا، اس کا پیغام ایک عالمی پیغام ہے جو تمام نسل انسانی کو خطاب کرتا ہے۔ جب میرے پروفیسر نے بتایا کہ فلسطین پر یہودیوں کا خدائی حق ہمیشہ سے یہودی شریعت کا مرکزی جزر رہا ہے تو مجھے خدا کے اس تنگ نظر عقیدہ سے بہت دھکا لگا۔

کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ: پورب پچھم سب خدا کے ہیں، تم جدھر بھی رخ کرو ادھر خدا تمہارے لیے موجود ہوگا۔ کیا پیغمبر اسلام نے نہیں کہا کہ تمام زمین خدا کی مسجد ہے۔ صہیونیت کہتی ہے کہ یہودیوں کا وطن صرف فلسطین ہے، دوسری جگہ وہ جلاوطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پروفیسر کا دعویٰ کہ یہودی صرف فلسطین میں رہ کر انسانی تہذیب میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں بے بنیاد نظر آتا ہے، جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ حضرت موسیٰ پر وحی مصر میں آئی۔ تالمود کے انتہائی اہم حصے اس سرزمین میں لکھے گئے جو آج عراق کہا جاتا ہے (صفحہ ۴)

اسلام اتنا برحق مذہب ہے کہ دوسرے مذہبوں سے اس کا سادہ تقابل ہی اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بائبل ایک قوم کی قومی تاریخ معلوم ہوتی ہے جب کہ قرآن میں عالمی انسانی پیغام ملتا ہے۔ یہودیت کے نزدیک سارا تقدس بس فلسطین کی سرزمین میں ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین خدا کی زمین ہے۔ یہودیت کے مطابق ان کے مذہب اور فلسطین کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا جب کہ خود حضرت موسیٰ کو خدا نے فلسطین سے باہر خطاب کیا اور یہودیوں کی مقدس مذہبی کتاب فلسطین کے باہر مرتب کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اتنا کامل اور اتنا برحق دین ہے کہ دوسروں کے سامنے صرف اس کو سادہ صورت میں پیش کر دینا کافی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کی اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

جدید تقاضا

موجودہ زمانہ کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آج کے انسان کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس کی تعلیمات عالمی ہوں اور جس کا فکر عقلیت پر مبنی ہو :

Universal in content and rational in thought

مذکورہ مفکر کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ یہ دونوں صفات آج صرف اسلام کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے اس معیار پر پورا اُترے۔

اسلام اپنی ابتدائی ربانی شکل میں آج بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ان کے اندر انسانی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آفاقیت بھی کھو دی اور اسی کے ساتھ اپنی عقلیت بھی۔ انسان کی محدودیت نے خدائی مذہب میں شامل ہو کر خدائی مذہب کو بھی محدود کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق پائی جاتی ہے۔ چوں کہ لوگوں کے درمیان تفریق اور امتیاز موجود تھا، انھوں نے اپنی اس عملی حالت کو نظریاتی جواز فراہم کرنے کے لیے اس کو ایک مذہبی چیز بنایا اور پھر اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر دیا۔ مذاہب میں بادشاہ اور رعایا کی تقسیم، آزاد اور غلام کی تقسیم، کالے اور گورے کی تقسیم، اونچی ذات اور نیچی ذات کی تقسیم، امیر اور غریب کی تقسیم، مذہبی پیشوا اور عام انسان کی تقسیم ـــــ یہ تمام چیزیں اسی تاریخی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

یہی معاملہ عقلیت کا بھی ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ وہ حد بندیوں میں رہ کر سوچتی ہے اسلام کے سوا ہر مذہب میں ایسا ہوا کہ بعد کے زمانہ میں اس کے ماننے والوں نے اپنی عقل سے اس میں اضافے کیے۔ ان اضافوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی کلام کے ساتھ انسانی کلام شامل ہوگیا۔ اس طرح اس کی ابدیت ختم ہوگئی۔ جو چیز ماضی میں عقلی نظر آتی تھی وہ بعد کے زمانہ میں غیر عقلی ہو کر رہ گئی۔

اب مذاہب کی فہرست میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے ان دونوں صفتوں کو اپنے اندر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آفاقیت بھی مکمل طور پر ہے اور عقلیت بھی مکمل طور پر۔

اسلام دور جدید میں

امیر شکیب ارسلان (۱۸۶۹ - ۱۹۴۶) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے : لماذا تأخر المسلمون وتقدّم غیرھم (مسلمان کیوں پیچھے ہو گیے اور ان کے سوا دوسرے کیوں آگے ہو گیے) یہ کتاب ۵۰ سال پہلے چھپی تھی۔ حال میں میں نے ایک عربی مجلہ رابطۃ العالم الاسلامی (اپریل ۱۹۸۵) میں ایک مضمون پڑھا۔ اس مضمون کا عنوان دوبارہ حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا :

لماذا تأخرنا وتقدّم غیرنا

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان پچھلی نصف صدی سے ایک ہی سوال سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ سوال ہے کہ ہم جدید دور میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہو گیے، اور دوسری قومیں ہم سے آگے کیوں نکل گئیں۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ اسی نصف صدی کے اندر جاپان ایٹمی بربادی کے کھنڈر سے ابھرا اور ترقی کی انتہا پر پہونچ گیا۔ چنانچہ حال میں امریکہ میں ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے جاپان نمبر ایک *(JAPAN: Number One)*

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ انجام کسی موہوم سبب کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ معلوم خدائی قانون کی بنا پر ہے۔ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں ترقی اور استحکام نصیب ہو، اور جو گروہ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دے اس کو ہمیشہ کے لیے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ قدیم زمانہ کے مسلمان اہل عالم کے لیے نفع بخش بنے ہوئے تھے اس لیے قدیم زمانہ میں انھیں عظمت حاصل ہوئی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بے نفع ہو گیے۔ اس لیے موجودہ زمانہ میں انھیں کوئی عظمت حاصل نہ ہو سکی۔

عروج وزوال کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں واضح طور پر موجود ہے :

انزل من السماء ماءً فسالت اودية بقدرها فاحتمل السيل زبدا رابيًا ومما يوقدون عليه في النار ابتغاء حلية او متاع زبدٌ مثله. كذلك يضرب الله الحق و الباطل فاما الزبد فيذهب جفاءً واما ماينفع الناس فيمكث في الارض كذالك يضرب الله الامثال -

(الرعد ١٧)

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے ۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھا لیا۔ اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لیے آگ میں پگھلاتے ہیں ۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے ۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز لوگوں کو نفع پہونچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون کیا ہے ۔ وہ قانون یہ ہے کہ جو گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو دنیا میں بقا اور استحکام ملے۔ اور جو گروہ اپنی نفع بخشی کھو دے وہ یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے ۔

اس عالمی قانون کو ایک طرف کتاب الٰہی میں لفظی طور پر بیان کیا گیا ہے ۔ دوسری طرف مادی دنیا میں اس کا عملی مظاہرہ کیا جا رہا ہے ۔ سورہ رعد کی مذکورہ آیت میں اس نوعیت کی دو مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک مثال بارش کی ہے ۔ بارش ہوتی ہے اور اس سے نالے بھرتے ہیں تو جھاگ اوپر دکھائی دینے لگتا ہے ۔ مگر جلد ہی ایسا ہوتا ہے کہ جھاگ تو ہوا میں اڑ جاتا ہے اور جو چیز اس میں نفع بخش ہے وہ باقی رہتی ہے ، یعنی پانی ۔

دوسری مثال دھات کی ہے ۔ دھات کو تپانے کے لیے جب کٹھالی میں پگھلاتے ہیں تو اس میں ابتداءً اس کا میل کچیل اوپر دکھائی دینے لگتا ہے ۔ مگر بہت جلد یہ وقتی منظر ختم ہو جاتا ہے اور جو اصل قیمتی دھات ہے وہ اپنی جگہ باقی رہ جاتی ہے ۔

دور اوّل کی مثال

دور قدیم میں اسلام کو غیر معمولی عظمت ملی ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تقریبًا ایک ہزار سال تک اسلام کو آباد دنیا کے قائد کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ اسلام

کو یہ عظیم حیثیت اتفاقاً نہیں ملی اور نہ مطالبات کے ذریعہ اس کو یہ حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ قدرت کا وہی ابدی قانون تھا جس کا اوپر ذکر ہوا۔ یعنی نفع بخشی اور فیض رسانی۔

دنیا کو اسلام سے جو کچھ ملا، اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام نے دنیا کو توہمات (Superstitions) کے دور سے نکالا اور اس کو پہلی بار سائنس کے دور میں داخل کیا۔

آج کی دنیا جس چیز کو اپنے لیے سب سے بڑی نعمت سمجھتی ہے وہ سائنس ہے۔ اور تمام محققین اور منصف مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دراصل اسلام ہے جس نے سائنس کے دور کو پیدا کیا۔ یہاں ہم صرف ایک مغربی مصنف مسٹر بریفالٹ کا قول نقل کریں گے۔ وہ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ یورپی ترقی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کی فعال اثر انگیزی دیکھی نہ جا سکتی ہو۔ مگر وہ سب سے زیادہ واضح اس قوت کی پیدائش میں ہے جو جدید دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یعنی طبیعی سائنس اور سائنسی اسپرٹ۔ ہماری سائنس پر عربوں کا قرض انقلابی نظریات کی دریافت کی حد تک نہیں ہے۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عرب تہذیب کی احسان مند ہے، وہ خود اپنے وجود کے لیے اس کی مرہون منت ہے:

> For although there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not traceable, nowhere is it so clear and momentous as in the genesis of that power which constitutes the permanent distinctive force of the modern world, and the supreme source of its victory—natural science and the scientific spirit. The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence.
> Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم زمانہ میں تمام دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ تمام قومیں بے شمار دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ہندستانی روایات کے مطابق ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہونچ گئی تھی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تعدد آلہہ کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ مذاہب میں عمومی طور پر یہ بات پائی گئی ہے کہ فطرت کی طاقتوں اور فطرت کے مظاہر کو خدا مان لیا جاتا ہے۔ نہایت آسانی کے ساتھ ان کو تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے ——— آسمانی، فضائی اور زمینی۔ یہی تقسیم بجائے خود ہند آریائی مذہب میں تسلیم کی گئی ہے۔ چنانچہ سورج ان کے یہاں آسمانی خدا ہے۔ اندر فضائی خدا ہے جو

طوفان، بارش اور جنگ لانے والا ہے۔ اگنی (آگ دیوتا) زمینی واقعات کا سبب ہے :

> A widespread phenomenon in religions is the identification of natural forces and objects as divinities. It is convenient to classify them as celestial, atmospheric, and earthly. This classification itself is explicitly recognized in Indo-Aryan religion: Surya, the sun god, is celestial; Indra, associated with storms, rain, and battles, is atmospheric; and Agni, the fire god, operates primarily at the earthly level (14/785).

اسلام سے پہلے انسان کا حال یہ تھا کہ وہ ہر چیز کو پوجتا تھا۔ وہ سورج اور چاند سے لے کر دریا اور پہاڑ تک ہر چیز کے آگے جھکتا تھا۔ درختوں میں اس نے درخت خدا (Plant deities) اور جانوروں میں اس نے جانور خدا (Animal deities) بنا رکھے تھے۔ دنیا کی تمام چیزیں معبود بنی ہوئی تھیں۔ اور انسان ان کا عبادت گزار۔ اس طرح انسان نے اپنی عظمت کھو دی تھی۔ اسلام کے ذریعہ تاریخ میں جو انقلاب آیا اس نے پہلی بار انسان کو اس کی عظمت عطا کی۔

شرک (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت کی پرستش) کا رواج قدیم زمانہ میں سائنسی ترقیوں میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ انسان فطرت کے مظاہر کو معبود سمجھ کر انھیں تقدس کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لیے اس کے اندر یہ جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان مظاہر کی تحقیق کرے اور ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔ فطرت کے مظاہر جب پرستش کا موضوع بنے ہوئے ہوں تو اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع نہیں بن سکتے۔ یہ بنیادی سبب تھا جو طبیعی سائنس کا دور شروع ہونے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار اس سبب کو ختم کیا، اس لیے اسلام کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ طبیعی سائنس کا دور شروع ہوا اور بالآخر اس حد کو پہونچا جس حد کو وہ آج پہونچا ہے۔

آرنلڈ ٹوائن بی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ دراصل توحید (Monotheism) کا عقیدہ ہے جس نے جدید سائنس اور صنعتی دور کو پیدا کیا۔ کیوں کہ توحید کے انقلاب سے پہلے دنیا میں عملی طور پر شرک کا غلبہ تھا۔ شرک کے عقیدہ کے تحت آدمی فطرت (Nature) کو پوجنے کی چیز سمجھے ہوئے تھا۔ پھر وہ اس کو تحقیق و تسخیر کی چیز کیسے سمجھتا۔ جب کہ فطرت کو تحقیق اور تسخیر کی چیز سمجھنے کے بعد ہی اس علم کا آغاز ہوتا ہے جس کو طبیعی سائنس کہتے ہیں۔

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی نشانیوں (مظاہر فطرت) پر غور کرو۔ قرآن میں اس قسم کی سات سو آیتیں شمار کی گئی ہیں جن میں مظاہر فطرت پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اگر بالواسطہ آیتوں کو بھی شامل کیا جائے تو ان کی تعداد ایک ہزار تک پہونچ جائے گی۔ یہ معلوم انسانی تاریخ میں بالکل نئی آواز تھی۔ کیوں کہ اس سے پہلے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ وہ مظاہر فطرت کو پوجے۔ ایک ایسی دنیا جس میں ہزاروں برس سے انسان صرف یہ جانتا تھا کہ مظاہر فطرت پوجنے کی چیز ہیں، وہاں قرآن نے یہ آواز بلند کی کہ مظاہر فطرت اس لیے ہیں کہ ان پر غور کیا جائے اور ان میں چھپی ہوئی حکمتوں کو دریافت کیا جائے۔

اسلام کا یہ پیغام صرف پیغام نہ رہا بلکہ سو سال کے اندر ہی وہ ایک عالمی انقلاب بن گیا۔ اس نے اولاً عرب کے دل و دماغ کو فتح کیا۔ پھر وہ ایشیا اور افریقہ اور یورپ تک پہونچ گیا۔ اس نے عرب کے بُت خانے ختم کر دیئے۔ ایرانی اور رومی شہنشاہیتیں اس زمانہ میں شرک کی سب سے بڑی سرپرست تھیں۔ دونوں کو اسلام نے مغلوب کر لیا اور توحید کا غلبہ تقریباً پوری آباد دنیا میں قائم کر دیا۔
اسلام کی اس نفع بخشی کو تمام منصف مزاج مورخین نے تسلیم کیا ہے۔ یہاں ہم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کرتے ہیں:

> Islamic culture is the most relevant to European science. There was active cultural contact between Arabic-speaking lands and Latin Europe. Conquests by the Prophet's followers began in the 7th century, and, by the 10th, Arabic was the literate language of nations stretching from Persia to Spain. Arabic conquerors generally brought peace and prosperity to the countries they settled (16/368).

اسلامی تہذیب کا تعلق یورپی سائنس سے بہت زیادہ ہے۔ عربی زبان بولنے والے علاقوں اور لاتینی یورپ کے درمیان نہایت گہرا ربط قائم تھا۔ پیغمبرؐ کے پیرؤوں کی فتوحات ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوئیں۔ اور دسویں صدی تک یہ حال ہو گیا کہ عربی زبان ایران سے لے کر اسپین تک کی تمام قوموں کی علمی زبان بن گئی۔ عرب فاتحین جہاں گئے وہاں عام طور پر وہ امن اور خوش حالی لے گیے۔

قرآن کے ذریعہ عالمی سطح پر جو فکری انقلاب آیا اس نے تاریخ میں پہلی بار نئی قسم کی سرگرمیاں

شروع کر دیں۔ انسان نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جو پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز تھی، جس کا وہ تابع نہ تھا بلکہ وہ اس کے لیے مسخر کی گئی تھی کہ وہ اس کو اپنا تابع بنائے۔ چنانچہ اسلام کے عظیم الشان اعتقادی انقلاب کے ساتھ ایک عظیم الشان علمی اور ذہنی انقلاب بھی شروع ہوگیا۔ اسلام کے ماننے والوں نے جب ایک قادر مطلق خدا کو پایا تو اسی کے ساتھ انھوں نے دوسری تمام چیزوں کو بھی پالیا۔ انھوں نے ہر میدان میں ترقیاں شروع کر دیں۔ ان سے دنیا کو وہ چیزیں ملنے لگیں جو ابھی تک اس کو نہیں ملی تھیں۔ چنانچہ اس دور میں پیدا ہونے والی جتنی بھی قابل ذکر ترقیاں ہیں ان کا مطالعہ کیجیے تو ہر ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی مسلمان کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔

چند تاریخی حوالے

توحید اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ توحید کو اختیار کرنے کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ دنیا والوں کے درمیان ایک ایسی برادری بن کر ابھریں جن کا ہر طرف استقبال کیا جائے اور جن کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ہر قسم کا نفع حاصل ہو۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں چند مثالیں درج کریں گے۔

۱۔ اسلامی انقلاب کے بعد کئی سو سال ایسے گزرے ہیں جب مسلمان ساری دنیا میں علم طب کے امام تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے لوگ مسلم اطبار سے رجوع کرتے تھے اور طب میں مسلمانوں کی تصنیفات ہر جگہ فن طب کا ماخذ بنی ہوئی تھیں۔ یورپ کا سب سے پہلا میڈیکل کالج سلرنو (اٹلی) میں قائم ہوا۔ یہ میڈیکل کالج گیارھویں صدی عیسوی میں قائم ہوا تھا۔ اس کا نصاب بڑی حد تک ان طبی کتابوں پر مشتمل تھا جو عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اس کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ یورپ میں بارھویں صدی نے عربی سے لاطینی میں کتابوں کے ترجمہ کا ایک ہیروانہ پروگرام دیکھا۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ یورپ کا ابتدائی طبی اسکول جو سلرنو میں قائم ہوا اور دوسرا جو مانٹ پیلیر میں قائم ہوا، دونوں عربی اور یہودی ماخذوں سے بہت قریب تھے:

> The 12th century saw a heroic program of translation of works from Arabic to Latin. It is significant that the earliest medical school in Europe was at Salerno and that it was later rivalled by Montpellier, also close to Arabic and Jewish sources (16/368).

پروفیسر ہٹی نے اس سلسلہ میں مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ الزہراوی کی کتاب (التقریف لمن اعجز عن التالیف) کا سرجری سے متعلق حصہ گیرارڈ آف کریمونا نے عربی سے لاتینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف اڈیشن چھپے۔ وینس میں ۱۴۹۷ میں، بیسل میں ۱۵۴۱ میں، آکسفورڈ میں ۱۷۷۸ میں۔ یہ ترجمہ صدیوں تک سلرنو اور مانٹ پیلیر اور دوسرے یورپی طبی اداروں میں نصاب تعلیم کا جزو بنا رہا:

> The surgical part (of Al-Zahrawi) was translated into Latin by Gerard of Cremona and various editions were published at Venice in 1497, at Basel in 1541 and at Oxford in 1778. It held its place for centuries as the manual of surgery in Salerno, Montpellier and other early schools of medicine.
> P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 577

آج آپ جدید طرز کے کسی اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز آپ کو مغربی تہذیب کا عطیہ نظر آئے گی۔ مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ آپ وقت کے کسی معیاری اسپتال یا کسی میڈیکل کالج میں داخل ہوں تو وہاں کی ہر چیز اسلامی تہذیب کا عطیہ نظر آتی تھی۔ یہ ہے وہ بنیادی فرق جو مسلمانوں کے ماضی اور ان کے حال میں پیدا ہو گیا ہے۔

۲۔ جغرافیہ ایک بے حد اہم سائنس ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے بے شمار شعبوں سے ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس فن میں بھی کمال پیدا کیا۔ مثال کے طور پر الادریسی اپنے زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا جغرافی عالم تھا۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

> The most distinguished geographer of the Middle Ages.

یعنی قرون وسطیٰ کا سب سے زیادہ ممتاز جغرافیہ داں۔ الادریسی کے زمانہ میں راجر دوم سسلی کا بادشاہ تھا۔ اس کو ایک جغرافی نقشہ کی ضرورت ہوئی تو اس کو یہ نقشہ جس نے بنا کر دیا وہ یہی الادریسی تھا۔ فلپ ہٹی نے مزید لکھا ہے:

> The most brilliant geographical author and cartographer of the twelfth century, indeed of all medieval time, was al-Idrisi, a descendant of a royal Spanish Arab family who got his education in Spain.
> P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 568

بارھویں صدی عیسوی کا سب سے زیادہ باکمال جغرافی مصنف اور نقشہ نویس، بلکہ پورے قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا جغرافی عالم بلاشبہ الادریسی تھا۔ وہ اسپین کے ایک اعلیٰ عرب خاندان میں پیدا ہوا، اور اس کی تعلیم اسپین میں ہوئی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ الادریسی نے ۱۱۵۴ء میں سسلی کے مسیحی حکمراں (راجر دوم) کے لیے ایک عالمی نقشہ بنایا۔ اس میں ایشیائی علاقوں کی زیادہ بہتر معلومات دی گئی تھیں جو اس وقت تک ابھی انسان کو حاصل نہ ہوئی تھیں:

> Al-Idrisi constructed a world map in AD 1154 for the Christian king Roger of Sicily, showing better information on Asian areas than had been available theretofore (11/472).

●

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں مغرب کے ماہرین (Experts) بھرے ہوئے ہیں۔ مگر ایک وقت تھا جب کہ مسلمان ہر شعبہ کے ماہرین دنیا کو فراہم کر رہے تھے۔ آج مسلمان دنیا والوں سے لے رہے ہیں، مگر چند سو سال پہلے یہ حال تھا کہ مسلمان دنیا کو دینے والے بنے ہوئے تھے۔ کیسا عجیب فرق ہے ماضی میں اور حال میں۔

۳۔ آج مسلم ملکوں کے نوٹ اور سکے مغربی ممالک تیار کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسلم ملک خود اپنا سکہ یا نوٹ تیار کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ مغربی ٹکنالوجی کا مرہون منت ہے۔ مگر ایک وقت تھا کہ یہ مقام خود مسلمانوں کو عالمی سطح پر حاصل تھا۔

پروفیسر ایچ۔ ڈبلیو۔ سی۔ ڈیوس (H.W.C. Davis) نے اپنی کتاب قرون وسطیٰ کا انگلستان (Medieval England) میں انگلستان کے ایک قدیم سنہرے سکہ کی تصویر اس کے دونوں رخ سے چھاپی ہے۔ یہ سکہ برٹش میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ تصویر میں واضح طور پر نظر آرہا ہے کہ سکہ کے ایک طرف عربی رسم الخط میں کلمہ شہادت لکھا ہوا ہے اور دوسری طرف اس وقت کے انگلستان کے بادشاہ اوفاریکس (Offa Rex) کا نام کندہ ہے۔ اسی کے ساتھ سکہ پر بغداد کے مسلمان سکہ گر کا نام بھی درج ہے۔ سکہ کی تصویر کے نیچے پروفیسر ڈیوس نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:

> Anglo-Saxon gold coin imitating an Arab Dinar of the year 774.

یعنی قدیم انگلستان کا سونے کا سکہ جو ۷۷۴ء میں ڈھالا گیا اور جس میں ایک عرب دینار کی نقل کی

گئی ہے۔ یہ ایک تاریخی شہادت ہے جو بتاتی ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان صنعتی ترقی کے اس مقام پر تھے کہ انگلستان کے نامور بادشاہ ادفارکس (وفات ۷۹۶ء) کو ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ وہ اپنے ملک کا سکہ ڈھلنے کے لیے بغداد سے مسلم ماہرین کو بلائے۔ اس وقت انگلستان میں جو سکہ ڈھالا گیا وہ مسلم ممالک کے سکہ (دینار) کی نقل تھا۔ حتیٰ کہ مسلم سکوں کی طرح اس پر کلمہ شہادت بھی عربی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہزار برس پہلے کے دور میں اسلامی تہذیب ساری دنیا میں کس قدر غالب حیثیت رکھتی تھی۔

۴۔ واسکو ڈی گاما (۱۴۶۹ــ ۱۵۲۴) ایک پرتگالی ملاح تھا۔ اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے ۱۴۹۷ میں ہندستان اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جو کیپ آف گڈ ہوپ ہو کر جاتا تھا۔ مگر یہ عظیم کامیابی اس کو ایک عرب ملاح احمد بن ماجد کے ذریعہ حاصل ہوئی اس کی بابت انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں :

Vasco da Gama's Arab pilot, Ahmad ibn Majid (7/862).

یعنی واسکو ڈی گاما کا عرب جہاز راں احمد بن ماجد۔ برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ واسکو ڈی گاما جب پرتگال سے چل کر افریقہ پہونچا تو وہاں موزنبیق کے سلطان نے واسکو ڈی گاما کو دو مسلم ملاّح دیئے ان میں سے ایک اس وقت بھاگ گیا جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ پرتگالی مسیحی مذہب کے ہیں :

The Sultan of Mozambique supplied Vasco da Gama two (Muslim) pilots, one of whom deserted when he discovered that the Portuguese were Christians (7/861).

جس جہاز راں نے واسکو ڈی گاما کا ساتھ دیا اس کا نام احمد بن ماجد تھا۔ وہ نہایت ماہر تھا اور سمندری جہاز رانی سے اتنی واقفیت رکھتا تھا کہ اس پر اس نے ایک اہم کتاب لکھی تھی جو مذکورہ سفر کے وقت اس کے ساتھ تھی۔

پروفیسر فلپ ہٹی نے لکھا ہے کہ بحری جہاز رانی کے موضوع پر ایک خصوصی کتاب احمد بن ماجد کی ہے جس میں بحری جہاز رانی کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴۹۸ میں یہی احمد بن ماجد تھا جس نے افریقہ سے ہندستان تک واسکو ڈی گاما کی رہنمائی کی :

- An exceptional work of major importance is a compendium of theoritical and practical navigation by Ahmad ibn Majid of Najdi ancestry, who, it is claimed, in 1498 piloted Vasco da Gama from Africa to India.

P.K. Hitti, *History of the Arabs*, 1979, p. 689

۵۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں جو دریافتیں ہوئیں ان میں سے ایک وہ دریافت ہے جس کو نئی دنیا (امریکہ) کی دریافت کہا جاتا ہے۔ یہ عظیم دریافت عام طور پر کرسٹوفر کولمبس (۱۴۵۱-۱۵۰۶) کے نام کے ساتھ موسوم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اٹلی کا کولمبس ہی وہ شخص ہے جس نے اس مہم کی رہنمائی کی۔ مگر اس کو یہ تصور دینے والے مسلمان تھے کہ وہ اٹلانٹک سمندر میں اپنی کشتی اس امید میں داخل کرے کہ اس ناپیداکنار سمندر کے دوسری طرف اس کو خشکی ملے گی جہاں وہ اتر سکے۔

پروفیسر ہٹی نے لکھا ہے کہ عربوں نے زمین کے گول ہونے کے قدیم نظریہ کو زندہ رکھا جس کے بغیر نئی دنیا کی دریافت ممکن نہ ہوتی۔ اس نظریہ کا ایک مبلغ ابوعبیدہ مسلم البلنسی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ اس کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کا نصف اول ہے۔ زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاتینی میں ترجمہ ہو کر ۱۴۱۰ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی۔ اس سے اُس نے سمجھا کہ زمین ایک ناشپاتی کی مانند ہے اور یہ کہ زمین کے مغربی نصف کرہ میں بھی ایسا ہی ابھار موجود ہے جیسا کہ اس کے مشرقی نصف کرہ میں نظر آتا ہے۔

پروفیسر ہٹی کے الفاظ یہ ہیں:

They (Arab) kept alive the ancient doctrine of the sphericity of the earth, without which the discovery of the New World would not have been possible. An exponent of this doctrine was Abu Ubaydah Muslim al-Balansi (of Valencia), who flourished in the first half of the tenth century. They perpetuated the Hindu idea that the known hemisphere of the world had a centre or "world cupola" or "summit" situated at an equal distance from the four cardinal points. This *arin* theory found its way into a Latin work published in 1410. From this Columbus acquired the doctrine which made him believe that the earth was shaped in the form of a pear and that on the western hemisphere opposite the *arin* was a corresponding elevated centre.

Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, The Macmillan Press Ltd., London, 1979, p. 570.

ہمیں کیا کرنا ہے

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ماضی میں بلاشبہ مسلمانوں نے بہت بڑی بڑی سائنسی خدمات انجام دی تھیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمان سائنس اور صنعت کے میدان میں تمام قوموں سے پیچھے ہو گیے ہیں۔ آج وہ اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ خالص سائنسی اور صنعتی اعتبار سے اہلِ دنیا کے لیے نفع بخش بن سکیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک صنعتی دور (Industrial age) میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ جب کہ بقیہ دنیا، الوین ٹافلر کے الفاظ میں، مافوق صنعتی دور (Super-industrial age) میں داخل ہو گئی ہے۔

Alvin Toffler, *Future Shock*, New York, 1971

مگر امت مسلمہ محفوظ آسمانی کتاب کی حامل ہے۔ اس نسبت سے وہ خود بھی ایک محفوظ امت ہے۔ اس محفوظیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جہاں مواقع بظاہر ختم ہو جائیں وہاں بھی اس کے لیے ایک نیا موقع موجود رہتا ہے۔ خدا نے انسانیت کے لیے عام طور پر اور امت مسلمہ کے لیے خاص طور پر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ہر ڈس ایڈوانٹج کے ساتھ اس کے لیے ایک ایڈوانٹج ہمیشہ موجود رہے۔ یہی وہ ابدی حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

فانّ مع العسر یسراً۔ ان مع العسر یسراً (الانشراح)	پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت موجودہ زمانہ میں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ سائنس اپنی ترقیوں کی انتہا پر پہونچ کر ایک ایسے سنگین مسئلہ سے دوچار ہے جس کا خود اس کے پاس کوئی حل نہیں۔ نہ سائنسی طبقہ سے باہر کوئی گروہ ایسا موجود ہے جو اس مسئلے کا حل اسے دے سکے۔ یہ صرف مسلمان ہیں جو محفوظ آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہیں کہ سائنسی طبقہ کو نیز پوری انسانیت کو اس مسئلہ کے حل کا تحفہ پیش کر سکیں۔

اس معاملہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے یہاں میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا ایک پیراگراف نقل کروں گا۔ اس کے تاریخ سائنس (History of Science) کے مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

> Untill recently, the history of science was a story of success. The triumphs of science represented a cumulative process of increasing knowledge and a sequence of victories over ignorance and superstition; and from science flowed a stream of inventions for the improvement of human life. The recent realization of deep moral problems within science, of external forces and constraints on its development, and of dangers in uncontrolled technological change has challenged historians to a critical reassessment of this earlier simple faith (16/366).

ابھی حال تک سائنس کی تاریخ کامیابیوں کی کہانی تھی۔ سائنس کی فتوحات میں یہ شمار ہوتا تھا کہ اس نے انسانی معلومات میں اضافہ کیا ہے اور جہالت اور توہم پرستی پر فتح حاصل کی ہے۔ سائنس سے ایجادات کا ایک سیلاب نکلا ہے جس نے انسانی زندگی کو بہتر بنایا ہے۔ مگر حال میں یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار ہے۔ بے قید ٹکنالوجی کے خطرات کی وجہ سے اس کی ترقی پر روک لگانے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ یہ صورت حال مورخین کو چیلنج کر رہی ہے کہ وہ ان خیالات کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں جو ابتدا میں سادہ طور پر قائم کر لیے گئے تھے۔

جدید دنیا کا یہی وہ خلا ہے جہاں مسلمان اپنے نفع بخش ہونے کا ثبوت دے سکتے ہیں، اور اس طرح دوبارہ اپنے لیے سرفرازی کا وہ مقام حاصل کر سکتے ہیں جو انھوں نے دنیا میں کھو دیا ہے۔

سائنس کی ابتدائی فتوحات نے بہت سے لوگوں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ اب ہمیں سائنس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ سائنس ہماری تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔ جولین ہکسلے (۱۸۸۷-۱۹۷۵) نے اس نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا ـــــ انسان تنہا کھڑا ہوتا ہے :

Man Stands Alone

اس کے جواب میں کریسی مارلین (۱۸۸۴-۱۹۴۶) نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام بامعنی طور پر یہ تھا ـــــ انسان تنہا کھڑا نہیں ہو سکتا :

Man Does Not Stand Alone

بیسویں صدی کے نصف اول تک انسان کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی سائنس اس کے لیے کافی

ہے۔ مگر اسی صدی کے نصف ثانی میں انسان کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔ اس سے پہلے جو بات کریسی مارسین جیسے چند مستثنیٰ افراد کہتے تھے، اب وہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں سے کہی جارہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مذکورہ اقتباس میں کیا گیا ہے۔

جدید انسان کی ذہنی حالت کیا ہے، اس کا ایک نمونہ لارڈ برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰ — ۱۸۷۲) ہے۔ وہ انگلینڈ کے ایک دولت مند خاندان میں پیدا ہوا۔ اس نے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی۔ اس کو نوبل انعام ملا جو آج کی دنیا میں سب سے بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ اس نے مذہب کو چھوڑ دیا اور مادی سائنس میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بھرپور عمر گزارنے کے باوجود اس کو وہ چیز نہیں ملی جس کو سکون کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کی طویل خود نوشت سوانح عمری کے کے آخر میں ہم اس کے ہاتھ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

> The inner failure has made my mental life a perpetual battle (p. 727).

اندرونی ناکامی نے میری ذہنی زندگی کو ایک مستقل جنگ میں مبتلا رکھا۔

گلیلیو اور سائنس

آپ سائنس کی تاریخ کی کسی کتاب میں گلیلیو (۱۶۴۲ — ۱۵۶۴) کا باب کھول کر دیکھیں تو وہاں آپ کو اس قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے:

> His use of observation, experiment and mathematics helped lay foundation of modern science.

گلیلیو نے مشاہدہ اور تجربہ اور ریاضی کو جس طرح استعمال کیا اس نے جدید سائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

گلیلیو کا خاص کارنامہ کیا ہے۔ گلیلیو کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اس نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد (Dimensions) اور وزن (Weight) پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جاسکتی ہے، ان کو ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ سے

تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ ایک لفظ میں یہ کہ اس نے کمیت کو کیفیت سے جدا کر دیا۔

گلیلیو کے اس فعل نے اس بات کو ممکن بنا دیا کہ آدمی میٹر کو استعمال کر سکے، بغیر اس کے کہ اس نے میٹر کے بارہ میں ضروری معلومات حاصل کی ہوں۔ اس طرح فطرت کو کام میں لانے کا دروازہ کھل گیا۔ ٹکنالوجی کو ترقی ہوئی اور بے شمار نئی نئی چیزیں بننے لگیں جو انسان کے لیے مفید ثابت ہوئیں۔ مگر زیادہ مدت نہیں گزری کہ انسان کا عدم اطمینان ظاہر ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں سائنس داں یا انجینئر کا معاملہ اس جاہل بڑھئی سے کچھ بھی مختلف نہیں جو لکڑی کو کاٹ کر فرنیچر بناتا ہے، اگرچہ وہ لکڑی کی کیمسٹری کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔

بعد کی تحقیقات نے بتایا کہ گلیلیو نے چیزوں کے جس ظاہری پہلو کو الگ کرکے اس کو سائنس کے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا، اس کے بارہ میں بھی انسان کی معلومات حد درجہ ناقص ہیں۔ انسان نہ صرف پھول کی ”خوشبو“ سے بے خبر ہے بلکہ پھول کی ”کیمسٹری“ بھی بہت کم اس کے علم میں آتی ہے۔ ایک چیز جس کو متمدن دنیا کا انسان تین سو سال تک علم سمجھتا رہا وہ بھی آخر کار بے علمی ثابت ہوا۔ برٹرینڈ رسل نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے:

> As is natural when one is trying to ignore a profound cause of unhappiness, I found impersonal reasons for gloom. I had been very full of personal misery in the early years of the century, but at that time I had a more or less Platonic philosophy which enabled me to see beauty in the extra-human universe. Mathematics and the stars consoled me when the human world seemed empty of comfort. But changes in my philosophy have robbed me of such consolations. Solipsism oppressed me, particularly after studying such interpretations of physics as that of Eddington. It seemed that what we had thought of as laws of nature were only linguistic conventions, and that physics was not really concerned with an external world. I do not mean that I quite believed this, but that it became a haunting nightmare, increasingly invading my imagination.
>
> Bertrand Russell, *Autobiography*, Unwin Paperbacks, London, 1978, pp. 392-93

میں نے اپنی اداسی کے کچھ غیر شخصی اسباب پا لیے جیسا کہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی ناخوشی کے ایک گہرے سبب کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں میں ذاتی پریشانیوں میں بہت زیادہ مبتلا رہا ہوں۔ مگر اس وقت میں کم و بیش افلاطونی

فلسفہ کا قائل تھا جس نے مجھے اس قابل بنائے رکھا کہ میں خارجی دنیا میں حسن کو دیکھ سکوں۔ ریاضیات اور ستاروں نے مجھے اس وقت تسکین دی جب کہ انسانی دنیا آسائش سے خالی نظر آتی تھی۔ مگر میرے فلسفہ میں تبدیلی نے اس قسم کی تسکین کو مجھ سے چھین لیا۔ خودی نے مجھ کو بالکل مضمحل کر دیا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ میں نے طبیعیات کی ان تشریحوں کو پڑھا جو اڈنگٹن جیسے لوگوں نے کی ہیں۔ مجھ کو نظر آیا کہ جس چیز کو ہم نے فطرت کے قوانین سمجھا تھا وہ محض الفاظ کا معاملہ تھا۔ اور طبیعیات حقیقتہً کسی خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس کو پوری طرح مانتا ہوں۔ مگر یہ میرے لیے ایک کابوس بن گیا جو میرا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ میرے تخیلات پر برابر حملہ کر رہا تھا۔

روحانی تسکین

جو سائنس خارجی دنیا کا علم دینے سے عاجز تھی وہ اس باطنی دنیا کا علم کیا دیتی جس کے بارہ میں اس نے گلیلیو ہی کے زمانہ میں عملی طور پر اپنی نارسائی کا اعلان کر دیا تھا۔ سائنس آدمی کو وہ جھوٹا اطمینان بھی نہ دے سکی جو مادی سطح پر بظاہر ایک انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ذہنی اور روحانی سطح کا اطمینان تو نہ اس کے بس میں تھا اور نہ کبھی اس نے اس کو دینے کا دعویٰ کیا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (سن لو کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) یہی بات بائبل میں ان لفظوں میں آئی ہے: انسان صرف روٹی ہی سے جیتا نہیں رہتا بلکہ ہر بات سے جو خداوند کے منہ سے نکلتی ہے وہ جیتا رہتا ہے (استثنا ۸ : ۳) حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا: لکھا ہے کہ آدمی صرف روٹی ہی سے جیتا نہ رہے گا بلکہ ہر بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی ہے (متی ۴ : ۴)

انسان اپنے ساتھ ایک مخصوص نفسیات رکھتا ہے۔ اس نفسیات سے وہ اپنے آپ کو جدا نہیں کر سکتا۔ یہ نفسیات ایک برتر تسکین کی طالب ہے۔ انسان کو مادی ساز و سامان کے ساتھ ایک عقیدہ اور ایک اصولِ حیات بھی درکار ہے۔ سائنس نے انسان کو جو کچھ دیا وہ اپنی آخری صورت میں بھی صرف مادی ساز و سامان تھا۔ سائنس انسان کو ایک قابل اعتماد عقیدہ نہ دے سکی۔

یہی وہ کمی ہے جس نے جدید دنیا کے بے شمار لوگوں کو غیر مطمئن کر رکھا ہے۔ باہر سے دیکھنے والوں کو ان کی زندگیاں پُر رونق نظر آتی ہیں۔ مگر اندر سے ان کی روح بالکل ویران ہو چکی ہے۔

اقدار کا مسئلہ

یہ مسئلہ جس سے آج کا انسان دوچار ہے، فلسفیانہ لفظ میں اس کو اقدار کا مسئلہ (Problem of values) کہا جا سکتا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ انسان ایک دہری مشکل سے دوچار ہے۔ وہ جانتا ہے مگر نہیں جانتا۔ معلومات کے ڈھیر کے درمیان وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کم سے کم اس پوزیشن میں ہوتا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھا اور کسی چیز کو بُرا سمجھے۔ وہ اس تمیز کو کسی بھی طرح اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب اپنی عقل یا اپنے علم کے ذریعہ وہ اس کو متعین کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کو متعین نہیں کر پاتا۔

جوزف وڈ کرچ نے اپنی کتاب " دور جدید کا مزاج " میں اس مسئلہ پر عقلی بحث کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان اگرچہ باعتبار فطرت یہ یقین کرنے کی طرف مائل ہے کہ زندگی کا ایک مقصد ہے اور اچھائی اور برائی کا ایک معیار ہے۔ مگر سائنس اس کا کوئی حتمی جواب نہیں دیتی۔ سائنس کی ترقی اس کو زیادہ سے زیادہ ظاہر کرتی جا رہی ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں اقدار اپنا کوئی موضوعی مقام (Objective status) نہیں رکھتیں۔ انسان اخلاقی معیاروں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی گزارے۔ وہ وجدانی طور پر اس کی مستقل تلاش میں ہے۔ مگر سائنس کی دریافت کردہ دنیا میں خیر و شر کے تصورات کی کوئی جگہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک اخلاقی جانور ہے جو ایک ایسی کائنات میں ہے جہاں اخلاقی عنصر کا کوئی وجود نہیں:

> Man is an ethical animal in a universe which contains no ethical element.
>
> Joseph Wood Krutch,*The Modern Temper*, New York, 1929, p. 16

علم دیتی ہے۔ انسان دنیا کے آغاز و انجام کو جاننا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف درمیانی مرحلہ کے بارہ میں کچھ باتیں بتاتی ہے۔ انسان چیزوں کی معنویت کو دریافت کرنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف اس کی ظاہری ہیئت کا پتہ دیتی ہے۔ انسان پھول کی مہک کو سمجھنا چاہتا ہے مگر سائنس اس کو صرف پھول کی کیمسٹری سے آگاہ کرتی ہے۔ انسان ذہن اور روح کی گہرائی میں اترنا چاہتا ہے مگر سائنس صرف جسم کے مادی اجزار کا تجزیہ اس کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ انسان "خالق" کے بارہ میں جاننا چاہتا ہے اور سائنس اس کو صرف "مخلوق" کے بارہ میں بتا کر خاموش ہو جاتی ہے۔

یہی بات ہے جس کو ایک مغربی مفکر نے حسرت کے ساتھ اس فقرہ میں بیان کیا ہے —— جو اہم ہے وہ ناقابل دریافت ہے، اور جو قابل دریافت ہے وہ اہم نہیں:

The important is unknowable, and the knowable is unimportant.

اعلیٰ ذریعہ علم

یہی بے اطمینانی جدید دور کے تمام باشعور انسانوں کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ ان کی اکثریت اگرچہ مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے مگر انھوں نے یہ بات مان لی ہے کہ جس سائنسی ترقی کو انھوں نے انسانیت کے مسئلہ کا حل سمجھ لیا تھا وہ انسانیت کے مسئلہ کا حل نہ تھا۔ برٹرینڈ رسل نے مغربی فکر و فلسفہ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں ہم اس کے اعتراف کے حسب ذیل کلمات پاتے ہیں:

> (Western philosophers) confess frankly that the human intellect is unable to find conclusive answers to many questions of profound importance to mankind, but they refuse to believe that there is some 'higher' way of knowledge, by which we can discover truths hidden from science and the intellect.
> Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, 1979, p. 789

مغربی فلسفی کھلے طور پر اقرار کرتے ہیں کہ انسانی عقل کے بس سے باہر ہے کہ وہ ان بہت سے سوالات کا قطعی جواب پا سکے جو انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر وہ اس کو ماننے سے

انکار کرتے ہیں کہ سائنس کے علاوہ علم کا کوئی اور بلند تر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے ہم ان سچائیوں کو دریافت کر سکیں جو سائنس اور عقل کی دسترس میں نہیں آتیں ۔

آج کے انسان کو یہی بتانا اس کو سب سے بڑی چیز دینا ہے کہ ہاں ، یہاں ایک ایسا بلند تر طریقہ موجود ہے جس کے ذریعہ نامعلوم کو معلوم کیا جا سکے ۔ اور وہ الہام خداوندی ہے ۔ اور یہ الہام خداوندی جہاں اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے وہ قرآن ہے ۔

قرآن پوری طرح اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے اور تقریباً ڈیڑھ ہزار برس سے مسلسل اپنی صداقت کو ثابت کر رہا ہے ، اس موضوع پر راقم الحروف نے اپنی کتاب " عظمت قرآن " اور دوسری کتابوں میں گفتگو کی ہے ۔ اس کی تفصیل ان کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

داخلی شہادت

اخلاقی یا مذہبی احساس انسان کے اندر بے حد طاقت ور ہے ۔ ماضی سے لے کر حال تک کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ احساس کسی طرح انسان کے اندر سے ختم نہیں ہوتا ۔ مزید یہ کہ یہ خالص انسانی خصوصیت ہے ۔ کسی بھی نوع کے جانور میں اب تک اخلاقی یا مذہبی شعور کا ہونا ثابت نہ کیا جا سکا ۔

الفرڈ رسل ویلیس (۱۹۱۳ ـ ۱۸۲۳) مشہور ارتقا پسند عالم ہے ۔ تاہم وہ ڈارون کی طرح اس کا قائل نہ تھا کہ ذہن انسانی کی اعلیٰ اور نادر خصوصیات محض انتخاب طبیعی (Natural Selection) کا نتیجہ ہو سکتی ہیں ۔

اسی طرح اس نے لکھا ہے کہ افادیت کا مفروضہ جو کہ در اصل ذہن پر انتخاب طبیعی کے نظریہ کا انطباق ہے ، وہ انسان کے اندر اخلاقی شعور کی پیدائش کی تشریح کے لیے ناکافی معلوم ہوتا ہے ۔ اخلاقی شعور کو اس دنیا میں بے حد مشکلات کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے ۔ طرح طرح کے استثنائی حالات پیش آتے ہیں ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اخلاقی شعور کے تحت عمل کرنے والا موت سے دوچار ہوتا ہے یا برباد ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ہم کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ افادیت کا لحاظ ایک شخص کے اندر ایک اعلیٰ نیکی کے لیے اتنا پر اسرار تقدس پیدا کر سکتا ہے ۔ کیا افادیت آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کر سکتی ہے کہ وہ سچائی کو بذات خود مقصود و مطلوب سمجھے اور نتائج کا لحاظ کیے بغیر اس پر عمل کرے :

The utilitarian hypothesis, which is the theory of natural selection applied to mind, seems inadequate to account for the development of the moral sense. Such being the difficulties with which virtue (or the moral sense) has had to struggle, with so many exceptions to its practice, with so many instances in which it brought ruin or death to its too ardent devotee, how can we believe that considerations of utility could ever invest it with the mysterious sanctity of the highest virtue—could ever induce men to value truth for its own sake, and practice it regardless of consequences.

"ذہین کائنات" نامی کتاب کا مصنف فریڈ ہائل اپنے قیمتی مطالعہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ اگر زمین کو کسی مزید اہمیت کا حامل بننا ہے، اور انسان کو کائناتی اسکیم میں کوئی جگہ پانی ہے تو ضرورت ہوگی کہ ہم افادیت کے نظریہ کو مکمل طور پر ترک کر دیں۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ قدیم طرز کے مذہبی نظریات کی طرف واپسی کچھ مفید نہ ہوگی، مگر ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ایسا کیوں ہے کہ ویلس کے تشریح کے مطابق پراسرار تقدس ہمارے اندر موجود رہتا ہے اور فردوسی دنیا کی طرف ہمیں اشارہ کرتا ہے کہ کیا ہم اس کی پیروی کریں گے:

If the Earth is to emerge as a place of added consequence, with man of some relevance in the cosmic scheme, we shall need to dispense entirely with the philosophy of opportunism. While it would be no advantage I believe to return to older religious concepts, we shall need to understand why it is that the mysterious sanctity described by Wallace persists within us, beckoning us to the Elysian fields, if only we will follow.

Fred Hoyle, *The Intelligent Universe*, Michael Joseph, London, 1983, p. 251

حقیقت یہ ہے کہ مذہب انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کا انسان بھی اتنا ہی زیادہ مذہب کا ضرورت مند ہے جتنا قدیم زمانہ کا انسان تھا۔ مزید یہ کہ سائنس کی طرف سے مایوسی نے اس کو مزید شدت کے ساتھ مذہب کا مشتاق بنا دیا ہے۔ مگر جدید انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ مذہب کے نام سے جس چیز کو جانتا ہے وہ صرف بگڑے ہوئے مذاہب ہیں۔ اور بگڑے ہوئے مذاہب کے ساتھ انسانی فطرت کو مطابقت نہیں۔ جدید انسان جب اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر مذہب کے بارہ میں سوچتا ہے تو اسی بگڑے ہوئے مذہب کی تصویر اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ مذہب سے قریب ہو کر دوبارہ مذہب

سے دور ہو جاتا ہے ۔

اسلام ایک محفوظ مذہب ہے ۔ وہ ان خرابیوں سے یکسر پاک ہے جو انسانی ملاوٹ کے نتیجہ میں دوسرے مذہبوں میں پیدا ہوگئی ہیں ۔ انسان کی فطرت جس مذہب کو تلاش کر رہی ہے وہ حقیقۃً اسلام ہی ہے ۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اپنے خود ساختہ جھگڑوں کا عنوان بنائے ہوئے ہیں ۔ انھوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا ، اور اگر پیش کیا تو بگڑی ہوئی خود ساختہ صورت میں ۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کو اسلام اور دوسرے مذہبوں میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا ۔ اسلام کو اگر اس کی اصل صورت میں آج کے انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے تو وہ یقیناً اس کو اپنی طلب کا جواب پائے گا اور اس کی طرف دوڑ پڑے گا ۔

مسلمان سائنس کے میدان میں دوسروں سے پچھڑ گیے ہیں مگر عقیدہ (نظریۂ حیات) کے معاملہ میں وہ آج بھی دوسروں سے آگے ہیں ۔ وہ جدید دنیا کو وہ چیز دے سکتے ہیں جس کی آج اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے ۔ یعنی خدا کی طرف سے آیا ہوا سچا دین ، وہ دین جس کے اوپر آدمی اپنے لیے ایک پر اعتماد زندگی کی تعمیر کر سکے ۔ یہ مقام آج مسلمانوں کے لیے خالی ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ اہل عالم کے لیے نفع بخش بن سکتے ہیں ۔ اور دوبارہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر سکتے ہیں کہ قدرت کا یہ قانون ان کے حق میں پورا ہو ——— واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض —

جدید امکانات

سائنسی دریافتیں اکثر اتفاقی حادثہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ سائنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ بعض اوقات اچانک ایک دھماکہ پیش آتا ہے۔ یہ دھماکہ بظاہر ایک ناخوش گوار حادثہ ہوتا ہے۔ مگر اس ناخوش گوار حادثہ میں ایک خوش گوار پہلو نکل آتا ہے۔ کیوں کہ وہ قدرت کے ایک امکان کو بتاتا ہے۔ اس دھماکہ کے ذریعہ سائنس داں فطرت میں چُھپی ہوئی ایک طاقت کو دریافت کرتا ہے اور اس کو استعمال کرکے انسانی تمدن کو آگے لے جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انفجاری مادہ (Explosive) کی ابتدائی دریافت اِسی طرح ایک حادثہ کے ذریعہ ہوئی۔ اِس اتفاقی حادثہ میں اگرچہ کچھ جانی نقصان ہوا۔ مگر اسی حادثہ کے ذریعہ انسان نے اُس عظیم طاقت کو دریافت کیا جس نے سائنس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔

قرآن پر پابندی لگانے کی ناکام کوشش

ایسا ہی ایک واقعہ مئی ۱۹۸۵ میں ہندستان میں ہوا۔ سائنسی اعتبار سے نہیں بلکہ مذہبی اعتبار سے۔ یہ واقعہ کلکتہ ہائی کورٹ کا وہ مقدمہ تھا جس کے ذریعے قرآن کی اشاعت کو اس ملک میں قانونی طور پر بند کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ بظاہر یہ ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا۔ مگر اس ناپسندیدہ واقعہ سے ایک عظیم الشان بھلائی نکل آئی۔ اس نے اتفاقی طور پر بتایا کہ موجودہ زمانہ میں کس طرح اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گئے ہیں۔ یہ واقعہ گویا اس تاریخی حقیقت کا عملی اعلان تھا کہ دنیا اب مذہبی پابندی کے دور سے گزر کر مذہبی آزادی کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔

یہ ایک بے حد اہم واقعہ ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ جدید ہندستان کے اس واقعہ کو قدیم عرب کے اسی قسم کے واقعہ سے ملاکر دیکھا جائے اور دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

قدیم مکّہ اور جدید ہندستان

آپ جانتے ہیں کہ قدیم مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے سامنے قرآن پیش کیا تو وہ اس کے سخت مخالف ہوگیے۔ انہوں نے چاہا کہ آپ قرآن کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ سیرت ابن ہشام میں اس زمانہ کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اسلام قبول کیا۔ ان کو شوق ہوا کہ وہ قرآن کا پیغام لوگوں تک پہونچائیں۔ وہ کعبہ گیٔے اور وہاں مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر سورہ رحمٰن بلند آواز سے پڑھنے لگے۔ یہ سن کر مکہ کے مشرکین دوڑے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ پڑھنے والا قرآن کی آیتیں پڑھ رہا ہے تو وہ سخت غصہ ہوگیے۔ انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے چہرے پر مارنا شروع کردیا (فجعلوا یضربون فی وجہہ جز، اوّل صفحہ ۳۳۷) حضرت عبداللہ بن مسعود اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور اس پر مار کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کے واقعات قدیم مکہ میں روزانہ پیش آتے تھے۔ قرآن کی تعلیمات ان کے مزاج کے سراسر خلاف تھیں۔ اس لیے وہ اس کے سخت دشمن بن گیے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ چھوڑ دیں اور مکہ سے باہر چلے جائیں۔

قدیم مکہ میں پیغمبر اسلام کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو اگر آج کل کی زبان میں کہا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ "مکّہ کے مشرک سرداروں نے قرآن کی اشاعت پر پابندی لگادی" قدیم مکہ میں اگر کوئی اخبار ہوتا تو وہ اس واقعہ کی سُرخی انہیں الفاظ میں قائم کرتا۔ پابندی لگانے کی یہ اسکیم پوری طرح عمل میں آئی۔ وہ اس حد تک موثر ثابت ہوئی کہ پیغمبر اسلام کو قرآن سمیت مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس کے بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ چلے گیے۔ مکہ کو قرآن سے خالی کردیا گیا۔

اب دوسری مثال لیجئے اس واقعہ کے چودہ سو سال بعد ۱۹۸۵ میں ہندستان میں اسی نوعیت کا مگر اس سے بالکل مختلف واقعہ پیش آتا ہے۔ حیدرآباد کے ایک شخص چاندمل چوپڑا

نے کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن کے خلاف ایک رٹ پٹیشن داخل کیا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ قرآن تشدد کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے اس کی اشاعت اور تقسیم کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے۔

کلکتہ ہائی کورٹ کی خاتون جج پدما خستگیر نے ۱۸ اپریل ۱۹۸۵ کو یہ پٹیشن سماعت کے لیے منظور کرلیا۔ مگر اس کے فوراً بعد اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ مغربی بنگال کی ریاستی حکومت اور ملک کی مرکزی حکومت، دونوں نے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ مرکزی وزیر قانون مسٹر اشوک سین فوراً سفر کرکے دہلی سے کلکتہ پہونچے۔ اٹارنی جنرل مسٹر پارس رام اور مغربی بنگال کے ایڈوکیٹ جنرل مسٹر ایس کے اچاریہ نے اس کے خلاف عدالت میں زبردست وکالت کی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جسٹس پدما خستگیر نے خاموشی سے اس کیس کو اپنے زیر سماعت مقدمات کی فہرست سے خارج کردیا۔ اس کے بعد کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی ہدایت کے تحت مسٹر جسٹس بی سی باسک (B.C. Basak) نے اس مقدمہ کی سماعت کی۔ انہوں نے ۱۲ مئی کو پہلی ہی پیشی میں اپنا ابتدائی فیصلہ دے دیا۔ اس کے بعد ۱۷ مئی کو آخری فیصلہ دیتے ہوئے پٹیشن کو قطعی خارج کردیا۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں لکھا:

Courts cannot sit in judgment on holy books like the Koran

عدالتوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ قرآن جیسی مقدس کتابوں کے بارے میں فیصلہ کرنے بیٹھیں۔
(ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی، ۱۸ مئی ۱۹۸۵)

فاضل جج نے اپنے ۱۸ صفحات کے فیصلے میں مزید لکھا:

> Banning of the Koran would amount of abolition of the Muslim religion itself, as it could not exist without the Koran. Such action is unthinkable. Further, it would take away the secularity of India and violate Article 25 of the constitution which guarantees all people freedom of conscience and right to profess, practise and to propagate religion.
>
> *The Times of India* (New Delhi) May 18, 1985

قرآن پر پابندی لگانا خود مسلمانوں کے مذہب کو ختم کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے بغیر

اس کا وجود ممکن نہیں۔ اس طرح کی کارروائی ناقابل قیاس ہے۔ مزید یہ کہ یہ ہندستان کے سیکولرزم کو ختم کر دے گا اور دستور کی دفعہ ۲۵ کے خلاف ہوگا۔ جو کہ تمام باشندوں کو ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور عقیدہ اور عمل اور مذہبی تبلیغ کا آزادانہ حق تسلیم کرتی ہے۔

زمانہ کا فرق

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ قدیم مکہ اور جدید ہندستان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ قدیم مکہ کے لوگوں نے قرآن پر پابندی لگانا چاہا اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہو گیے۔ اس کے برعکس جدید ہندستان میں کچھ افراد کی طرف سے قرآن پر پابندی لگانے کی کوشش کی گئی۔ مگر خود حکومت اور عدالت نے پابندی لگانے کے اس منصوبہ کی شدید مخالفت کی اور آخر کار اس کو مکمل طور پر رد کر دیا گیا۔

اس فرق کی وجہ زمانہ کا فرق ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں دوسرے مذہب کو برداشت نہیں کیا گیا۔ اور موجودہ زمانہ میں ہر مذہب کے لیے آزادی کا حق تسلیم کیا جا رہا ہے۔

قدیم رواج کے مطابق یہ بالکل جائز فعل تھا کہ ایک شخص اگر قومی مذہب کے سوا کوئی اور مذہب اختیار کرے تو اس پر روک لگائی جائے۔ اس پر سختیاں کی جائیں۔ حتیٰ کہ اس کو مار ڈالا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو فکری اور علمی انقلاب ہوا ہے اس نے انفرادی آزادی کو آخری حد تک مقدس قرار دے دیا ہے۔ اب ہر شخص کے لیے یہ حق بلاشرط تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ آزاد ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے، جس مذہب پر چاہے عمل کرے اور جس مذہب کو چاہے پُرامن طور پر اس کی تبلیغ کرے۔ یہ موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا ایک مسلمہ حق ہے۔

مذہبی تشدد کے دور میں قرآن پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مگر مذہبی آزادی کے دور میں اس پر پابندی لگانے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ دونوں زمانوں کے فرق کی ایک واضح مثال ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج دنیا کے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے قدیم مکہ میں پائے جاتے تھے۔

دور جدید کی اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے یہاں ہم ایک اور واقعہ حوالہ دیں گے۔ اس

واقعہ کا تعلق اسپین سے ہے۔ یہ واقعہ بھی اسی سال پیش آیا۔ یعنی ۱۹۸۵ کے آغاز میں۔ یہ واقعہ عربی مجلہ "العربی" میں تفصیل کے ساتھ باتصویر انداز میں شائع کیا گیا ہے۔

اسپین کی مثال

"العربی" عربی زبان کا ایک مشہور ادبی اور ثقافی ماہنامہ ہے۔ وہ کویت کی وزارۃ الاعلام کی طرف سے شایع ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت رمضان ۱۴۰۵ھ (جون ۱۹۸۵ء) میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے:

عبد الرحمٰن الداخل یعود الی الاندلس

(عبدالرحمٰن الداخل اسپین میں واپس آتا ہے) یہ ڈاکٹر عفیف بھنسی کا مضمون ہے۔ وہ ایک مخصوص تقریب میں شرکت کے لیے اسپین گیے تھے۔ واپس آکر انہوں نے یہ مفصل مضمون شایع کیا ہے۔

عبدالرحمٰن الداخل اُموی خاندان کا ایک شاہزادہ تھا۔ وہ ۱۱۳ھ (۷۳۲ء) میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر بیس سال کی تھی کہ عباسیوں نے دمشق کی اُموی خلافت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ یہ واقعہ ۷۵۰ء میں ہوا۔ اس کے بعد وہ بنو امیہ کے افراد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنے لگے۔ نوجوان عبدالرحمٰن نے بھاگ کر دریائے فرات کے کنارے ایک باغ میں پناہ لی۔ عباسیوں کے سپاہی وہاں بھی پہونچ گیے۔ عبدالرحمٰن فرات میں کود گیا اور تیر کر دریا کے دوسری طرف نکل گیا۔

اس کے بعد وہ بھیس بدل کر سفر کرتا رہا۔ وہ دمشق سے فلسطین پہونچا۔ وہاں سے مصر گیا پھر تیونس پہونچا جو افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ وہاں سے وہ ایک کشتی پر سوار ہوا اور سمندری سفر کرتے ہوئے اسپین کے اس ساحلی مقام پر اترا جس کو المونیکر (Almunecar) کہا جاتا ہے۔ دمشق سے اسپین تک پہنچنے میں اس کو پانچ سال لگ گیے۔ وہ ۱۳۸ھ (۷۵۶ء) میں اسپین کی زمین میں داخل ہوا۔

یہی عبدالرحمٰن الداخل اموی وہ شخص ہے جس نے اسپین میں عرب سلطنت قائم کی اور یورپ میں تہذیب کے عہد کا آغاز کیا۔ اسپین کا فاتح طارق ابن زیاد ہے مگر اسپین میں باقاعدہ مسلم سلطنت قائم کرنے والا عبدالرحمٰن الداخل ہی تھا۔

اسپین میں مسلمانوں نے ۸ سو سال تک حکومت کی۔ پھر ان کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھاکر عیسائیوں نے ان کو مغلوب کرلیا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے ایک ایک مسلمان کو یا تو قتل کردیا یا اسپین سے بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اسپین سے ہر مسلم نشان کو بالکل مٹا دیا گیا۔

۱۹۸۵ میں عبدالرحمٰن الداخل کی وفات کو بارہ سو سال پورے ہوئے ہیں۔ اس مناسبت سے اس سال المونیکر (اسپین) میں اس عرب حکمراں کی ۱۲۰۰ سو سالہ برسی منائی گئی۔ یہ مقام سمندر کے کنارے غرناطہ سے قریب ہے۔ غرناطہ اسپین کی آخری مسلم سلطنت کی راجدھانی تھا۔ اس تاریخی تقریب میں اسپین کے ممتاز افراد اور عرب کے علمار اور سفرار شریک ہوئے۔ اس کی صدارت اسپین کی ملکہ صوفیا نے کی۔ عبدالرحمٰن الداخل نے اسپین میں ۳۲ سال تک حکومت کی۔ اور پھر اسی ملک میں اس کا انتقال ہوا۔

اس تقریب کے موقع پر جو مختلف کارروائیاں ہوئیں ان میں سے ایک کارروائی یہ تھی کہ عبدالرحمٰن الداخل کا ایک بہت بڑا اسٹیچو تیار کیا گیا اور اس کو المونیکر میں سمندر کے کنارے ایک پُرفضا مقام پر لگایا گیا۔ اس اسٹیچو کا فوٹو ماہنامہ العربی (جون ۱۹۸۵) میں شائع ہوا ہے۔ اسٹیچو میں عبدالرحمٰن الداخل اپنے داہنے ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے کھڑا ہے اور پُراعتماد چہرے کے ساتھ اسپین کی سرزمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسٹیچو کے نیچے العربی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

تمثال عبد الرحمٰن الداخل فی المنکب من الخلف

یعنی المونیکر میں عبدالرحمٰن الداخل کے اسٹیچو کی تصویر پیچھے کی طرف سے۔

اسپین میں مسلمانوں کی حکومت آخری طور پر ۱۴۹۲ء (۸۹۷ھ) میں ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہاں کی عیسائی حکومت نے مسلمانوں پر سخت ترین مظالم شروع کیے۔ مسلمان یا تو اسپین سے بھاگ گیے یا انہیں قتل کردیا گیا۔ ۸۰۰ سو سالہ حکومت کے بعد اسپین سے ایک ایک مسلمان کا خاتمہ کردیا گیا۔ اس کے بعد سے اسپین سب سے بڑا مسلم دشمن ملک بنا ہوا تھا۔

اب اسی ملک میں ۱۹۸۵ میں یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہاں قدیم مسلم فاتح کی یاد منائی جاتی ہے۔ اور اس کی مستقل یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ ایسا ہونا ایک بے حد غیر معمولی بات ہے۔ یہاں گویا ایک ختم شدہ تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ تاریخ کے مٹے ہوئے صفحات دوبارہ انہیں

لوگوں کے ہاتھوں سے لکھے جا رہے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے ان کو مٹا دیا تھا ۔

علمی اور تاریخی نقطۂ نظر

ایسا کیوں کر ممکن ہوا ۔ اس کی وجہ جدید انقلاب ہے ۔ جدید ذہنی انقلاب نے قدیم طرز کے تعصب کا خاتمہ کر دیا ہے ۔ جدید ذہن کے تحت وہ ماضی دوبارہ دلچسپی کا موضوع بن گیا ہے جو اس سے پہلے صرف نفرت اور فراموشی کا موضوع بنا ہوا تھا ۔ متعصبانہ طرز فکر نے جس چیز کو رد کر دیا تھا تاریخی طرز فکر نے اس کو قبول کر لیا ۔ العربی کے مضمون نگار نے لکھا ہے :

ونظرالاهميةِ عبدِ الرحمٰن وعهدِ الخلافة فی تاريخِ حضارةِ الاَندلس رای المسئولون فی الاَندلس اليوم انه من الاهمية توضيحُ اعمال و شخصيةِ هذ الحاكم الاموی الشجاع والعظيم (صفحہ ۱۶۶)

اسپین کے تمدن کی تاریخ میں عبد الرحمٰن اور عہد خلافت کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے وہاں کے موجودہ ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ بنو امیہ کے اس بہادر اور عظیم حکمراں کی شخصیت اور اس کے کارناموں کو نمایاں کیا جائے ۔

موجودہ زمانہ میں عقلیت کا غلبہ ہے ۔ آج کا انسان ہر معاملہ میں عقلی نقطۂ نظر (Rational approach) کو پسند کرتا ہے ۔ اس نقطۂ نظر نے جدید انسان کے تمام معاملات پر گہرا اثر ڈالا ہے ۔ اسی میں سے وہ تبدیلی بھی ہے جس کی ایک مثال ہندستان اور اسپین کے اُن واقعات میں نظر آتی ہے جن کو ابھی ہم نے بیان کیا ۔

جدید انسان پر جب عقلی نقطۂ نظر کا غلبہ ہوا تو اس کو یہ بات بالکل بے معنی معلوم ہوئی کہ اسپین کی مسلم حکومت کے آٹھ سو سال جو ایک تاریخی حقیقت ہیں ان کو نظر انداز کیا جائے ۔ مزید یہ کہ یہ آٹھ سو سالہ دور محض حکمرانی کا دور نہ تھا بلکہ وہ ایک شاندار تہذیب کا دور تھا ۔ حتیٰ کہ اس دور میں پیدا ہونے والی تہذیب ہی بالآخر یورپ کی جدید تہذیب کی بنیاد بنی ۔ اسپین کی جدید نسل پر جب عقلی طرز فکر کا غلبہ ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ مسلم تاریخ کو نظر انداز کر کے وہ خود اپنی تاریخ کے ایک اہم باب کو نظر انداز کر رہے ہیں ۔ غیر عقلی نقطۂ نظر نے جس واقعہ کو نفرت کے خانہ میں ڈال رکھا تھا ۔ عقلی نقطۂ نظر نے اس واقعہ کو دلچسپی کے خانہ میں ڈال دیا ۔

پہلے جو چیز صرف غیر کی نظر آتی تھی وہ اب خود اپنی چیز نظر آنے لگی ۔

یہی معاملہ ہندستان کا بھی ہے ۔ ہندستان میں بعض انتہا پسند لوگ ایسے موجود ہیں جو اپنے متعصبانہ ذہن کی وجہ سے قرآن پر پابندی لگا دینا چاہتے ہیں ۔ مگر یہاں کا جو تعلیم یافتہ طبقہ ہے ، جو ملک کو ترقی کی طرف لے جانا چاہتا ہے ، وہ جانتا ہے کہ قرآن پر پابندی لگانا ساری دنیا میں اپنے کو فکری اچھوت بنا لینے کے ہم معنیٰ ہوگا ۔ کیوں کہ آج کا تعقل پسند انسان آزادیٔ خیال کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہے ۔ عقیدہ اور مذہب کی آزادی آج کی دنیا کا ایک تسلیم شدہ اصول ہے ۔ عالمی فکر کا یہی دباؤ ہے جس کی وجہ سے ہندستان کی عدالت اور حکومت نے قرآن پر پابندی لگانے کی تحریک کو خود ہی کچل دیا ۔

آج کی ضرورت

اس قسم کے واقعات جو آج کی دنیا میں پیش آرہے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ آج ہمارے لیے اسلامی دعوت کے نئے امکانات کھل گیے ہیں ۔ آج اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کسی روک ٹوک کے بغیر کھلی فضا میں خدا کا پیغام خدا کے بندوں تک پہونچایا جا سکے ۔ دور قدیم کے داعیوں نے جو کام مذہبی پابندی کے ماحول میں انجام دیا تھا وہ کام آج مذہبی آزادی کے ماحول میں انجام دیا جا سکتا ہے ۔ جس دعوتی کام کو انہوں نے متعصبانہ رکاوٹوں کے درمیان انجام دیا تھا ، اس کو آج رواداری اور غیر جانب داری کی فضا میں انجام دیا جا سکتا ہے ۔ جس کام کو انہوں نے ہٹ دھرمی کے حالات میں انجام دیا تھا اس کو آج معقولیت پسندی کے حالات میں انجام دیا جا سکتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے فکری انقلاب نے اسلامی دعوت کے لیے بالکل نئے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ اب دعوت کے لیے ایسے موافق امکانات پیدا ہو گیے ہیں جو اس سے پہلے کبھی دنیا میں موجود نہ تھے ۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم ان امکانات کو جانیں اور انہیں ہوش مندی کے ساتھ اسلامی دعوت کے لیے استعمال کریں ۔

موجودہ زمانے میں کسی فکر کی تبلیغ واشاعت کے لیے جو نئے مواقع کھلے ہیں ان پر سب سے زیادہ حق خدا کے دین کا ہے اور ان کو سب سے زیادہ خدا کے دین کے لیے استعمال کیا جانا چاہیئے ۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

مسلمان ختم نبوت کے بعد مقام نبوت پر ہیں۔ ان کی یہ لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے پیغام رحمت کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے حالات اور دنیا کے حالات کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے دوسرے تمام وازے عملاً مسلمانوں کے لیے بند کرکے صرف ایک دروازہ ان کے لیے کھُلا رکھا ہے۔ اور وت الی اللہ کا راستہ ہے۔

مسلمان پچھلے سو سال سے ساری دنیا میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ مگر ان کی جدوجہد صرف لاحاصل انجام پر ختم ہو رہی ہے۔ بعض ملکوں میں وہ قومی جدوجہد کر رہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھیں داخلوں اور ملازمتوں اور ممبریوں میں رزرویشن دیا جائے۔ مگر اس جدوجہد سے اب تک بے فائدہ احتجاج کے سوا اور کچھ ان کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ بعض ملکوں میں وہ سیاسی جدوجہد کر رہے ہیں۔ یعنی اسلام کو سیاسی نظام کی حیثیت سے قائم کرنا۔ مگر یہاں بھی پُرشور کوششوں کے باوجود بے فائدہ اکھیڑ پچھاڑ کے سوا اور کچھ انہیں حاصل نہ ہو سکا۔ بعض ملکوں میں وہ صنعت اور ٹکنالوجی کی راہ سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہاں بھی ایک حقیقت ان کی راہ میں حائل ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی تک انڈسٹریل ایج میں بھی داخل نہیں ہوئے اور دنیا آگے بڑھ کر سُپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میدان میں ان کے لیے اس کے سوا کچھ اور مقدر نہیں کہ وہ ہمیشہ دوسری قوموں کے پیچھے چلتے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا راز اقدام میں ہے نہ کہ تقلید اور احتجاج جیسی کارروائیوں میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو اس حال میں کر دیا ہے کہ وہ دعوت کے سوا کسی اور راہ میں حقیقی اقدام کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ گویا مسلمان آج کا فرنہ لوانی ناچار مسلمان شو کی منزل میں ہیں۔ وہ یا تو دعوت کی راہ میں آگے بڑھنے کے لیے اٹھیں گے یا بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔ مزید یہ کہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک پورا دور پیدا کیا ہے جس نے دعوت کے بے پناہ امکانات کھول دیئے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر انھیں استعمال کیا جائے۔

حصّہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے (فان مع العسر یسرا، ان مع العسر یسرا، الانشراح)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں کوئی مشکل صرف مشکل نہیں ہوتی۔ ہر مشکل میں ایک آسانی موجود ہوتی ہے۔ ہر ڈس ایڈوانٹج میں ایک ایڈوانٹج کا پہلو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح کانٹے کے ساتھ پھول ہوتا ہے، اسی طرح ہر ناکامی اپنے ساتھ کامیابی کا ایک نیا امکان لیے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی زیادہ سخت ہو جائیں اس دنیا میں آدمی کے لیے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ وہ از سر نو عمل کرکے دوبارہ اپنے حالات کو بہتر بنا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عقل کا امتحان ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کے لیے سب سے زیادہ اہم شرط بالغ نظری ہے۔ یہاں وہ شخص یا گروہ کامیاب ہوتا ہے جو ظاہری مشکل کے اندر چھپی ہوئی آسانی کو دیکھ لے۔ جو ناموافق حالات (Disadvantage) میں موافق پہلو (Advantage) کو دریافت کرلے۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی ہوشیاری سے بچو، کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے (اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ) خدا کی نگاہ دور رس نگاہ ہے۔ وہ واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لیتی ہے اور جو واقعہ کے تمام پہلوؤں کو دیکھ لے اس کی طاقت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ ایک انسانی نگاہ ہوتی ہے اور ایک ربانی نگاہ۔ انسانی نگاہ محدود ہوتی ہے اور ربانی نگاہ لامحدود۔ عام انسان خدا کے فیض سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ کسی چیز کو صرف انسانی نگاہ سے دیکھ پاتا ہے۔ ایسا آدمی کسی واقعہ کے صرف سطحی پہلو کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ بظاہر اپنے کو مشکل حالات میں پائے تو شکایت کا دفتر لے کر بیٹھ جائے گا۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ مگر مومن خدا کے فیض کو پائے ہوئے ہوتا

ہے اس لیے اس کو ربانی نگاہ حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ حقیقتوں کو بہت دور تک دیکھتا ہے۔ وہ کسی چیز کے سطحی پہلو میں نہیں اٹکتا بلکہ وہ اس کو اس کی گہرائی تک جان لیتا ہے۔

قرآن کی آیت (ان مع العسر یسرا) کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مومن عُسر میں یُسر کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ مشکل میں آسانی کا راز پالیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکایت اور احتجاج مومن کا طریقہ نہیں۔ مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تاریکی میں روشنی کا راز دریافت کرے اور اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے نگاہ ربّانی کو کھو دیا ہے وہ چیزوں کو صرف نگاہ انسانی سے دیکھنا جانتے ہیں، وہ چیزوں کو نگاہ ربانی سے دیکھنا نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات میں صرف عُسر کے پہلو کو دیکھتے ہیں، وہ اپنے معاملات میں یُسر کے پہلو کو نہیں دیکھ پاتے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا شکایت اور احتجاج میں مبتلا ہونا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اُس چیز سے محروم ہیں جس کو حدیث میں فراستِ مومن کہا گیا ہے۔

قرآن کے خلاف کلکتہ ہائی کورٹ میں جو مقدمہ دائر کیا گیا تھا اس کے بارے میں ہمارے تمام لکھنے والوں نے لکھا اور ہمارے تمام بولنے والوں نے اس پر کلام کیا۔ مگر ہر ایک کو صرف اس کا تاریک پہلو نظر آیا۔ ہر ایک اس کو ظلم اور تعصب کا واقعہ قرار دے کر اس کے خلاف چیخ پکار کرتا رہا۔ مجھے کوئی قابل ذکر مسلمان نہیں معلوم جس نے اس واقعہ میں اس کے روشن پہلو کو دیکھا ہو۔ جس نے یہ دریافت کیا ہو کہ ہائی کورٹ نے اس مقدمہ کو خارج کرکے اس حقیقت کا قانونی اعلان کیا ہے کہ اس ملک میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ میں صرف مذہبی تعصب نظر آیا۔ وہ اس میں مذہبی آزادی کے پہلو کو نہ دیکھ سکے۔

یہی معاملہ اسپین کا ہے۔ اسپین میں مسلمان دوبارہ آباد ہو رہے ہیں۔ وہاں سلطان عبدالرحمٰن الداخل کو دوبارہ مقام دیا گیا ہے۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں سے کیا۔ آپ تعجب کریں گے کہ ان کا جواب یہ تھا کہ یہ عیسائیوں کی کوئی نئی سازش معلوم ہوتی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک واقعہ میں کھلا ہوا روشن پہلو ہے مگر وہ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔

البتہ اس میں موہوم سازش کا امکان انھیں بخوبی دکھائی دے رہا ہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک قسم کے ذہنی فاقہ (Intellectual starvation) سے دوچار ہیں۔ وہ نہایت شدید قسم کے فکری افلاس میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے یہ صلاحیت کھو دی ہے کہ وہ واقعات کا گہرا تجزیہ کر سکیں۔ وہ چیزوں کو اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے جانچ کر ان کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکیں۔ وہ حالات کے ظاہری طوفان کے ساتھ اس کے تہہ میں پائی جانے والی پرسکون لہروں کو بھی دیکھ لیں اور گہری معرفت کے ساتھ اپنے سفر کی سمت متعین کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں اور بول رہے ہیں وہ مشترک طور پر صرف ایک ہے۔ دوسروں کے خلاف چیخ پکار۔ مسلمانوں کے کسی بھی بیان کو دیکھئے، کسی بھی ملک میں جا کر ان سے ملاقات کیجئے۔ ان کی کسی بھی کانفرنس میں شرکت کیجئے۔ ہر جگہ ایک ہی ذہن کام کرتا ہوا نظر آئے گا۔ آج دنیا بھر کے مسلمانوں کے ذہن پر یہ چھایا ہوا ہے کہ کچھ اسلام دشمن قومیں ہیں جو ان کو ستا رہی ہیں۔ غیر قوموں کا ظلم، ان کا تعصب اور ان کی سازش یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آج کے مسلمان جانتے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور چیز کی انھیں خبر نہیں۔

۵۰ سال پہلے امیر شکیب ارسلان نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا **لماذا تأخّر المسلمون وتقدّم غيرهم** (مسلمان کیوں پیچھے ہوگئے اور دوسرے لوگ کیوں آگے ہوگئے) مگر اس لمبی مدت میں مسلمانوں کے قائدین اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا دریافت نہ کر سکے کہ وہ دوسروں کو اپنی بربادی کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے خلاف شکایت اور احتجاج کرتے رہیں۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں صرف عُسر کو دیکھنے کے ماہر بنے ہوئے ہیں وہ یُسر کو دیکھنے کے ماہر نہ بن سکے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بربادی کا اصل سبب ظالموں کا ظلم نہیں بلکہ خود مسلمانوں کا اپنا ذہنی افلاس ہے۔ مسلمان اپنے غلط ذہن کی وجہ سے اُس قیمتی فکری غذا سے محروم ہو رہے ہیں جو ان کے چاروں طرف خدا نے ان کے لیے مہیا کر رکھی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین مواقع کے

کنارے کھڑے ہو کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے لیے آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہیں۔ وہ حالات کو دیکھ رہے ہیں مگر وہ امکانات کو نہیں دیکھتے۔ ان کی نگاہ "کیا ہے" پر اٹکی ہوئی ہے۔ "کیا ہو سکتا ہے" تک ان کی نگاہ ابھی نہیں پہونچی۔

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصہ میں بتایا گیا ہے کہ ایک بڑے میدان میں فرعون نے مصر کے جادوگروں کو جمع کیا۔ ان جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لکڑیاں میدان میں ڈالیں۔ جادو کے زور سے یہ رسیاں اور لکڑیاں سانپ کی طرح میدان میں دوڑنے لگیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کے دل میں ڈر پیدا ہوا۔ بشری تقاضے کے تحت انہیں یہ محسوس ہوا کہ سانپوں کی اس فوج کا مقابلہ وہ کس طرح کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ڈرو مت، تمہیں غالب رہو گے۔ تمہارے ہاتھ میں جو عصا ہے اس کو ڈال دو۔ یہ عصا ان کے تمام سانپوں کو نگل جائے گا۔ کامیابی تمہارے لیے ہے نہ کہ ان کے لیے۔ اس ہدایت کے تحت حضرت موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر پھینکا۔ اچانک یہ عصا تمام سانپوں سے بڑا سانپ بن گیا۔ جب وہ میدان میں چلا تو جادوگروں کے تمام سانپ اس طرح ختم ہو گئے جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔
(طٰہٰ ۶۹ - ۶۶)

مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں بلا تشبیہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص عصائے موسیٰ اپنے بغل میں لیے ہوئے ہو اور پھر بھی سانپوں سے ڈرتا ہو۔ جیسے کسی کو اللہ نے معجزاتی طاقت دے رکھی ہو مگر وہ جادوگروں کے جادو اور نظر بندوں کی نظر بندی کو دیکھ کر کانپ رہا ہو۔ جیسے خدا کا قانون پوری طرح کسی کا ساتھ دینے کے لیے موجود ہو مگر وہ انسانوں کے جھوٹے فریب کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

وسیع تبدیلیاں

صلیبی جنگوں (Crusades) کے بعد یورپ کے عیسائی علماء اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ مگر سائنس کے زور سے انیسویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ سائنس میں جن چیزوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں قطعیت (Exactness) کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ اس طرح سائنس کے اثر سے جدید قوموں میں قطعی طرزِ فکر

(Exact thinking) کو ترقی ہوئی اور حقیقت پسندی کا انداز پیدا ہوا ۔

اس حقیقت پسندانہ طرز فکر کا اثر تمام شعبوں پر پڑا ۔ اور اسی طرح اسلام کے مطالعہ پر بھی ۔ چنانچہ اب یہ ذہن پیدا ہوا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو ویسا ہی لیا جائے جیسا کہ وہ ہیں ۔ اس کے بعد استشراق (Orientalism) کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں اسلام کو زیادہ حقیقی انداز میں پیش کیا جانے لگا ۔

روس اور چین میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد ابتدائی دور میں مذہب کے خلاف سخت ردعمل پیدا ہوا تھا مگر اب وہاں بھی عالمی دباؤ کے تحت اعتدال پیدا ہو رہا ہے اور مذہب کو دوبارہ آزادی دی جا رہی ہے ۔ قدیم زمانہ میں ایک مذہب کے لوگ دوسرے مذہب کے خلاف صرف مناظرہ بازی کرنا جانتے تھے ۔ آج عالمی سطح پر بے شمار مشترک اجتماعات ہو رہے ہیں جن میں ہر مذہب کے لوگ اپنی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لوگ اس کو سنجیدگی کے ساتھ سنتے ہیں ۔ خود مجھے ایسے کئی اجتماعات میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے ۔ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں میں عربی زبان اور اسلامیات کے شعبے بہت بڑے پیمانہ پر کھولے گیے ہیں جن میں خالص علمی اور تاریخی انداز میں اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔ مغربی دنیا کے غیر مسلم علماء بڑی تعداد میں عربی زبان پڑھ رہے ہیں ۔ وہ مغربی زبانوں میں قرآن و حدیث کے ترجمے کر رہے ہیں ۔ وہ قدیم عربی کتابوں کو ایڈٹ کر کے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں ۔ وہ اسلام کے بارے میں تاریخی اور تحقیقی کتابیں لکھ رہے ہیں ۔ وغیرہ

موجودہ زمانہ میں جس طرح سواری، خبر رسانی اور صنعت و زراعت میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے ۔ اسی طرح افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی آج کی دنیا میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے ۔

یہ تبدیلی عین اسلامی دعوت کے حق میں ہے ۔ اس تبدیلی نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ جو کام پہلے سخت رکاوٹوں کے درمیان انجام دینا پڑتا تھا اس کو اب سہولتوں اور آسانیوں کے درمیان انجام دیا جائے ۔ جو کام پہلے بے اعترافی کے ماحول میں کیا جاتا تھا وہ اب اعتراف کے ماحول میں کیا جائے ۔ جو کام پہلے ہٹ دھرمی کی فضا میں کرنا پڑتا تھا

اس کو اب معقولیت کی فضا میں کیا جا سکے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے زبردست نئے امکانات کھل گیے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے موجودہ زمانہ میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی رکاوٹ کے بغیر اسلامی دعوت کا کام شروع کیا جا سکے ۔ اور ہر قسم کے جدید وسائل کو استعمال کرتے ہوئے اس کو آخری حد تک پہونچایا جائے ۔

آج ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر اقوام سے ظلم اور تعصب کی شکایت ہے ۔ اس شکایتی ذہن کا یہ نتیجہ ہے کہ انھیں جدید دنیا کے وہ دوسرے پہلو نظر نہیں آتے جو عین انھیں حالات میں اسی دنیا کے اندر موجود ہیں اور جو ہمارے لیے زبردست امید کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

انھیں مظاہر میں سے ایک بہت نمایاں مظہر یہ ہے کہ آج بھی ہر روز ہزاروں کی تعداد میں دوسری قوموں کے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ۔ افریقہ کے صرف ایک ملک روانڈا میں پانچ سال کے اندر ۲۵ ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا ہے ۔ فرانس میں کیتھولک عیسائیوں کے بعد اسلام دوسرا سب سے بڑا مذہب بن چکا ہے ۔ برطانیہ ، امریکہ ، جاپان میں ہر جگہ روزانہ کثرت سے لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی خبریں آرہی ہیں ۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں عالی شان اسلامی مرکز بن رہے ہیں ۔ روم جو کسی وقت اسلام دشمنی کا سب سے بڑا مرکز تھا ، وہاں عین شہر کے اندر بہت بڑی مسجد اور اسلامک سنٹر تعمیر کیے گیے ہیں ۔ اسپین کے نومسلموں نے غرناطہ سے ایک اخبار جاری کیا ہے جس کا نام ہے : Pais Islamico

اسپین کے نومسلم ڈاکٹر عمر فاروق عبداللہ نے ۱۹۸۴ میں حج کا فریضہ ادا کیا ۔ اس موقع پر انہوں نے ایک انٹرویو (یقین انٹرنیشنل کراچی ، ۲۲ مئی ۱۹۸۵) میں بتایا کہ جنرل فرانکو (۱۹۷۵ — ۱۸۹۲) کے بعد اسپین کے حالات بہت بدل گیے ہیں ۔ اب غرناطہ میں بہت بڑا اسلامک سنٹر بنایا گیا ہے ۔ وہاں ہر شہر میں مسلمان نظر آنے لگے ہیں ۔ اس درمیان میں پانچ سو اسپینیوں نے اسلام قبول کرلیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اسپین کے موجودہ ذمہ دار کھلے ذہن کے لوگ ہیں اور روادار نقطۂ نظر رکھتے ہیں :

the present Spanish authorities are open-minded and tolèrant in their attitude.

غرض ساری دنیا میں آج اسلام کی مسلسل اشاعت ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آج بھی نظریاتی اعتبار سے اقدام کی پوزیشن میں ہے۔ آج جب کہ مسلمان ہر جگہ مغلوب ہو رہے ہیں، عین اسی وقت اسلام ہر جگہ دلوں پر فتح حاصل کر رہا ہے۔ مسلمان اگر اسلام کی جدید تاریخ کے اس دوسرے پہلو کو دیکھ سکیں تو وہ پائیں گے کہ جن حالات کے خلاف وہ فریاد و ماتم میں مشغول ہیں وہ حالات انہیں کرنے کا عظیم الشان پروگرام دے رہے ہیں۔

ایک بیرونی سفر کے دوران مجھے ایک جاپانی نومسلم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات ہیں مگر اس امکان سے ابھی تک پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جاپانیوں کے سامنے تو بس سادہ طور پر ان کی اپنی زبان میں اسلام پیش کر دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ان کی اکثریت اسلام قبول کرلے گی۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی لوگ تو بالقوہ مسلمان ہی ہیں:

Japanese people are potentially Muslims.

ایک انٹرنیشنل سمینار میں میری ملاقات ایک مسلمان پروفیسر سے ہوئی جو کناڈا کی ایک یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ انھوں نے مغربی دنیا کے جدید امکانات کو بتاتے ہوئے کہا کہ کناڈا میں اسلامی دعوت کے زبردست مواقع ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں اسلامی دعوت کا کام خود حکومت کے مالی تعاون سے اعلیٰ پیمانہ پر کیا جا سکتا ہے۔ کناڈا کی حکومت ہر پُرامن اسکیم میں اپنے شہریوں کی مدد کرتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ اس تعاون کی قیمت اس شکل میں وصول نہیں کرتی کہ وہ ہماری کارکردگی میں غیر ضروری مداخلت کرے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس امکان سے دوسرے مذاہب کے لوگ بہت بڑے پیمانہ پر فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر مسلمان ابھی تک اس سے محروم ہیں کیوں کہ مسلمانوں نے سیاسی چیخ پکار کو کام سمجھ رکھا ہے۔

صلح حدیبیہ کا پیغام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر مکہ چھوڑ دیا اور مدینہ

کی طرف ہجرت فرمائی۔ تاہم مکہ والوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ انھوں نے اسلام کو مٹانے کے لیے اسلام کے خلاف باقاعدہ جنگ چھیڑ دی۔ اب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ پر جنگ ہونے لگی۔ ہر طرف جنگی فضا پیدا ہو گئی۔ اس جنگی فضا کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام تقریباً ٹھپ ہو گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عربوں کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلسل جنگی حالات کے نتیجے میں اسلامی تاریخ معطل ہو کر رہ گئی۔ بظاہر اسلام کے لیے ملک میں کوئی روشن امکان نظر نہیں آتا تھا۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے خصوصی فیضان سے یہ جان لیا کہ اس ظاہر کے اندر ایک اور باطن چھپا ہوا ہے۔ اوپر کی سطح پر اگرچہ نفرت اور تشدد نظر آرہا ہے مگر نیچے کی سطح پر اسلام کے لیے انتہائی روشن امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ آپ کی ربّانی بصیرت نے آپ کو یہ بتایا کہ اگر کسی طرح جنگی حالات ختم کر دیے جائیں تو اندر کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات ابھر آئیں گے اور اُسی جغرافیہ میں اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی جہاں وہ بظاہر ختم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

حالات کے اِسی مطالعہ سے وہ چیز برآمد ہوئی جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ حقیقتہً مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگی حالات کو ختم کرنے کے لیے یہ کیا کہ مشرکین کے ہر مطالبہ کو یک طرفہ طور پر منظور کر لیا۔ فریق ثانی جب ضد پر تُلا ہوا ہو تو فریق اوّل کے لیے نارمل حالت پیدا کرنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ یہ کہ وہ فریق ثانی کی ضد کو یک طرفہ طور پر مان لے۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی تاریخ دوبارہ اسی مقام پر پہونچ گئی ہے۔ جہاں وہ صلح حدیبیہ کے وقت ہجرت کے چھٹے سال پہونچی تھی۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا دوسری قوموں کے نفرت اور تشدد کا شکار ہو رہی ہے۔ مسلمان بھی اس کے خلاف ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری مسلم دنیا میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

بے فائدہ لڑائیاں جاری ہیں۔ یہ لڑائی کہیں لفظی احتجاج کی صورت میں ہے اور کہیں ہتھیاروں کے استعمال کی صورت میں۔ بظاہر آج کی دنیا میں اسلام بے جگہ ہے۔ آج کی دنیا کے پاس اسلام کے لیے نفرت اور بیزاری کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو حقیقی صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج بھی عین وہی صورت حال ہے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے وقت تھی۔ اس کی ایک واضح علامت کثرت سے لوگوں کا اسلام قبول کرنا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مخالف اسلام حالات کے اندر موافق اسلام حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اصل مسئلہ صرف ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کا ہے۔ اگر ہم اس حکمت عملی کا ثبوت دے سکیں جو رسول اور اصحاب رسول نے صلح حدیبیہ کے وقت استعمال فرمائی تھی تو یقینی ہے کہ دوبارہ بہت بڑے پیمانہ پر وہی نتائج اسلام کے حق میں نکلیں گے جو دور اوّل میں صلح حدیبیہ کے بعد نکلے تھے۔

اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک قربانی کی ضرورت ہے۔ کسی صورت حال (Situation) کو استعمال (Avail) کرنے کے لیے ہمیشہ قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کو یہی قربانی دینی ہے۔ یہ قربانی وہی ہے جو صلح حدیبیہ کے وقت رسول اور اصحاب رسول نے دی تھی۔ یعنی تمام جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کرکے معتدل فضا پیدا کرنا۔

مسلمان آج تمام دنیا میں ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی مدعو قوموں سے قومی اور مادی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہی جنگ دعوت کی راہ میں اصل رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے داعی اور مدعو کا رشتہ حریف اور رقیب کے رشتہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ دوسری اقوام سے اپنے تمام قومی اور سیاسی جھگڑوں کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں تاکہ داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو۔ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں آدمی دوسرے کی بات سنتا ہے اور اس پر کھلے ذہن کے ساتھ غور کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایک طرف وہ امکانات ہیں جو جدید تبدیلیوں کے نتیجے میں اسلام

کے حق میں پیدا ہوئے ہیں اور دوسری طرف کشمکش اور ٹکراؤ کی وہ فضا ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ساری دنیا میں جاری ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر عمل کرنا ہے جو سنت چھٹی ہجری میں صلح حدیبیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔ یعنی غیر مسلم اقوام سے کشمکش اور ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دینا۔ غیر مسلم اقوام کی طرف سے ڈالی جانے والی تکلیفوں کو یک طرفہ طور پر پی جانا۔ اگر مسلمان اس قربانی کا حوصلہ کر سکیں تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نفرت کی موجودہ فضا اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد جو چیز بچے گی وہ وہی دوسری چیز ہے جس کو ہم نے اسلامی دعوت کے جدید امکانات کہا ہے۔ نفرت کی فضا ختم ہوتے ہی نیچے کی تہہ میں چھپے ہوئے امکانات سامنے آجائیں گے۔

جس دن ایسا ہوگا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی، ایک ایسی تاریخ جس کے لیے خدا نے مقدر کر دیا ہے کہ وہ اختتام تک پہونچنے سے پہلے کہیں نہ ٹھہرے۔

نیا دور

صلح حدیبیہ دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار الگ رکھ دی اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کیا۔ یہ انسانی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر فکر کے میدان میں لایا گیا۔ اس وقت تک انسان صرف یہ جانتا تھا کہ دو مختلف گروہوں کے درمیان فیصلہ جنگ کے میدان میں ہوتا ہے۔ مگر خدا کے رسول نے اپنے عمل سے دکھایا کہ یہ فیصلہ فکر و نظریہ کے میدان میں بھی ہوتا ہے۔ اور فکر و نظریہ کے میدان میں ہونے والا فیصلہ جنگ کے میدان میں ہونے والے فیصلہ سے زیادہ کامیاب ہے۔

صلح حدیبیہ محض ایک وقتی تدبیر نہ تھی جو قدیم زمانہ کے قبیلۂ قریش سے نمٹنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہے۔ یہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دروازہ کھولنا تھا۔ اس کے ذریعہ سے آپ نے ایک طرف اسلام کی ناقابل تسخیر فکری قوت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور دوسری طرف تاریخ میں پہلی بار ایک نئے دور کا آغاز کیا جس کی تکمیل موجودہ زمانہ میں پہونچ کر ہوئی ہے۔

تمام قدیم زمانوں میں یہ ایک جائز بات سمجھی جاتی تھی کہ ایک حکمراں اپنی مسلح فوجوں کو لے کر دوسرے ملک میں داخل ہوجائے اور قتل وخوں ریزی کے ذریعہ اس پر قبضہ کرے۔ یہ تمام تر ایک جدید ظاہرہ ہے کہ اس قسم کی جارحیت کو بین اقوامی جرم سمجھا جاتا ہے۔ اور بین اقوامی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بین اقوامی زندگی میں ہتھیار کے بجائے نظریہ کا استعمال تمام تر پیغمبر اسلام کی دین ہے۔ موجودہ زمانہ کا یہ عالمی مزاج درحقیقت اس انقلابی لہر کی تکمیل ہے جو صلح حدیبیہ کی صورت میں چودہ سو سال پہلے شروع کی گئی تھی۔ پیغمبر اسلام نے سب سے پہلے قوموں کے درمیان یہ سوچ پیدا کی۔ پھر آپ نے اس اصول پر عمل کرکے اس کو ایک زندہ واقعہ کی حیثیت دے دی۔ اس کے بعد یہ طرز فکر تاریخی لہر میں شامل ہوگیا۔ وہ برابر بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ موجودہ فکری انقلاب کی صورت میں اپنی انتہا کو پہونچ گیا۔

تاریخ کا یہ انقلاب عین ہمارے حق میں ہے " حدیبیہ " کے وقت جو موقع وقتی صلح کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا۔ اب اس نے ایک پورے دور کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس انقلاب نے ہمارے لیے ہمیشہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر یہ امکان کھول دیا ہے کہ ہم ایک موافق فضا میں اسلام کی اشاعت کا کام کریں اور اسلام کی فکری طاقت کو استعمال کرکے دوبارہ اس کو دنیا کا غالب دین بنا دیں۔

دہلی یکم ستمبر ۱۹۸۵

اسلامی دور

مذہب کی تاریخ کا یہ نہایت عجیب پہلو ہے کہ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک تمام پیغمبر لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے۔ مگر اس مدت میں کسی بھی پیغمبر کے زمانہ میں توحید کا پیغام عمومی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ تمام پیغمبر دنیا سے اس حال میں چلے گئے کہ چند افراد کے سوا کسی نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ دوسری طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ قوموں کی قومیں دین توحید کے دائرہ میں داخل ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب کہ دنیا کا غالب مذہب شرک کے بجائے توحید بن جاتا ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا اور آپؐ کے بعد کا زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو اس مشن پر مامور کیا تھا کہ اعلانِ توحید کے ساتھ آپ دوسرا کام یہ کریں کہ فتنہ کو دنیا سے ختم کر دیں۔ (الانفال ۳۹) فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی جبر کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں یہ رواج تھا کہ برسر اقتدار لوگ اپنے ناپسندیدہ مذہب کو جبر اور طاقت سے مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ اس زمانہ میں اربابِ اقتدار کا مسلّمہ حق سمجھا جاتا تھا۔ یہی وہ ماحول تھا جو دین حق کی تبلیغ و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے جو عظیم انقلاب برپا کیا اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس نے تاریخ میں پہلی بار فتنہ یا مذہبی جبر (Religious persecution) کے ماحول کو ختم کر دیا۔ اب دین کی اشاعت کھلی فضا میں ہونے لگی۔ چنانچہ ایک سو سال کے اندر دین حق کی وہ اشاعت ہو گئی جو پچھلے دس ہزار سال میں بھی نہیں ہوئی تھی۔

قرآن میں پیغمبر اسلامؐ کے جس کارنامہ کو فتنہ (یا مذہبی جبر) کا خاتمہ کہا گیا ہے، وہ بعد کی تاریخ میں اپنا عمل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے عالمی افکار پر اثر ڈالا۔ اور آخر کار اقوام متحدہ کے اعلان کی صورت میں مذہبی آزادی کا حق تمام قوموں کے متفقہ فیصلہ کے تحت، ایک ناقابل تنسیخ انسانی حق قرار پا گیا۔

ایک تنبیہہ

گوا کے سابق گورنر ڈاکٹر گوپال سنگھ نے ۳۰ جنوری ۱۹۸۸ کو بمبئی میں ایک لکچر دیا۔ یہ معین الدین حارث میموریل کا ساتواں لکچر تھا جس کا نظم انجمن اسلام نے کیا تھا۔ لکچر کا عنوان تھا:

Prophet Muhammad — his life and his mission

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے اپنے لکچر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات، ہندستان ٹائمس (۳۱ جنوری ۱۹۸۸) کی رپورٹ کے مطابق یہ تھی کہ مسلمان آج جن مسائل سے دوچار ہیں ان کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ انھیں جاننا چاہئے کہ ماضی میں وہ کتنی بلندی پر پہنچے تھے اور آج وہ کتنا نیچے گر گئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے آدھی دنیا پر اقلیت کے باوجود حکومت کی، وہ آج ہندستان میں اقلیت میں ہونے پر خوف زدہ ہیں:

> They have to reflect how high they had soared in the past and how low they have fallen today. The people who ruled half the world as a minority are afraid of being a minority in India (p. 8).

ڈاکٹر گوپال سنگھ نے مزید کہا کہ آج کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ سیکولرزم کے تصور کو اپنے مذہب کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اسلام ہی ہے جس نے انسانیت کو یہ قیمتی عطیہ دیا تھا:

> A faith is today afraid of the concept of secularism, which is its own gift to humanity (p. 8).

ڈاکٹر گوپال سنگھ کی یہ تنبیہہ بالکل درست ہے۔ سیکولرزم کا مطلب مذہب دشمنی نہیں بلکہ صرف مذہبی ناطرفداری ہے۔ یعنی یہ اصول کہ ریاست مذہب کے بارہ میں غیر جانبدار رہے گی۔ بالفاظ دیگر، ہر مذہب کے لئے یکساں آزادی کا دوسرا نام سیکولرزم ہے۔ اس اعتبار سے سیکولرزم ختم فتنہ کے انقلاب کا براہ راست نتیجہ ہے جو اسلام نے عالمی سطح پر پیدا کیا۔

سیکولرزم کا مطلب

ویبسٹر ڈکشنری میں "سیکولرزم" کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ یہ عقیدہ کہ مذہب کو ریاست

وحکومت کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہئے:

> the belief that religion should not enter
> into the functions of the state.

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد سیکولرزم کا یہ نظریہ تیزی سے پھیلا۔ جو لوگ اس کے وکیل تھے وہ زیادہ تر اس لئے اس کے حامی بنے تھے کہ سابقہ مسیحی تجربہ کی بنا پر ان کا خیال تھا کہ ریاستی امور میں مذہب کی مداخلت کو بند کرنے کے بعد وہ زیادہ تیزی کے ساتھ تمدنی ترقی کر سکیں گے۔ تاہم عیسائی حضرات نے یہ غلطی کی کہ انھوں نے سیکولرزم کو مخالف مذہب (Anti-religious) نظریہ سمجھ لیا اور اس کی شدید مخالفت کی۔ اگرچہ بیسویں صدی میں ان کی مخالفت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ سیکولرزم کو مخالف مذہب قرار دینے کی ذمہ داری زیادہ تر مسیحی علماء پر ہے نہ کہ خود نظریۂ سیکولرزم پر۔

سیکولرزم کے ابتدائی مبلغین زیادہ تر سیکولرزم کے اس پہلو پر زور دیتے تھے کہ مذہب کو ریاست کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔ مگر یہ شدت دراصل مسیحیت کے ردعمل کا نتیجہ تھی۔ جب مسیحیت کا زور ٹوٹ گیا تو اس کے بعد سیکولرزم کے مبلغین زیادہ تر سیکولرزم کے اس پہلو کی تاکید کرنے لگے کہ ریاست اور حکومت کو مذہب کے معاملہ میں دخل اندازی سے الگ رہنا چاہئے۔

سیکولرزم کی اصل حقیقت یہی ہے۔ سیکولرزم حقیقۃً مذہب کے خلاف نہیں بلکہ طاقت کے خلاف ہے۔ اس اعتبار سے وہ مذہب کے دعوتی عمل کے لئے ایک عظیم الشان تحفہ ہے۔ اس کو مخالف مذہب سمجھنا بیک وقت دونوں چیزوں سے بے خبری کا نتیجہ ہے ـــــــ دعوت سے بھی اور سیکولرزم سے بھی۔

ہندستان کی حالت

بعض نادان لوگوں کے خیال کے برعکس، ہندستان میں غلبۂ کفر کی حالت نہیں ہے بلکہ غلبۂ سیکولرزم کی حالت ہے۔ سیکولرزم کی علمی تعریف اگرچہ بہت زیادہ واضح نہیں، تاہم انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس میں اس کی جو تعریف کی گئی ہے وہ اس کے عمومی مفہوم سے بہت قریب تر ہے۔ اس میں سیکولرزم (Secularism) کے مقالہ کے تحت درج ہے کہ مذہبی علم

نامعلوم دنیا کی تشریح کرتا ہے۔ مگر سیکولرزم مکمل طور پر اس دنیا سے اور اس کی تعبیرات سے غیر متعلق ہے:

> Secularism is wholly unconcerned with that world and its interpretation.

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کی تشریح کے مطابق سیکولرزم مذہب کا مخالف نہیں، وہ مذہب سے غیر متعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم کا مفہوم عملی اعتبار سے عدم مداخلت (Non-interference) ہے۔ ہندستانی سیکولرزم از روئے دستور یہ ہے کہ یہاں بسنے والی مذہبی اکائیاں اپنے اپنے مذہبی معاملہ میں آزاد رہیں گی۔ ریاست کسی مذہبی گروہ کے معاملہ میں اس وقت تک دخل نہ دے گی جب تک وہ دوسرے مذہبی گروہ سے ٹکرانے نہ لگے۔

صحیفہ مدینہ

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سیکولرزم اصولی طور پر وہی چیز ہے جو مدنی دور کے آغاز میں اختیار کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں صحیفہ مدینہ (یا دستور مدینہ) سے بے حد اہم رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے سماج میں جہاں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی ہوں، مسلمانوں کو کلی اختیار حاصل نہ ہو، وہاں مسلمانوں کو کس طرح رہنا چاہئے۔ صحیفہ مدینہ کے حسب ذیل الفاظ پڑھئے:

اور بنی عوف کے یہود (اور دوسرے یہود) مسلمانوں کے ساتھ ایک امت (سماجی اکائی) ہیں۔ یہود کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے، خواہ موالی ہوں یا اصل ہوں۔ البتہ جو شخص ظلم کرے گا وہ جرم کا مرتکب ہوگا۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔۔۔ یہود کے اوپر ان کا خرچ ہے اور مسلمانوں کے اوپر ان کا خرچ ہے۔ اور جو کوئی اس صحیفہ (دستور) کے ارکان کے خلاف جنگ کرے تو دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں گے۔ ان کا طریقہ ایفائے عہد ہوگا نہ کہ عہد شکنی۔ اور کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ہوگا اور مظلوم کی ضرور مدد کی جائے گی۔ یہ نوشتہ کسی ظالم یا کسی مجرم کے آڑے نہ آئے گا۔ جو شخص جنگ کے لئے نکلے وہ بھی اور جو شخص گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی، امن کا مستحق ہوگا، الّا

یہ کہ وہ شخص جو ظلم کرے یا جرم کا مرتکب ہو۔ اور اللہ اس شخص کا حامی ہے جو وعدہ پورا کرنے والا اور پرہیزگار ہو اور محمد اللہ کے رسول بھی اس کے حامی ہیں۔

سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثانی، ۱۲۳ — ۱۲۱

اسلامی نقطۂ نظر سے یہود کافر تھے۔ اس کے باوجود مذکورہ صحیفہ (دستور) میں انھیں مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم تسلیم کیا گیا ہے (امۃ مع المومنین) نیز یہ اعلان کیا گیا کہ یہود کو اپنے دین کی آزادی ہوگی (للیھود دینھم وللمسلمین دینھم) یہ عین وہی حق ہے جو موجودہ زمانہ میں آزادی اور جمہوریت اور سیکولرزم کے نظریہ کے تحت ہر قوم اور ہر فرقہ کو دیا گیا ہے۔ صحیفہ مدینہ میں یہ بات اپنے الفاظ میں کہی گئی تھی۔ آج کے لوگ اس کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

شاہی نظام اور جمہوری نظام

قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں خدائی بادشاہت (Divine right of kings) کا رواج تھا۔ صرف اس کی ظاہری شکلوں میں فرق تھا۔ کوئی اپنے آپ کو چاند دیوتا یا سورج دیوتا کی اولاد بتا کر حکومت کرتا تھا۔ (جیسے عراق اور مصر) کسی کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا میں خدا کا سیاسی نمائندہ ہے اور یہ نمائندگی اس کو براہ راست خدا کی طرف سے ملی ہے، اس لئے کوئی اس کو منسوخ نہیں کر سکتا (جیسے چین اور ایران) کوئی اپنے آپ کو خدائی منشاء کا مقدس نگراں بتا کر لامحدود حق حکومت حاصل کئے ہوئے تھا (جیسے روم) قدیم دور میں ساری دنیا کا یہی حال تھا۔ ہر ایک کسی نہ کسی پراسرار عقیدہ کے تحت خدائی حق حکمرانی کا مالک بنا ہوا تھا۔

اس طرز حکومت کے نتیجہ میں ساری دنیا میں مذہبی جبر وجود میں آیا۔ ان بادشاہوں نے اپنی حاکمیت کے تحفظ کے لئے اپنے مخصوص مذہب کے سوا ہر مذہب پر پابندی لگا رکھی تھی۔ ایک بادشاہ جس نے پراسرار طور پر اپنا رشتہ خدا یا دیوتا سے جوڑ کر اپنے آپ کو عوام کی نظر میں مقدس بنا رکھا ہو، وہ کبھی اس دعوت کو برداشت نہیں کر سکتا کہ خدا ایک ہے، اس کے سوا سب مخلوق ہیں اور سب یکساں درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح کی دعوت کی زد براہ راست اس کے حق حکمرانی پر پڑتی ہے، وہ اس کے حکومت کرنے کے حق کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہے۔

اس ماحول میں اسلام نے خالص توحید کا نظریہ پیش کیا۔ یعنی یہ کہ خدا ایک اور صرف ایک ہے۔ اس کے سوا کسی کو کسی بھی اعتبار سے خدائی کا درجہ حاصل نہیں۔ اسلام کی یہ فکری تحریک یہاں تک کامیاب ہوئی کہ ساری دنیا میں شرک کی جڑ اکھڑ گئی۔ اسی کے ساتھ اسلام نے "شوریٰ" کا تصور پیش کیا۔ یعنی حکمراں کے تقرر کا اختیار عوام کو ہے نہ کہ کسی پراسرار عقیدہ کو۔ یہاں بھی اسلام کو زبردست کامیابی ہوئی۔ اسلام کا شوریٰ کا تصور صرف ایک تصور نہ رہا، بلکہ پیغمبر اور آپ کے خلفاء نے اس کو زمین کے ایک بڑے رقبہ میں عملاً قائم کرکے دکھا دیا۔ بعد کے دور میں اگرچہ یہ تصور نشیب و فراز کے مراحل سے دوچار رہا۔ مگر فکری سیلاب کے طور پر اس کا دھارا تاریخ میں بہتا رہا۔ یہاں تک کہ یورپ میں پہنچ کر اس نے جدید جمہوریت (Democracy) کی شکل اختیار کی۔ جمہوریت اسلام کے شورائی نظریہ کی مغربی صورت ہے اور سیکولرزم اسی جدید سیاسی انقلاب کا ایک ضمنی نتیجہ۔

دور کی تبدیلی

موجودہ مسلمان اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے "سیکولرزم" کا صرف ایک رخ دیکھ پاتے ہیں۔ وہ اب تک سیکولرزم کا دوسرا رخ دیکھنے والے نہ بن سکے۔ سیکولرزم کا مطلب اصلاً یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملہ میں ناطرفدار رہے۔ یہ ایک نہایت دور رس فکری انقلاب ہے جو عین مذہب اسلام کے حق میں ہے۔

قدیم زمانہ میں ریاست مذہب کے معاملہ میں ناطرفدار رہنے کی پابند نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں ہر مذہب والے کو دوسرے مذہب سے ظالمانہ سلوک کا تجربہ ہوتا تھا ـــــ برہمنوں کا بدھوں پر ظلم، یہودیوں کا عیسائیوں پر ظلم، عیسائیوں کا یہودیوں پر ظلم، کسی مذہب کے ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ پر ظلم۔ اس قسم کے ظالمانہ واقعات سے مذہب کی قدیم تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح دین توحید کے علم برداروں کو دین شرک کی طرف سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی داعی توحید آگ میں ڈال دیا گیا، کسی کو آرے سے چیر دیا گیا۔ مگر جدید فکری انقلاب جو درحقیقت اسلامی انقلاب ہی کا ایک نتیجہ ہے، اس نے ریاست کو مستقل طور پر اس کا پابند کر دیا کہ وہ مذہب کے معاملہ میں ہمیشہ غیر جانبدار رہے۔

یہ اصول اقوام متحدہ کے ذریعہ اب عالمی طور پر ایک تسلیم شدہ اصول بن چکا ہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو تقریباً متفقہ طور پر انسانی حقوق کا عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) منظور کیا گیا۔ اس کی دفعہ ۱۸ (نیز دفعہ ۱۹ - ۲۰) کے مطابق، ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ جو مذہب چاہے رکھے۔ اس حق میں مذہب کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ علانیہ طور پر اپنے مذہب پر عمل کرے۔ اسی طرح اس کو یہ بھی حق ہے کہ اپنے عقیدہ کو دوسروں کے سامنے بیان کرے اور اس کے لئے تمام پر امن ذرائع کو استعمال کرے۔

اس آزادی کا ایک پہلو یہ ہے کہ ایک شخص کو لا مذہب یا منکر مذہب رویہ اختیار کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک شخص کو یہ موقع حاصل ہو گیا کہ وہ جب کسی مذہب کو اختیار کرے یا کسی مذہب کی تبلیغ کرے تو کوئی اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ یہ دوسرا فائدہ دراصل اسی سیکولرزم کے نتیجہ میں تاریخ میں پہلی بار حاصل ہوا ہے۔

یہ آزادی اسلام کے حق میں عظیم الشان کامیابی ہے۔ یہ مقابلہ کے میدان کو تبدیل کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ مذاہب کے باہمی مقابلہ کو طاقت کے میدان سے نکال کر فکر کے میدان میں لاتی ہے جہاں اسلام یقینی طور پر دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ برتر حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقابلہ کو اس میدان میں لانا ہے جہاں اسلام مادی طاقت کے بغیر فتح حاصل کر سکے۔ قرآن میں یہ ذہن دیا گیا ہے کہ اہل ایمان عُسر میں یُسر کو دیکھیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ یُسر میں بھی یُسر کو دیکھنے سے عاجز ہو رہے ہیں۔

ابدی فتح مبین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اور غیر اہل اسلام کے درمیان مسلسل ٹکراؤ اور جنگ کی حالت قائم تھی۔ آغاز نبوت کے تقریباً ۲۰ سال بعد دونوں فریقوں کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جس کو عام طور پر صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اس صلح کو قرآن میں فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا ہے۔

صلح حدیبیہ کیوں فتح مبین تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حالت جنگ میں آدمی کی رہنما ضد اور عصبیت کے جذبات ہوتے ہیں۔ اور جب دونوں فریقوں کے درمیان امن اور اعتدال کی

فضا قائم ہو جائے تو دلیل اور معقولیت کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اسلام چوں کہ دین فطرت ہے، وہ کامل اور مکمل سچائی ہے۔ اس لئے ٹکراؤ اور جنگ کی فضا اس کے مفاد کے سراسر خلاف ہے۔ ٹکراؤ اور جنگ کی فضا میں لوگوں کی نگاہوں پر ضد اور عصبیت کا پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس لئے وہ اسلام کی خوبیوں کو محسوس نہیں کر پاتے۔ حتی کہ اگر محسوس کر لیں تو ضد کی وجہ سے اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ لیکن اگر کسی طرح دونوں فریقوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم ہو جائے تو اسلام کی کشش اپنے آپ لوگوں کو متاثر کرنے لگے۔ اسلام کے دلائل سیدھے فطرت میں داخل ہو کر انسان کو مجبور کریں گے کہ وہ اس کا اعتراف کرے، وہ اس کے سامنے جھک جائے۔

اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ چیزوں کو ظاہری صورت (Face value) پر نہ لیا جائے، بلکہ ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے انھیں دیکھا جائے۔ اس کی ایک مثال خود صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ مشرکین نے بطور خود اس صلح کی دفعات یہ سمجھ کر مقرر کی تھیں کہ وہ مسلمانوں کے اوپر بالادستی حاصل کر رہے ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہری دفعات کے اعتبار سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کی اصل حقیقت کے اعتبار سے اس پر غور کیا۔ ظاہری دفعات کے اعتبار سے یہ صلح فریق ثانی کے حق میں تھی، مگر اس کا ایک پہلو ایسا تھا جو اس کو یقینی طور پر اہل ایمان کے حق میں لے جا رہا تھا۔ وہ یہ کہ اس صلح کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلامی اقتدار کے درمیان مقابلہ کا میدان بدل رہا تھا۔

اب تک دونوں کے درمیان جو مقابلہ تھا وہ جنگ کے میدان میں تھا۔ اس میدان میں باعتبار اسباب، فریق ثانی کو بالاتری حاصل تھی، مگر اس صلح کے بعد دونوں کے درمیان نیا میدانِ مقابلہ فکر اور نظریہ بننے والا تھا۔ اور فکر اور نظریہ کے میدان میں یقینی طور پر توحید کو شرک کے اوپر بالاتری حاصل تھی۔

اسی پیغمبرانہ نظر سے ہمیں سیکولرزم کو دیکھنا چاہئے۔ یہاں بھی فریق ثانی نے بطور خود اس اصول کو اس لئے قائم کر رکھا ہے کہ وہ مذہب کی مداخلت سے آزاد ہو کر اپنے تمدنی منصوبوں کو بروئے کار لا سکے۔ مگر اسی کے اندر ایک اور چیز برآمد ہو رہی ہے جو عین ہمارے حق میں ہے، وہ یہ کہ فریق ثانی سے ہمارا مقابلہ طاقت کے میدان میں نہ ہو کر فکر کے میدان میں ہونے لگے۔

گہرائی کے ساتھ غور کیجئے، تو موجودہ سیکولرزم، ایک اعتبار سے ابدی صلح حدیبیہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صلح حدیبیہ نے "دس سال" کے لئے اسلام اور اس وقت کے غیر اسلامی اقتدار کے درمیان حالت جنگ کو ختم کر دیا تھا، موجودہ سیکولرزم نے مذہب اور حکومتی ادارہ کے درمیان ابدی طور پر جنگ اور ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیا ہے۔ قدیم صلح حدیبیہ نے عارضی طور پر میدان مقابلہ کو جنگ سے امن کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ موجودہ سیکولرزم نے دوبارہ یہ کام اس طرح انجام دیا ہے کہ وقت کے نظام نے مستقل طور پر اپنے آپ کو پابند کر لیا ہے کہ وہ دین کے ساتھ طاقت کے میدان میں ٹکراؤ نہیں کرے گا۔ اس طرح اہل دین کے لئے دوبارہ وہی موقع نہایت شاندار طور پر حاصل ہو گیا ہے جو دور اول میں اصحاب رسول کو صلح حدیبیہ کے بعد حاصل ہوا تھا۔ یعنی وقت کے نظام سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لئے بغیر دین حق کا پیغام تمام لوگوں کو پہنچائیں ۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے کہ دونوں کا فرق ہی مٹ جائے۔ اسی خدا کی حکومت زمین پر بھی قائم ہو جائے جس کی حکومت دلوں کے اندر قائم ہوئی تھی۔

خلاصہ

اسلام ایک دعوتی مشن ہے۔ دعوتی مشن کے لئے سب سے زیادہ موافق بات یہ ہے کہ اس کی راہ میں فوجی اور سیاسی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ معاہدۂ حدیبیہ کے ذریعہ یہی ہوا تھا کہ وقت کا اقتدار اس بات کا پابند ہو گیا کہ وہ دس سال تک اسلام کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے نتیجہ میں اسلام ایک سیلاب بن کر ہر طرف پھیل گیا۔

موجودہ زمانہ میں یہی بات زیادہ وسیع پیمانہ پر اس طرح حاصل ہوئی ہے کہ ریاست نے اپنے آپ کو اس کا پابند کر لیا ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ یہ ایک عظیم دعوتی امکان ہے۔ اسلام دوبارہ ایک "فتح مبین" کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ اب ضرورت صرف یہ ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں اور اس امکان کو ایک تاریخی واقعہ بنا دیں۔

قرآن کے مطابق، مذہب کی تاریخ دو بڑے دوروں میں تقسیم ہے۔ ایک، اسلامی انقلاب سے پہلے کا دور جب کہ دنیا میں فتنہ تھا۔ دوسرا، اسلامی انقلاب کے بعد کا دور جب کہ دنیا سے فتنہ ختم ہو گیا۔ فتنہ کے معنی وہی ہیں جس کو انگریزی میں Persecution کہا جاتا ہے۔ یعنی مذہب کی بنیاد پر کسی کو ستانا۔ قدیم زمانہ میں اقتدار کا یہ مسلّمہ حق سمجھا جاتا تھا کہ وہ لوگوں کو حکم دے کہ

لوگ کون سا عقیدہ رکھیں اور کون سا عقیدہ نہ رکھیں۔ یہی پچھلے تمام معلوم زمانوں میں دنیا کا مروّجہ طریقہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس نے اس تاریخی واقعہ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

Ancient society was essentially intolerant.

یہ صورت حال خدا کے تخلیقی نقشہ کے خلاف تھی۔ خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس نقشۂ تخلیق کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر آدمی کو انتخاب (Choice) کی آزادی ہو۔ اس آزادی کے بغیر امتحان اور جانچ کے کوئی معنی نہیں۔

مذکورہ صورت حال خدا کے تخلیقی نقشہ میں مداخلت کے ہم معنی تھی۔ چنانچہ پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے اصحاب کو حکم دیا گیا کہ وہ ارباب فتنہ سے جنگ کر کے ان کے فتنہ کو ختم کر دیں۔ بالفاظ دیگر، مذہب کے نام پر جبر کو ختم کر کے لوگوں کے لیے آزادانہ مذہبی انتخاب کا دروازہ کھول دیں۔ یہی مطلب ہے وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله (البقرہ ۱۹۳) کا۔ اس آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ خدا کے تخلیقی منصوبہ میں انسان کی مداخلت ختم ہو جائے اور وہ حالتِ فطری قائم ہو جائے جس پر خدا نے اپنی دنیا کو پیدا کیا ہے۔

اس طرح اسلامی انقلاب نے مذہبی جبر کو ختم کر کے مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ چین اور روس میں جبر کا ہونا اشتراکی نظام کے لیے ایک ایڈوانٹج ہے۔ لیکن اگر چین اور روس میں آزادی کی حالت قائم ہو جائے تو وہ غیر اشتراکی نظام کے لیے ایڈوانٹج بن جائے گی اسی طرح قدیم زمانہ میں آزادیٔ انتخاب کا نہ ہونا دین شرک کے لیے ایڈوانٹج بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد آزادیٔ انتخاب کی بحالی دین توحید کے لیے ایڈوانٹج بن گئی۔ حالت فطری قائم ہونے کے بعد آدمی صرف فطری دین کو اختیار کرے گا نہ کہ غیر فطری دین کو۔ اسی راز کو جاننے میں دعوت حق کے عالم گیر امکانات کو جاننے کا راز چھپا ہوا ہے۔

اردو

- تذکیر القرآن جلد اول
- تذکیر القرآن جلد دوم
- اللہ اکبر
- پیغمبر انقلاب
- مذہب اور جدید چیلنج
- عظمتِ قرآن
- عظمتِ اسلام
- عظمتِ صحابہ
- دینِ کامل
- الاسلام
- ظہورِ اسلام
- اسلامی زندگی
- احیاء اسلام
- رازِ حیات
- صراطِ مستقیم
- خاتونِ اسلام
- سوشلزم اور اسلام
- اسلام اور عصر حاضر
- الربانیہ
- کاروانِ ملت
- حقیقتِ حج
- اسلامی تعلیمات
- اسلام دورِ جدید کا خالق
- حدیثِ رسولؐ
- ڈائری جلد اول
- ڈائری جلد دوم
- سفرنامہ (ملکی اسفار)
- سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
- میوات کا سفر
- قیادت نامہ
- راہِ عمل
- تعبیر کی غلطی
- دین کی سیاسی تعبیر
- اقوالِ حکمت
- انوارِ حکمت
- تعمیر کی طرف
- تبلیغی تحریک
- تجدیدِ دین
- عقلیاتِ اسلام
- مذہب اور سائنس
- قرآن کا مطلوب انسان
- دین کیا ہے
- اسلام دینِ فطرت
- تعمیرِ ملت
- تاریخ کا سبق
- فسادات کا مسئلہ
- انسان اپنے آپ کو پہچان
- تعارفِ اسلام
- اسلام پندرھویں صدی میں
- راہیں بند نہیں
- ایمانی طاقت
- اتحادِ ملت
- سبق آموز واقعات
- زلزلۂ قیامت
- حقیقت کی تلاش
- پیغمبرِ اسلام
- آخری سفر
- اسلامی دعوت
- خدا اور انسان
- حل یہاں ہے
- سچا راستہ
- دینی تعلیم
- حیاتِ طیبہ
- باغِ جنت
- نارِ جہنم
- خلیج ڈائری
- رہنمائے حیات
- شخصیاتِ اسلام
- تعدد ازواج
- روشن مستقبل
- صوم رمضان
- علم کلام
- صداقتِ اسلام
- علماء اور دورِ جدید
- ہندستانی مسلمان
- سیرتِ رسولؐ

عربی

- الاسلام يتحدى
- سقوط الماركسية
- حقيقة الحج

آڈیو کیسٹ

- A-1 حقیقتِ ایمان
- A-2 حقیقتِ نماز
- A-3 حقیقتِ روزہ
- A-4 حقیقتِ زکوٰۃ
- A-5 حقیقتِ حج
- A-6 سنتِ رسولؐ
- A-7 میدانِ عمل
- A-8 پیغمبرانہ رہنمائی
- A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات
- A-10 اسلامی اخلاق
- A-11 اتحادِ ملت
- A-12 تعمیرِ ملت
- A-13 نصیحتِ لقمان

ویڈیو کیسٹ

- V-1 پیغمبرِ انقلاب
- V-2 اسلام داعیِ امن
- V-3 اسلام دورِ جدید کا خالق
- V-4 امتِ مسلمہ کے لیے نئے چیلنج
- V-5 اسلام اور سماجی انصاف
- V-6 اسلام اور دورِ حاضر

- God Arises
- Muhammad The Prophet of Revolution
- Islam As It Is
- God Oriented Life
- Words of the Prophet
- Introducing Islam
- Religion and Science
- Tabligh Movement
- Islam the Voice of Human Nature
- Islam the Creator of Modern Age
- The Way to Find God
- The Teachings of Islam
- The Good Life
- The Garden of Paradise
- The Fire of Hell
- Man Know Thyself!
- Muhammad The Ideal Character
- Social Justice in Islam
- Polygamy in Islam
- Words of Wisdom

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال 1976-77
1978
1979
1980
1981
1982
1983
1984
1985
1986
1987
1988
1989
1990
1991

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

1984
1985
1986
1987
1988
1989
1990
1991

فائل الرسالہ ھندی (مجلد)

1990-91